اُردو میں
قومی شاعری کے سو سال

اُردو میں

قومی شاعری

کے

سَو سَال

مُرتبہ

علی جواد زیدی

پرکاشن شاکھا

محکمہ ــــ اطلاعات ــــ اُتر پردیش

۲۶ر جنوری ۱۹۵۹ء

قیمت پانچ روپیہ

باہتمام سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری اُتر پردیش ۔ الہ آباد

شہیدانِ آزادی کے نام

تعارف

بھارت نے ۱۸۵۷ء میں بدیشی راج سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جو لڑائی لڑی تھی اُس کی یادگار منانے کے لئے اُتر پردیش سرکار نے ۱۹۵۷ء میں ایک پروگرام تیار کیا۔ اس پروگرام میں شہیدوں کی یادگاریں قائم کرنے اور آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے والے سورماؤں کی اولاد کو سندیں دینے کے علاوہ ہندی، انگریزی اور اُردو میں ایسی کتابیں بھی چھاپنا شامل تھا جن سے اس زمانے کے اُن لوگوں کے حوصلوں، ارمانوں اور جنونِ آزادی کا پتہ چلتا جنھوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر ملک کے کونے کونے میں آزادی کی وہ شمع جلائی جو ان کے بعد اس وقت تک جلتی رہی جبتک اُن کی اولادوں نے اُن کا مقصد پورا نہیں کیا، جب تک ان کا سپنا حقیقت نہیں بن گیا اور جب تک ملک کی حکومت ملک کے عوام کے ہاتھوں میں نہیں آگئی۔ ان کتابوں کی تیاری اور چھاپنے کی ذمے داری سوچنا وبھاگ پر ڈالی گئی۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء کو منائے جانے والے سن ۱۸۵۷ء کے سو سالہ جشن کے موقع پر اُردو نظموں کا ایک ایسا مجموعہ چھاپنا طے پایا جس میں ایک سو سال یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کی ایسی رچنائیں شامل کی جائیں جن میں ہماری جنگ آزادی کا اصلی نقشہ نمایاں ہو۔ اس کتاب کی تیاری کا کام شری علی جواد زیدی کے سپرد کیا گیا جو اُس وقت سوچنا وبھاگ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔

اردو میں قومی نظمیں کافی تعداد میں ضرور تھیں لیکن وہ درجنوں کتابوں اور ہزاروں صفحوں پر بکھری پڑی تھیں اور انھیں اکٹھا کرنا آسان نہ تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ یہ تمام کتابیں کسی ایک لائبریری میں نہیں مل سکتی تھیں۔ بعض کتابیں چھپ چکی تھیں مگر ملتی نہ تھیں۔ بعض کتابیں چھپی ہی نہ تھیں اور ان کے قلمی نسخے ڈھونڈھنے میں بڑی دوڑ دھوپ کرنا تھی۔ اس طرح کی بہت سی رکاوٹیں تھیں مگر ان کے ہوتے ہوئے بھی کام شروع کر دیا گیا۔ وہ کویتائیں تو آسانی سے مل گئیں جو کسی نہ کسی کتاب میں

چھپ چکی ہیں لیکن ان نظموں کے لئے جو کسی کتاب میں نہیں ملتیں دہلی، رام پور اور لکھنؤ کی لائبریریوں میں بہت کچھ کھوج کرنا پڑی۔ یہ محنت برباد نہیں ہوئی اور ان کتابوں اور قلمی نسخوں سے، جو ان لائبریریوں میں ملے، بہت سے جواہرات ڈھونڈھ ہی نکالے گئے۔ اسی کھوج میں کچھ پرانے اخبارں کی فائلوں میں کچھ ایسی نظمیں بھی مل گئیں جن کے بارے میں اس سے پہلے کچھ معلوم نہ تھا۔

اس طرح بہت سی نظمیں اکٹھا ہوگئیں اور ۱۰ مئی ۱۹۵۸ء کو آزادی کی لڑائی کی سَوسالہ سال گرہ کے موقع پر تھوڑی سی نظموں کا ایک کتابچہ چھاپ دیا گیا۔ پوری کتاب آج پیش کی جا رہی ہے۔ اس کے متعلق یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں آزادی اور دیش سیوا وغیرہ پر اُردو کی ساری نظمیں شامل کردی گئی ہیں، ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جتنی نظمیں اس میں شامل ہیں وہ کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اس لحاظ سے "اردو میں قومی شاعری کے سَو سال" کو اُردو ادب میں ایک خاص درجہ حاصل ہوگا اور سوچنا و بھاگ اُتر پردیش کی اس پیش کش کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

اس سلسلے میں شری علی جواد زیدی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی محنت اور کوشش کی وجہ سے یہ کتاب تیار ہو سکی۔ شری زیدی جب یہاں تھے تب بھی اور جب کشمیر چلے گئے اس وقت بھی، جب کبھی مجھے اس کتاب کے سلسلے میں بات کرنے یا خط لکھنے کا موقع ملا مجھے یہی محسوس ہوا کہ وہ اس کام کو سرکاری کام کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان کو اس کی ایسی لگن تھی، ایسا لگاؤ تھا جو ان کی ادبی شخصیت کو برابر نمایاں کرتا رہا اور اسی لئے وہ جس ہمت اور حوصلے سے اس کام کو پورا کرسکے وہ تقلید کے قابل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میں "نیا دور" کے جوائنٹ ایڈیٹر اور محکمۂ اطلاعات کے جرنلسٹ شری صباح الدین عمر اور شری خورشید احمد جرنلسٹ محکمۂ اطلاعات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انھوں نے شری زیدی کے لکھنؤ سے چلے جانے کے بعد بھی اس کتاب کی تیاری اور چھپائی میں بہت دلچسپی دکھائی اور ان کی محنتوں کا نتیجہ آج آپ کے سامنے ہے۔

بھگوتی شرن سنگھ

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

پیش لفظ

دس مئی ۱۹۵۷ء کو ہماری پہلی جنگ آزادی کی صدسالہ یادگار منائی جانے والی تھی۔ اس اہم اور مبارک موقع پر جناب بھگوتی شرن سنگھ صاحب ڈائرکٹر اطلاعات اتر پردیش کی تحریک پر آزادی کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ابھی کام مشکل سے شروع ہو پایا تھا کہ میرا تبادلہ دلی کا ہو گیا اور وہاں سے بھی تھوڑے ہی وقفے کے بعد کشمیر جانا پڑا۔ اس طرح تالیف و ترتیب کا کام کئی حصوں میں بٹ گیا جس کے باعث بعض اوقات بے انتہا الجھنیں اور پریشانیاں بھی پیدا ہوئیں۔ لیکن کام جاری رہا اور "نغمۂ آزادی" کے نام سے ایک چھوٹا سا مجموعہ تبرکاً شائع کیا گیا۔ اس مجموعے کے ابتدایہ میں یہ بات صاف طور سے ظاہر کر دی گئی تھی کہ اس کی اشاعت علامتی طور سے ہو رہی ہے اور مفصل کتاب کی اشاعت بعد میں کی جائے گی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ادبی حلقوں نے اس مختصر سے مجموعے کا ہمت افزا استقبال کیا اور ہمارے سبھی ناقدین نے اس جذبۂ عقیدت و خلوص کی گرمی کو محسوس کیا جو "نغمۂ آزادی" کی محرک حقیقی تھی۔

حسب وعدہ وہ تفصیلی کتاب بھی اب ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ "نغمۂ آزادی" اور "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" میں کمیت ہی کا نہیں بلکہ کیفیت کا بھی فرق ہے۔ پہلا کتابچہ صرف ۶۴ صفحوں پر مشتمل تھا اور زیر نظر تالیف کی ضخامت گھٹتے گھٹاتے بھی تقریباً ۴۰۰ صفحات تک جا پہنچی۔ موضوعات کا تنوع اور محسوسات و مشاہدات کی بوقلمونی بھی فطری طور سے بڑھ گئی ہے لیکن نہ تو ہماری جنگ آزادی کی تاریخ ہی اتنی مختصر کہ اسے چند صفحات میں محصور کیا جا سکے اور نہ اس موضوع پر اردو کے ذخائر نظم ہی اتنے کم ہیں کہ اس مختصر سی ایک جلد میں ان کا احصار ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح مختصر سے ۶۵ صفحات کی "نغمۂ آزادی" کے مرتب کرتے وقت یہ خیال ستا رہا تھا کہ ہماری قومی

کائنات شعری کا ایک حصہ بھی سمیٹ لینا ممکن نہیں ہے اسی طرح آج بھی یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ضخامت کے اضافے سے ہماری مشکل حل نہیں ہو پائی کیونکہ بڑے سائز کے ان ۸۰۰ صفحات کے کوزے میں بھی ہماری قومی شاعری کا دریا سما نہیں پایا اور اب بھی چند خاص خاص واقعات اور رجحانات کی نمائندگی ہی پر اکتفا کرنا پڑی ہے

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسن تو بسیار — گلچینِ بہارِ توز داماں گلہ دارد

اب بھی بہت سا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ذخیرہ یارانِ نکتہ داں کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے جو مواد صرف میری نظر سے گزر چکا ہے اگر اسی کو اکٹھا کیا جائے تو کم از کم اسی ضخامت کی چار پانچ جلدیں تو اور بھی مرتب کی جا سکیں گی۔ لیکن یہ کام حکومت کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ اربابِ ذوق کے کرنے کا ہے۔ حکومت اتر پردیش نے شہدائے آزادی کو گلہائے عقیدت پیش کرنے کے خیال سے ایک مجموعہ کی اشاعت کا کام اپنے ذمے لیا تھا اور وہ کام وقت کی تنگی اور وسائل کی حد بندی کے باوجود مناسب طریقہ پر انجام پا رہا ہے لیکن ع

یہ انتہا نہیں آغازِ کارِ مرداں ہے

'انجمن ترقی اُردو'، 'ادارہ ادبیات اردو' اور اسی طرح کے دوسرے علمی اداروں کو اس طرف خاص طور سے متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ مجھے علم ہے کہ ایک زمانے میں اس طرح کی ایک تجویز "انجمن ترقی اردو" کے پیشِ نظر بھی تھی لیکن جن صاحب نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا انھیں اور مشاغل سے فرصت نہ مل پائی جو فریضہ خالص ادبی اداروں کا تھا اس کو ایک ریاستی حکومت کا ادارہ اطلاعات ادا کر رہا ہے۔ ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا گیا ہے کہ ع

مردے از غیب بُروں آید و کارے بکند

آغازِ کار تو ہو گیا اب یہ ہمارے ادبا اور محققین کا قومی فرض ہے کہ وہ اس امر کی طرف فوری توجہ دیں اور اس قومی سرمائے کو محفوظ کر لیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ جتنا ذخیرہ نظم میں ہے اس سے کہیں زیادہ نثر میں بھی موجود ہے۔ جب سارا مواد شائع ہو کر ہمارے سامنے آجائے گا تبھی ہمارے صحافتی تبصرہ نگاروں اور ادبی ناقدین کو اس بات کا صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ قومی بیداری میں اردو زبان و ادب کا کتنا اہم حصہ ہے۔

اس مجموعے کی ترتیب کا مقصد صرف یہ ہے کہ اردو شاعری میں قومی تصورات و افکار کے

جو ذخیرے گزشتہ سو برس میں جمع ہوتے رہے ہیں ان کو اس ڈھنگ سے اکٹھا کیا جائے کہ مختلف ادوار میں ہماری تحریک آزادی جن منزلوں اور ماحولوں سے گزر کر گزری ہے ان کی جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کا دور قومی شاعری کے اعتبار سے ایک گم شدہ دور رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک کی ناکامی کے بعد جو مظالم توڑے گئے اور ذرا ذرا سی مخبری اور معاندانہ افترا پردازی پر ہی نہیں بلکہ صرف شبہ پر بھی شرفا اور اہل کمال کو جن شدائد کا شکار بنایا گیا اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ اس دور کے حریت پسندانہ ذخیرے ہمیشہ کیلئے ضائع و برباد ہو گئے۔ اس لئے اس دور کے مواد کے جمع کرنے پر خاص طور سے توجہ کی گئی اور میرے رفیق کار نور رشید احمد صاحب نے نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، رضا ٹرسٹ لائبریری رام پور، دلی یونیورسٹی لائبریری، ہندیہ لائبریری دلی، امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ، گنگا پرشاد میموریل لائبریری لکھنؤ، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری اور کئی ذاتی کتب خانوں کو چھان مارا۔ "غدر" کے تمام اہم ماخذوں کو میں نے بھی بالتفصیل دیکھا اور ایک مدت تک لکھنؤ، دلی اور کشمیر میں سرگرم جستجو رہا۔ پروفیسر احتشام حسین لکھنؤ، مولوی امتیاز علی عرشی رام پور، نثار احمد صاحب فاروقی دلی، نسیم احمد صاحب مالک دانش محل لکھنؤ، حاجی معصوم رضا غازی پور اور شمیم احمد شمیم سری نگر نے مواد کی فراہمی اور نشان دہی میں جو فراخدلی برتی اس کے باعث بہت سے تازہ مواد دستیاب ہو سکا۔ بہرحال نمائندہ ادبی مجموعوں میں ادبی عجائبات کی تلاش بے سود ہے۔ جہاں رجحانات کی نمائندگی مقصود ہو وہاں مطبوعہ و غیر مطبوعہ، گم شدہ و بازیافتہ کی حدیں اٹھ جاتی ہیں۔ پھر بھی اس انتخاب میں ایسی نظمیں خاصی تعداد میں موجود ہیں جو نایاب تو نہیں مگر کمیاب تو ضرور ہیں۔

نمائندہ نظموں کی ترتیب کے وقت یہ بھی کاوش کی گئی ہے کہ صرف صالح قومی رجحانات کی نظمیں یکجا کی جائیں جو نظمیں شعور کی خامی یا فکر و تجربے کی ژولیدگی کی مظہر تھیں انہیں اس مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن صالح رجحانات کے تعین میں کسی نظریاتی عصبیت کو دخل نہیں دیا گیا۔ ابتدائی ادوار کی اصلاح پسندی، مراعات دوستی، اعتدال پرستی کو بھی اسی طرح جگہ دی گئی ہے جس طرح کانگریس کی مکمل آزادی کی آخری للکار کو یا اشتراکی رجحانات کو۔

گزشتہ دس برس میں کچھ مستقبل کے جھوٹے پیغمبر اور مبتلائے تشکیک رہبر بھی رونما ہوئے ضرور تھے لیکن ان کو خود ان کے اتباع کا دم بھرنے والوں نے جھٹلا دیا اور ان کے منفیانہ نظریات مسترد ہو کر ان کی زندگی ہی میں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئے۔ ایسے رجحانات، مورخ ادب کے لئے

اہمیت ضرور رکھتے ہیں لیکن زیر نظر مجموعے میں ان کے شمول سے ایک انتشار ہی پیدا ہوتا اور وہ تاریخی ہم آہنگی باقی نہ رہتی جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

سنوات کے حساب سے یہ کتاب مندرجہ ذیل چھ ادوار میں تقسیم کی گئی ہے ــــ پہلا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک، دوسرا دور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک، تیسرا دور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک، چوتھا دور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک، پانچواں دور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک اور چھٹا دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک۔ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ ادوار ہماری تاریخ آزادی میں اہم حیثیتوں کے مالک رہے ہیں اور ہر اس اہم تحریک کی نمائندگی کرتے ہیں جس نے ہمیں آمادۂ عمل کیا یا ہماری قومی جدوجہد کو آگے بڑھایا۔ اس میں بعض اوقات بہت سے معاشرتی مسائل بھی اپنی سیاسی اہمیت کی بنا پر شامل کرلئے گئے ہیں۔ ان مختلف ادوار میں ہمارے شعرا نے آزادی کی اتنی داستانیں جمع کردی ہیں کہ ہماری حیات اجتماعی کے تقریباً سبھی پہلو بیک وقت جھلک اُٹھتے ہیں۔

یہ مجموعہ اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ نہیں ہے۔ سب سے پہلا مجموعہ غالباً ۱۸۶۲ء میں فغان دہلی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں دلی کی تباہی پر متعدد نوحے شامل تھے۔ اس کے مرتب کا زاویہ نگاہ نا صاف ہی نہیں بلکہ استعمار پرستانہ بھی تھا۔ دو ایک شعرا نے اپنی نظموں میں حکام فرنگ کی خوشامد کرنے اور دلی کی بربادی کی ذمہ داری سے عمال حکومت کو بری کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ لیکن کئی شاعروں نے دلی کی حیات اجتماعی کے درہم و برہم ہونے کے جو دردناک نقشے کھینچے تھے ان سے مورخ ادب کو قیمتی سیاسی مواد حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ کچھ مجموعے تحریک خلافت کے زمانے میں بھی مرتب ہوئے جن میں منشی مشتاق میرٹھی کا مجموعہ جذبات حریت اہمیت رکھتا ہے۔ کچھ دنوں بعد الیاس برنی نے اردو شاعری کے کئی مجموعے موضوعات کے اعتبار سے مرتب کئے لیکن یہ بیحد مختصر ہونے کے علاوہ اب تقریباً ناپید بھی ہوچکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں سبط حسن وغیرہ نے آزادی سے متعلق نظموں کا مجموعہ "آزادی کی نظمیں" شائع کرایا تھا جسے برطانوی حکومت نے ضبط کرلیا تھا اور جس کے نسخے اب بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ خود میں نے دو مختصر سے مجموعے "پیام آزادی" اور "نغمہ آزادی" کے ناموں سے مرتب کئے۔ ابھی حال میں غلام ربانی تاباں نے بھی "شکست زنداں" اور "غم دوراں" کے نام سے دو مجموعے ترتیب دئے ہیں لیکن ان میں انتخاب ادوار و واقعات دونوں ہی محدود ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب کو حتی الوسع جامع بنادیا جائے۔

اس مجموعے کی نظموں کے مطالعے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ آزادی کا جذبہ کس طرح پیدا ہوا اور پھر مختلف ادوار میں یہ کس طرح شکلیں بدلتا رہا۔ یہی نہیں بلکہ خود آزادی کے مفاہیم جس طرح عہد بعہد تبدیل ہوتے رہے ہیں اس کے ادراک صحیح میں بھی اس مجموعے سے مدد مل سکے گی۔

بعض حلقوں میں اس شبہے کا اظہار کیا جا سکتا ہے کہ جب ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو آزادی حاصل ہو گئی تو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک جو آخری دہ سالہ دور گزرا ہے اسے آزادی سے متعلق نظموں کے اس مجموعے میں کیوں شامل کیا گیا؟ یہ سچ ہے کہ ہم ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی کے بعد داستان آزادی کے اختتامیہ پر پہنچ جاتے ہیں لیکن اسی کے بعد ہم نے بقا و استحکام آزادی کے لئے بے شمار اقدامات کئے ہیں اس کے علاوہ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ اقتصادی آزادی کی جنگ بھی جاری تھی اور یہ جنگ آج بھی جاری ہے اس لئے اس دَور کو بھی ہماری تحریک آزادی کا ایک اہم باب تصوّر کرنا چاہئے۔

نظموں کی ترتیب میں تاریخی تسلسل باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعات کے تقدّم و تاخر کے اعتبار سے نظمیں مختلف ادوار میں شامل کی گئی ہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی نسبتاً گمنام شاعر نے کسی ایسے واقعے کے بارے میں نظم لکھی جو تاریخی اعتبار سے پہلے رونما ہوا تو اس کی نظم مشہور و معروف ہی نہیں بلکہ بزرگ تر شعرا کے مقابلے میں بھی پہلے ہی درج کی گئی ہے۔ بعض نظموں کا سن تصنیف کوشش کرنے پر بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ان کی ترتیب نظم کے موضوع کے اعتبار سے قائم کر دی گئی ہے۔ بعض شعرا کی ایک سے زیادہ نظمیں بھی بعض ادوار میں شامل کر لی گئی ہیں اس کا سبب صرف یہ تھا کہ انھوں نے ایک سے زیادہ ضروری موضوعات پر متعلقہ دور میں نظمیں کہی تھیں اور ویسی ہی دوسری نظمیں آسانی سے دستیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ منتخب نظموں کی تعداد سے شعرا کی اہمیت کا اندازہ لگانا کسی حیثیت سے بھی مناسب نہ ہوگا۔

آخر میں ان تمام شعرا اور ادبا کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے نظموں کی فراہمی میں عملی تعاون کیا ہے۔ چند مخصوص دوستوں اور کرم فرماؤں نے بار بار یاد دہانی کے باوجود وقت سے نظمیں نہیں بھیجیں لیکن بقول غالبؔ اس کی شکایت کیا کروں ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

نظموں کی فراہمی میں جو مسلسل دشواریاں پیش آتی رہی ہیں ان کو کچھ وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جنھیں اس قسم کی کاوش و تحقیق سے سابقہ پڑتا رہا ہے۔ اس منزل میں سید خورشید احمد صاحب صحیفہ نگار

حکومت اترپردیش نے قدم قدم پر سہارا دیا ہے۔ ساتھ ہی قدیم رفیق صباح الدین عمر صاحب کا ذکر خیر بھی ضروری ہے ایسے ادبی کاموں سے ان کو جو فطری دل چسپی ہے اس کا عملی ثبوت انھوں نے اس مجموعے کی ترتیب کی آخری منزلوں میں دیا۔

احسان فراموشی ہوگی اگر میں محکمہ اطلاعات اترپردیش کے روح رواں جناب بھگوتی شرن سنگھ صاحب کا مخصوص شکریہ ادا نہ کروں۔ یہ شکریہ صرف میرا ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ہر اردو دوست کے دل کی آواز کی ترجمانی ہے۔ اردو ادب میں اس مجموعے کا یقیناً ایک مقام ہوگا اور اس کی اشاعت بھگوتی بابو کی ہی مرہون منت ہے۔ انھوں نے اس کی ترتیب و طباعت کے سلسلے میں کسی امداد سے گریز نہیں کیا۔ آخر میں ذمہ داران گورنمنٹ پریس الہ آباد کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کی طباعت اور کتابت میں خاص دلچسپی دکھائی۔

کام اتنا اہم، پیچیدہ اور وقت طلب تھا کہ تمام کوششوں کے باوجود اور مسلسل محنت و عرق ریزی کے بعد بھی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس مجموعے میں ابھی ترقی اور اضافے کے سیکڑوں گوشے چھوٹے ہوئے ہیں۔ وہ سیکڑوں نظمیں جو نظر ثانی و انتخاب کے بعد بھی آخر وقت میں مجموعے سے تنگی صفحات کے باعث خارج کرنا پڑیں ہمارے اس احساس کوتاہی کو تیز تر کر دیتی ہیں۔ ان کے لیے میں کوئی عذر پیش نہیں کروں گا۔

سری نگر
کشمیر

علی جواد زیدی

عنوانات

صفحہ

مقدمہ ۲۵

پہلا دور (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)

عنوان	شاعر	صفحہ
داستان انتزاعِ سلطنت	واجد علی شاہ اختر	۵۷
حزنِ اختر	واجد علی شاہ اختر	۵۹
قیدِ فرنگ	بہادر شاہ ظفر	۶۵
بیانِ درد	بہادر شاہ ظفر	۶۷
فتحِ افواجِ شرق	محمد حسین آزاد	۶۹
حُبِ وطن	محمد حسین آزاد	۷۰
اولوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں	محمد حسین آزاد	۷۸
۱۸۵۷ء	مرزا غالب	۸۰
داغِ غم	منیر شکوہ آبادی	۸۱

		صفحہ
فریاد زندانی	منیر شکوہ آبادی	۸۳
مصائبِ قید	منیر شکوہ آبادی	۸۵
رباعیاتِ اسیری	منیر شکوہ آبادی	۸۷
قطعات تاریخ	منیر شکوہ آبادی	۸۸
قید سے نجات	منیر شکوہ آبادی	۸۹
مصطفیٰ و صہبائی	صدر الدین خاں آزردہ	۹۰
صہبائی کا مرثیہ	لامعلوم	۹۱
مصیبت دہلی	قاضی فضل حسین افسردہ	۹۲
دار و رسن	محمد علی تشنہ	۹۴
شہر آشوب	مرزا داغ دہلوی	۹۶
فغانِ دہلی	مرزا داغ دہلوی	۹۸
انقلابِ دہلی	مرزا قربان علی بیگ سالک	۹۹
داستانِ انقلاب	ظہیر الدین ظہیر دہلوی	۱۰۱
ہنگامۂ دار و گیر	ظہیر الدین ظہیر دہلوی	۱۰۳
گنج شہیداں	غلام دستگیر مبین	۱۰۴
داستانِ الم	غلام دستگیر مبین	۱۰۵
نوحۂ دہلی	حکیم محمد محسن محسن	۱۰۶
طوفانِ مخبری	حکیم محمد محسن محسن	۱۰۷
دہلی و لکھنؤ	حکیم آغا جان عیش	۱۰۸
واسوخت ۔ گورے اور کالے	شاعر اودھ پنچ	۱۰۹
مرثیۂ حکیم محمود	خواجہ الطاف حسین حالی	۱۱۱
دہلی مرحوم	خواجہ الطاف حسین حالی	۱۱۲

صفحہ

کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان	خواجہ الطاف حسین حالؔی	۱۱۴
انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی	خواجہ الطاف حسین حالؔی	۱۱۶
آزادی غنیمت ہے	اسمٰعیل میرٹھی	۱۱۷
اتحاد	اسمٰعیل میرٹھی	۱۱۷
اچھا زمانہ آنے والا ہے	اسمٰعیل میرٹھی	۱۱۸
کورانہ انگریز پرستی	اسمٰعیل میرٹھی	۱۲۰
مطراق لیگ	شبلی نعمانی	۱۲۱
مسلم لیگ	شبلی نعمانی	۱۲۲
احرارِ قوم اور طفلِ سیاست	شبلی نعمانی	۱۲۵
تفرقۂ حق و باطل	شبلی نعمانی	۱۲۶
پہلی جنگِ عظیم اور ہندوستانی	شبلی نعمانی	۱۲۷
گلزارِ وطن	درگا سہائے سرور جہان آبادی	۱۲۸
عروسِ حبِ وطن	درگا سہائے سرور جہان آبادی	۱۲۹
بدنصیب بنگال	درگا سہائے سرور جہان آبادی	۱۳۰
برٹش راج	اکبر الٰہ آبادی	۱۳۱
جلوۂ دہلی دربار	اکبر الٰہ آبادی	۱۳۲
دیکھئے کب تک رہے	حسرت موہانی	۱۳۵
اپچکی کی شفقت	حسرت موہانی	۱۳۶
ترانۂ ہندی	ڈاکٹر اقبالؔ	۱۳۷
ہندوستانی بچوں کا قومی گیت	ڈاکٹر اقبالؔ	۱۳۸

		صفحہ
نیا شوالہ	ڈاکٹر اقبال	۱۳۹
خاکِ ہند	برج نرائن چکبست	۱۴۰
فریادِ قوم	برج نرائن چکبست	۱۴۲
کرزن سے جھپٹ	برج نرائن چکبست	۱۴۵
خاکِ ہند	تلوک چند محروم	۱۴۸
تاریخ تباہیِ انگریزی	مولوی محمد ظہور علی	۱۵۰

دوسرا دور (۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک)

مغربی قوموں کا فلسفہ	دتاتریہ کیفی	۱۵۲
پیامِ وفا	برج نرائن چکبست	۱۵۴
وطن کا راگ	برج نرائن چکبست	۱۵۵
ہوم رول	ظریف لکھنوی	۱۵۷
شکوۂ صیاد	تلوک چند محروم	۱۶۲
جلیانوالا باغ	ڈاکٹر اقبال	۱۶۴
مارشل لاء	ظفر علی خاں	۱۶۵
فریادِ جرس	ظفر علی خاں	۱۶۶
فانوسِ ہند کا شعلہ	ظفر علی خاں	۱۶۷
ہندوستان	ظفر علی خاں	۱۶۸
مانٹیگو رفارم	حسرت موہانی	۱۶۹
انقلابِ زمانہ	اکبر الہ آبادی	۱۷۰
وہ اور ہم	اکبر الہ آبادی	۱۷۱
تاثرات	اکبر الہ آبادی	۱۷۲

		صفحہ
ردِ سحر	محمد علی جوہر	۱۷۴
اور ہی کچھ ہے	محمد علی جوہر	۱۷۵
مادرِ ہند	شاد عظیم آبادی	۱۷۶
جذبۂ حریت	ڈاکٹر اقبال	۱۷۸
انگریزی ذہن کی تیزی	احمق پھپھوندوی	۱۷۹
کڑے مرحلے	احمق پھپھوندوی	۱۸۰
عہدِ فرنگ	احمق پھپھوندوی	۱۸۱

تیسرا دور (۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک)

شرارِ جوہر	محمد علی جوہر	۱۸۵
سنتِ سجاد	علامہ فاخر الہ آبادی	۱۸۷
گرفتارِ قفس	نجم الدین انجم گیاوی	۱۸۸
مقاومتِ مجہول	تلوک چند محروم	۱۸۹
سودیشی تحریک	تلوک چند محروم	۱۹۰
سائمن کمیشن کا مقاطعہ	ظفر علی خاں	۱۹۱
سوراج	ظفر علی خاں	۱۹۲
پٹیل کا پیغام	ظفر علی خاں	۱۹۳
انقلابِ ہند	ظفر علی خاں	۱۹۴
سر میلکم ہیلی کے ملفوظات	ظفر علی خاں	۱۹۵
اہلِ ہند	مہاراج بہادر برق دہلوی	۱۹۶
اچھوتوں سے نفرت	مہاراج بہادر برق دہلوی	۱۹۸
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر	تلوک چند محروم	۲۰۰

		صفحہ
ہندی نوجوانوں سے	تلوک چند محروم	۲۰۱
شہید بھگت سنگھ	تلوک چند محروم	۲۰۲
ہندِ مظلوم	جگت موہن رواں	۲۰۳
آزادی	حفیظ جالندھری	۲۰۴
ہندوستان	سیماب اکبرآبادی	۲۰۷
درسِ اتحاد	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۲۰۹
نالۂ دل	نیاز فتح پوری	۲۱۲
باردولی	روش صدیقی	۲۱۳
وطن کا راگ	افسر میرٹھی	۲۱۵
ستیاگرہی خاتون کی تصویر دیکھ کر	اعظم حسین اعظم	۲۱۶
حصول آزادی کی دقتیں	احمق پھپھوندوی	۲۱۸
پیامِ آزادی	احمق پھپھوندوی	۲۱۹
آثارِ انقلاب	جوش ملیح آبادی	۲۲۰
شکستِ زنداں کا خواب	جوش ملیح آبادی	۲۲۱
پیغامِ وطن	آزاد انصاری	۲۲۲
تعلیم بیداری	آزاد انصاری	۲۲۴
نوائے جرس	جمیل مظہری	۲۲۶
نعرۂ شباب	جوش ملیح آبادی	۲۲۹
محبانِ وطن کا نعرہ	آنند نرائن ملاّ	۲۳۱
ترانۂ شباب	ساغر نظامی	۲۳۳
عہد	ساغر نظامی	۲۳۵
ہمارا وطن	عرش ملسیانی	۲۳۷

		صفحہ
آزادی کے دیوانے	انور صابری	۲۳۹
حیات	علی جواد زیدی	۲۴۰
ناقوسِ بیداری	احسان بن دانش	۲۴۲

چوتھا دور (۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک)

زمزمۂ آزادی	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۲۴۵
نویدِ آزادیٔ ہند	ظفر علی خاں	۲۴۷
شعاعِ اُمید	ڈاکٹر اقبال	۲۴۸
آئینِ جدید	احمق پھپھوندوی	۲۵۰
قومی گیت	انور حسین آرزو لکھنوی	۲۵۱
بھارت ماتا	جمیل مظہری	۲۵۲
وفادارانِ ازلی کا پیام شاہنشاہِ ہندوستان کے نام	جوشِ ملیح آبادی	۲۵۸
زمیندار اور کسان	اقبال احمد سہیل	۲۶۰
لوری	اختر شیرانی	۲۶۲
نظامِ کہنہ	احتشام حسین	۲۶۴
زمینِ وطن	آنند نرائن مُلاّ	۲۶۶
ترانہ	ساغر نظامی	۲۶۹
صبحِ نو	سکندر علی وجد	۲۷۳
قوم سے خطاب	امین سلونوی	۲۷۴
بیداریٔ مشرق	روش صدیقی	۲۷۵
مذہب اور سیاست	احسان دانش	۲۷۸

		صفحہ
اندھیری رات کا مسافر	مجاز	۲۷۹
ایک جلاوطن کی واپسی	مجاز	۲۸۲
ٹیپو کی آواز	آل احمد سرور	۲۸۴
ٹیپو سلطان	اجتبیٰ رضوی	۲۸۵
آزادیٔ وطن	مخدوم محی الدین	۲۸۶
مشرق	مخدوم محی الدین	۲۸۸
تسلّی	فیض احمد فیض	۲۸۹
اے کاش	معین احسن جذبی	۲۹۰
اُٹھو	علی سردار جعفری	۲۹۱
آزادی	علی سردار جعفری	۲۹۲
وطن آزاد کرنے کے لئے	الطاف مشہدی	۲۹۴
جد وجہد آزادی	سید مطلبی فریدآبادی	۲۹۵
سیاسی قیدی کی رہائی	علی جواد زیدی	۲۹۷
ساقی	جاں نثار اختر	۲۹۸
نئی دنیا	مسعود اختر جمال	۲۹۹
جگادا	شمیم کرہانی	۳۰۲
قومی گیت	شمیم کرہانی	۳۰۴
وطن کے نوجوانوں سے خطاب	یحییٰ اعظمی	۳۰۵
سات رنگ	سلام مچھلی شہری	۳۰۶
وطن پرستی	بشیشور پرشاد منور لکھنوی	۳۰۸
نعرۂ آزادی	غلام احمد فرقت	۳۰۹

صفحہ

پانچواں دور (۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک)

عنوان	شاعر	صفحہ
ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب	جوش ملیح آبادی	۳۱۳
بشارت	سکندر علی وجد	۳۱۵
منزلیں	علی جواد زیدی	۳۱۶
کچھ دیر ذرا سو لینے دو	شمیم کرہانی	۳۱۸
قیدی کی لاش	علی جواد زیدی	۳۲۰
ہولی	علی جواد زیدی	۳۲۳
روشن اندھیرا	شمیم کرہانی	۳۲۷
پاکستان چاہنے والوں سے	شمیم کرہانی	۳۲۹
آزاد ہند فوج	تلوک چند محروم	۳۳۱
سبھاش چندر بوس (بہادر شاہ کے مزار پر)	جگن ناتھ آزاد	۳۳۲
قحط بنگال	جگر مراد آبادی	۳۳۵
ایک سوال	اختر الایمان	۳۳۶
آزادی	فراق گورکھپوری	۳۳۸
انقلاب	عرش ملسیانی	۳۳۹
ابھی نہیں	جاں نثار اختر	۳۴۰
کسانوں کا گیت	مسعود اختر جمال	۳۴۲
زنداں	وامق جونپوری	۳۴۳
آخری مرحلہ	کیفی اعظمی	۳۴۵

صفحہ

نوائے آزادی	گوپی ناتھ امن	۳۴۶

چھٹا دور (۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک)

اہنسا کی پہلی سنہری کرن	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۳۴۹
آ ہی گیا	آنند نرائن مُلاّ	۳۵۰
اے صبحِ وطن	ساغر نظامی	۳۵۱
مبارک بادِ آزادی	اقبال احمد سہیل	۳۵۴
پہلا جشنِ آزادی	مجاز	۳۵۷
آفتابِ تازہ	سکندر علی وجد	۳۵۸
جشنِ آزادی	عرش ملسیانی	۳۶۰
صبحِ آزادی کا طلوع	یحییٰ اعظمی	۳۶۱
طلوع	سلیمان اریب	۳۶۲
یومِ آزادی	سراج لکھنوی	۳۶۳
آج	ساحر لدھیانوی	۳۶۴
شہیدانِ وطن	جوش ملسیانی	۳۶۶
انتقام	غلام ربانی تاباں	۳۶۷
اعلانِ آزادی	آیین سلونوی	۳۶۹
گاندھی	اقبال احمد سہیل	۳۷۰
مہاتما گاندھی کا قتل	آنند نرائن مُلاّ	۳۷۳
پیرِ مغاں کی یاد	آل احمد سرور	۳۷۶
وطن کا میرِ کارواں	وامق جونپوری	۳۷۷
سونے کا درخت	سلام مچھلی شہری	۳۸۱

		صفحہ
بوڑھا مالی	عمر انصاری	۳۸۴
جشنِ جمہوریت	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۳۸۶
جشنِ جمہور	سراج لکھنوی	۳۸۷
چھبیس جنوری	تلوک چند محروم	۳۸۸
"دلِ وحشی کو رہِ خار بھی کیا یاد آئی"	آل احمد سرور	۳۹۰
ہماری کہانی	کمال احمد صدیقی	۳۹۱
شانتی کے پالن ہار	کمال احمد صدیقی	۳۹۳
قدم ملا کے چلو	اعجاز صدیقی	۳۹۴
نیا دور	علی جواد زیدی	۳۹۹
عشرتِ امروز	فضا ابن فیضی	۴۰۰
آخری پڑاؤ	راہی معصوم رضا	۴۰۲
اے ارضِ وطن	راہی معصوم رضا	۴۰۵
اک قدم اور بڑھایا میں نے	شمیم کرہانی	۴۰۷
طلوعِ فردا	جگن ناتھ آزاد	۴۰۹
ہمارے دس برس	جگن ناتھ آزاد	۴۱۰
پیغامِ بیداری	یحییٰ اعظمی	۴۱۲

ضمیمہ

عنوان	شاعر	صفحہ
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں	واجد علی شاہ اختر	۴۱۵
زوال لکھنؤ	نواب محمد رضا خاں عاشق	۴۱۷
بازارِ موت	مرزا قربان علی بیگ سالک	۴۲۰
واجد علی شاہ کی معزولی	آغا حجو شرف	۴۲۱
امیران اسیر	شیخ قلندر بخش جرأت	۴۲۳
مغرب زدگی	درگا سہائے سرور جہان آبادی	۴۲۴
درسِ وفا	نیاز فتح پوری	۴۲۵
تلک	حسرت موہانی	۴۲۶
نجاتِ ہند	حسرت موہانی	۴۲۷
ناٹال اور ہندوستان	ظفر علی خاں	۴۲۸
گاندھی جی کی یاد میں	جگر مراد آبادی	۴۳۰
خون میں پانی	نشور واحدی	۴۳۱

ہر ادب ایک مخصوص مادی ماحول میں پرورش پاتا اور ارتقا کے منازل طے کرتا ہے۔ جو حالات قوموں کی تاریخ بناتے اور اقتصادی یا ثقافتی ترقی کی راہیں معین کرتے ہیں، اُن سے ہر ادب کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ چونکہ سماج کی ہر تبدیلی اور ترقی براہِ راست، انسانی جد و جہد ہی کا نتیجہ ہے اس لئے سماجی تبدیلیوں کا اثر ہمارے ذوق و وجدان و احساس پر بھی اُسی طرح پڑتا ہے جس طرح عام مادی مظاہر پر۔ اردو کا ادب بھی خلوتوں، محلوں یا قلعوں کی چار دیواریوں میں نہیں پلا اور بڑھا ہے کہ وہ عام مادی محرکات سے متاثر نہ ہوتا یا کم متاثر ہوتا۔ لیکن اردو میں غزلوں کی جو بہتات ہے اُس کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں حسن و عشق کی تقلیدی داستانوں کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ غزلوں میں بھی سماجی حالات کا پرتو صاف نظر آتا ہے لیکن غزلوں کی زبان رمز و کنایہ کی زبان ہے، اس لئے ان سماجی حقائق تک عام نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں۔

ہمارے شعری سرمائے کی زبان اور اندازِ بیان کو دیکھ کر بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اردو درباری زبان ہے۔ یہ بات تاریخی طور پر سراسر غلط ہے کیونکہ اپنے ابتدائی نشو و نما کے دور میں اردو کو درباروں میں کوئی جگہ نہیں ملی۔ درباروں میں تو فارسی کا دور دورہ تھا۔ اُس دور کے علما یا فضلا کی ساری تصنیفیں یا تو فارسی اور عربی ہیں یا پھر سنسکرت میں۔ کچھ اہم ترین تصنیفیں مقامی بولیوں میں بھی ہوئی ہیں، لیکن آخر الذکر کے مصنفین درباروں سے بہت کم وابستہ رہے ہیں۔

اردو دراصل کھڑی بولی یا مغربی ہندی ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ آگرہ سے وابستگی نے بعد

میں اس پر "برج بھاشا" کا اثر بھی ڈالا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو نے "برج بھاشا" سے نہیں بلکہ کھڑی بولی سے جسد و روح حاصل کیا ہے۔ ریاست قنوج کی سیاسی مرکزیت کی بدولت کھڑی بولی کو فروغ ہوا لیکن جب یہ سیاسی مرکزیت ٹوٹی تو ایک لسانی لامرکزیت پیدا ہوئی اور ہر چھوٹے چھوٹے علاقے میں مقامی بولیاں ابھرنے لگیں ان میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ یہ علاقائی دیواروں کو توڑ سکیں تیرہویں صدی کے آغاز میں دلی نے اپنی کھوئی ہوئی مرکزیت دوبارہ حاصل کی تو کھڑی بولی یا زبانِ دہلوی ایک وسیع تر علاقے میں از سر نو منظم ہونے لگی۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسی کے ساتھ درباری زبان کی حیثیت غیر ملکی فارسی نے حاصل کر لی اور ایک لسانی دوعملی کا جنم ہوا۔ درباروں میں اور درباروں سے وابستہ اعلیٰ طبقوں میں فارسی کا دور دورہ ہوا لیکن سیاسی مرکزیت سے وابستہ وسیع تر علاقوں میں فوجوں کی آمد و رفت، تجارت اور متوسط طبقے کی کاروباری ضرورتوں کے ماتحت زبانِ دہلوی، کھڑی بولی یا اردو، پھلنے اور پھولنے لگی۔ اس زبان کو بعض فارسی مورخین نے "ہندی" اور "ہندوی" کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ بیوپاریوں، سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں، کاریگروں، فوجیوں، سرکاری حاکموں اور عالموں کی وساطت سے جلد ہی یہ زبان شمال میں سندھ و پنجاب سے بہار تک اور جنوب میں دکن تک پھیل گئی۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں سلاطین گجرات و دکن نے دلی کی مرکزیت سے ناطہ توڑا تو وہ فارسی کی لسانی مرکزیت سے بھی علیحدہ ہو گئے اور دلی سے آئے ہوئے اپنے ملازمین امرا اور فوجی سرداروں کی خاطر زبانِ دہلوی کو اپنانے پر مجبور ہوئے۔ اس ابتدائی دکنی اردو میں مقامی اثرات سے سنسکرت کے الفاظ اور ترکیبیں بہ کثرت شامل ہوئیں اور یوں اس طرح اردو وحدت قومی کی تشکیل کا ایک اہم وسیلہ بھی بن گئی۔

دربار دلی میں بھی ایسے محرکات کارفرما تھے، جن سے اس وحدتِ قومی کے تصور کو مدد مل رہی تھی۔ مسلم حکمرانوں کے تسلط کے اثرات ملک کو نادانستہ طور پر ایک قومی وحدت کی طرف لئے جا رہے تھے۔ عربی اور فارسی کے عالموں کے علاوہ، مرکزی اور صوبائی درباروں سے سنسکرت کے پنڈتوں کو بھی ہمیشہ وابستہ رکھا گیا تاکہ ہندوؤں کے مذہبی امور سے متعلق شاستروں کے مطابق فیصلہ کرنے میں مدد مل سکے۔ اس سے فارسی اور سنسکرت دونوں ہی کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا۔ محمد تغلق، سکندر لودی اور شیر شاہ سوری کے ذہنوں میں وحدت قومی کا تصور موجود تھا۔ صوبوں میں بنگال، دکن اور کشمیر میں مذہبی اختلافات سرے سے غائب تھے۔ فاتحین کی مخالفت کا ابتدائی زور و شور بھی کم ہو گیا تھا۔

صوفیوں نے اپنی تبلیغ میں تصوف کے اُن پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جو فلسفۂ ویدانت سے ملتے جلتے تھے۔ اسی طرح راما نج اسکول کے مشہور سنت، رامانند نے 'بھکتی' تحریک میں نہ صرف ہندوؤں کی تمام ذاتوں کو بلکہ مسلمانوں کو بھی شامل کیا۔ اکبر اعظم کے زمانے میں تو اس متحدہ قومی تصور کی ترقی کی ہزاروں نئی شکلیں نکل آئیں۔ ان دور کے مفکر اختلافات میں بھی یگانگت کے آثار ڈھونڈھ رہے تھے۔ فیضی اور دارا شکوہ نے ہندوؤں کے کلاسیکی ادب کا سنسکرت سے ترجمہ کرکے اور خسرو سے عبدالرحیم خانخاناں تک کئی مسلمان شعرا نے ہندی میں شاعری کرکے ثقافتی مواخات کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ اردو شاعروں نے بھی خسرو کے روایات شاعری کو خصوصیت سے اپنایا اور متصوفانہ شاعری میں مندر ومسجد کے بنیادی اتحاد پر زور دیا' واعظ کی ہنسی اُڑائی' زاہد پر پھبتیاں کسیں اور میر تو اپنے خیال میں "اسلام ترک کرکے' قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھ گئے"۔ غالب نے ترک رسوم پر زور دیا اور کہا کہ جب "ملتیں مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایماں بنتی ہیں"۔ اسی لئے اردو کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے یکساں طور پر اپنایا۔ اور یہ متحدہ قومیت کا ایک محکم ستون بن گئی۔

اورنگ زیب کی پالیسی نے اس تحریک کو وقتی طور پر صدمہ ضرور پہنچایا تھا لیکن سیاسی طور پر وہ بھی ہندستان کی سیاسی وحدت کا خواب دیکھتا رہا۔ اس کے بعد دلّی کی سیاسی اہمیت ہی ختم ہوگئی۔ اسی دور میں اقتصادی اتحاد محاذ اور بنیادی تہذیبی یگانگت ملکی وحدت کے خاص محرک بنے اور انھیں کے باعث ادب کی دنیا میں بھی اتحاد تصور قائم رہا۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام سے فارسی کا اثر ورسوخ کم ہونے لگا اور اردو ایک انحطاط پذیر اور مائل بہ زوال معاشرے کی گود میں ترقی پانے لگی۔ اس دور میں مفلسوں کے شام سے بجھے ہوئے چراغوں کا ذکر تو غزلوں تک میں آنے لگتا ہے۔ اس طرح کے کتنے ہی سیاسی اشعار خود غزل کی رمزیت کا شکار ہوگئے اور آج اُن کے سیاسی محرکات کا پتہ چلانا ناممکن ہے۔ پھر بھی راجہ رام نرائن موزوں کے اس شعر کے بارے میں کسے معلوم نہیں کہ یہ سراج الدولہ کی شہادت سے متاثر ہوکر لکھا گیا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو' کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

کہیں کہیں واضح اشارے بھی ہیں جیسے عبدالحئی تاباں کا یہ کہنا کہ "نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تخت طاؤس"

یا میر کا اپنے زمانے کے امیروں کے بارے میں یہ کہنا کہ "ٹکڑوں پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے" لیکن سیاسی شاعری کے اصلی مخزن ہمارے واسوخت، تشبیب قصائد اور ہجویات ہیں۔ مثنویوں میں بھی واضح ٹکڑے ملتے ہیں۔ شہر آشوب تو لکھے ہی اس لئے جاتے تھے کہ اس میں سماجی پریشانیوں کا ذکر ہو۔ امیروں کی ہجو اور اُن کے ظلم و ستم کی داستانیں عام طور سے مل جاتی ہیں حد یہ ہے کہ قائم نے تو شاہ عالم پر کھلم کھلا تنقید اور اُس کو "ظل الٰہ" کے بجائے "ظل شیطان" اور ظالم کہا۔ اردو کے درباری اتہامات سے آزاد ہونے کی ایک اور قوی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ دلّی کے آخری مغل بادشاہوں نے انگریزوں سے سانباز کرلیا تھا لیکن کوئی بھی شاعر انگریزوں کا مدح خواں نظر نہیں آتا بلکہ اس پورے تماشے کو قابل نفرت سمجھتا ہے۔ مصحفی نے تو صاف صاف کہا ہے

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی   ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہ شعر غالباً اٹھارہویں صدی کے ثلث آخر میں کہا گیا ہوگا اور اُس وقت بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ انگریز ہندوستان کو اقتصادی طور پر تباہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح با فہم طبقہ جرأت کے مانند یہ بُری طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ "پورب کے امیر" ع "انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر"۔ شاہ عالم کی بے دست و پائی نے اکثر شعرا کو متاثر کیا۔ ان میں کمال نے سب سے زیادہ کھُل کر احتجاج کیا۔

اسی سے مجھو رہا سلطنت میں کیا ثبا   ہو جبکہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا

نہ شاہ ہے نہ وزیر، اب فرنگی ہیں مختار

شاہ عالم کی بے کسی اور دلّی کی تاراجی و تباہی نے شعرا و علمائے دلّی کو گرد و نواح میں بکھیر دیا۔ زیادہ تر لکھنؤ آئے، لیکن بہت سے گرد و نواح کی ریاستوں میں بھی پھیل گئے۔ اس دَور کے شعرا میں سے جو لوگ فنّی اعتبار سے کوئی بہت بلند مرتبہ نہیں رکھتے تھے، وہ ضرور والیانِ ریاست کے اشاروں پر چلنے لگے، لیکن جو صاحبانِ ذوق اور صاحبانِ طرز و اسالیب تھے اُنھوں نے کبھی امراء کے آگے ذلیل و خوار ہوکر رہنا گوارا نہیں کیا۔ جب تک اُن کی آؤ بھگت ہوئی وہ درباروں سے وابستہ رہے اور جب اس آؤ بھگت میں اُنھوں نے کوئی کمی دیکھی تو وہ کہیں اور چل دئے۔

اردو کے قصائد کو دیکھ کر بھی اکثر حضرات اردو کی شاعری پر درباری شاعری کا الزام لگا لیتے ہیں۔ یہ طریقۂ استنباط سراسر غلط ہے۔ قصیدہ دراصل قدرت کلام اور اظہار علم کے لئے صنف مخصوص تھا۔ اس کا ایک ڈھانچہ مقرر تھا اور اُس سے انحراف نہیں ہوتا تھا۔ اس میں بادشاہ وقت یا امیر متعلق کی تعریف

کے اشعار بھی شامل کرلئے جاتے تھے، لیکن یہ صرف رسمی اور پُرانہ مبالغہ ہوتے تھے۔ قصائد کی تعداد اردو کے زبردست ادبی سرمایہ کو دیکھتے ہوئے نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان چند قصائد کی بنا پر جن میں بہت سے تو مذہبی قصائد ہیں، اردو شاعری پر درباری ہونے کا حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔ میر و ناسخ و انیس کی طرح کے سیکڑوں شاعر ہیں جن کے ناز والیانِ ریاست خود اُٹھاتے تھے اور جو اپنی مرضی کو والیانِ ریاست کی مرضی کا تابع نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے ہزاروں شاعر ہیں جو کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے سیکڑوں تصوف کے زیر اثر تھے اور ایسے شاعروں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے جنھوں نے والیانِ ریاست کی فرمائش پر بھی درباروں سے وابستہ ہونا گوارا نہیں کیا۔ یہ صداقت ہے کہ آزاد خیالی اور شاعری اردو میں لازم و ملزوم سے رہے ہیں۔ امرا کی ہجویں بھی اُسی اردو کے شاعروں نے لکھی ہیں جس نے قصیدہ گو پیدا کئے۔ سیاست ہی نہیں مذہبی معاملات میں بھی شعرائے اردو بڑی آزاد گفتاری سے کام لیتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو کو تمام مذاہب کے شعرا کی سرپرستی حاصل ہوئی اور اسی سبب سے اردو ہندستان کے سیاسی شعور کی تشکیل و تکمیل میں ایک اہم کردار ہمیشہ سے ادا کرتی رہی۔

درباروں کی خستہ حالی، فرد مائگی اور کم ہمتی، عوام کی پریشانیاں، اہل کمال کی کس مپرسی، ساہوکاروں کے شدائد، عمال کی زیادتیاں اور بدعنوانیاں، رؤسا کی ظاہر داریاں اور درباروں کی ریشہ دوانیاں، سب کی ہو بہو تصویریں اردو کے ادبی سرمائے میں ملتی ہیں اور شاید ہی کسی دوسرے ہندوستانی ادب میں اس فراوانی کے ساتھ ملتی ہوں گی۔ یہ تصویر صرف منفیانہ نہیں ہے بلکہ ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں، بدھ مت والوں اور جینیوں کے مذہبی پیشواؤں اور دیوی دیوتاؤں کو نذرانہ ہائے عقیدت، ہندوستان کے موسموں کا حال اور مناظر کا بیان، ہمسایہ ریاستوں کی جنگیں، سبھی کچھ تو اردو شاعروں کے دامن میں مل جاتا ہے۔ بالخصوص اٹھارہویں صدی سے ہماری قومی تاریخ کے عہد بہ عہد ارتقا کے مرقع نظم اردو کے آئینے میں نظر آنے لگتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ اردو میں قومی ادب کی کمی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں ہمارے پاس جو سرمایہ موجود ہے اُس کو دیکھ کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں، حملہ آور آتے اور جاتے رہے، لیکن ہندستان کا سماجی ڈھانچا جوں کا توں بنا رہا۔ مختلف حصوں سے برابر تجارت ہوتی رہی، درآمد و برآمد کا سلسلہ جاری رہا، زراعتی کاروبار بھی چلتا رہا اور کسان اور تاجر کے مابین مختلف منڈیوں کے ذریعے رابطہ قائم رہا، مکتبوں میں مختلف عقائد و مذاہب کے لوگ ایک ساتھ

بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے رہے، فوجوں میں، دفتروں میں، درباروں میں، بازاروں میں ہندو اور مسلمان باہم ملتے رہے، میلوں ٹھیلوں میں ایک ساتھ شریک ہوتے رہے، اور ایک دوسرے کے تہواروں اور شادی و غمی میں شرکت کرتے رہے، اور دیہاتوں کی پنچائتوں میں اور چوپالوں پر برابر گھل مل کر وقت گزارتے اور مسائل حل کرتے رہے۔ اتنے محرکات قومی وحدت کے موجود ہی تھے اس میں انگریز کے پردۂ سیاست پر ظاہر ہونے اور ہندوستانی تجارت و صنعت کو دھیرے دھیرے گھن لگنے کے باعث مشترکہ مصیبت نے ایک نیا احساس وحدت قومی پیدا کرنا شروع کیا، اور سچ تو یہ ہے کہ سچے قومی احساس کی بیداری کا باعث ہی یہ آفت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ثقافتی وحدت اور زور پکڑ گئی اور ہمارے شاعروں نے مذہبی اختلافات کے مٹانے میں پوری کوشش کی۔ دراصل اُردو کے فروغ کا زمانہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ شروع ہوتا ہے، جب کہ دربار کی سرپرستی بے معنی سی شے ہو کر رہ گئی تھی۔

خیالات کی دنیا میں بھی ہندوستانی جذباتِ عاشقانہ کا گداز اور حسن دوستی کا رس "کھڑی بولی اور" "برج بھاشا" کے علاقوں کی دین ہیں۔ تصوف کا خاص مرکز ایران تھا اور وہاں بھی اختلافِ عقائد کی مخالفت ہوتی تھی۔ چنانچہ حافظ نے کہا تھا کہ ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہند چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

غزل کی وساطت سے یہ تصوف اردو ادب میں بھی آیا اور یہاں اس پر "بھکتی" کا بھی گہرا رنگ چڑھا۔ چنانچہ ہمارے ادب میں دیر و حرم کے جھگڑوں سے بیزاری کا ذکر زیادہ پرخلوص ہوجاتا ہے۔ بت خانوں سے ایک نئی وابستگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور وہاں بھی اسلامی خدا کی تلاش ہوتی ہے۔ باہر سے آنے والے تو گنتی کے چند ہزار افراد تھے۔ وہ بھی ابتدائی ادوار کے آنے والوں کی طرح یہیں بسنے کے لئے آئے تھے۔ اُن کے رسم و رواج، لباس و طعام، طرز خیال و کلام پر مقامی رنگ چڑھتا رہا اور ایک تہذیب پرورش پاتی رہی جس کے بغیر مشترک ادبی زبان کا ارتقا ناممکن تھا۔ اس نئی تہذیب کے تمام مظاہر، بالخصوص ایک نئی زبان کا ارتقا اور اُس کے فکری سرمایہ کا خمیر بھی ہندوستان کے بڑھتے ہوئے سیاسی، سماجی اور ثقافتی اتحاد کے نمائندے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ انیسویں صدی کی قومی سیاست نے اردو کا قدم قدم پر سہارا لیا۔ اس زمانے میں اخبارات بھی شائع ہونے لگے تھے اور ان میں سے کئی ایک اردو میں تھے۔ اردو کا سب سے پہلا اخبار

"جام جہاں نما" تھا، جس کا اجرا ۱۸۲۳ء میں ہوا تھا۔ اِن اخبارات کا ہماری قومی بیداری اور ہمارے قومی ادب کی تشکیل میں بڑا ہاتھ ہے۔ مشہور ماہر لسانیات گارساں دتاسی نے اس کا اقرار کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ذمہ داری زیادہ تر انھیں اخبارات پر تھی۔ چنانچہ "صادق الاخبار" اور "دلّی اردو اخبار" کے مہتمم و مدیر کو سن ستاون کی تحریک سے وابستگی کی بنا پر مرحلہ دار و رسن سے گزرنا پڑا۔ مہتمم "صادق الاخبار" کو سرکار برطانیہ کے خلاف خبریں شائع کرنے پر تین ماہ قید بامشقت کی سزا ملی۔ اور مولوی محمد باقر کو جو دلّی اُردو اخبار کے ایڈیٹر تھے، سولی پر چڑھنا پڑا۔ منیر شکوہ آبادی کو کالے پانی کی سزا ملی۔ ان کے خلاف ایک سراسر جھوٹا مقدمہ کھڑا کیا گیا تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کے خلاف بھی وارنٹ جاری ہو گیا تھا، لیکن وہ کسی طرح بچ نکلے۔ صہبائی کو بھی شہید کیا گیا۔ اور قید، جرمانہ، لوٹ مار اور ذلت کا شکار تو بہت سے شعرا کو ہونا پڑا۔ اس طرح یہ صاف ظاہر ہے کہ اردو ادب نے ہماری قومی تاریخ کے سب سے اہم موڑ پر بھی نمایاں خدمات انجام دیں اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کے اُبھارنے، سن ستاون کی تحریک کو پھیلانے اور قومی عزائم کو آگے بڑھانے میں پورا حصہ لیا۔

قومی ادب کی ابتدا دیر میں ضرور ہوئی، لیکن اس دیر کا سبب یہ نہیں تھا کہ ہمارے ادیب درباروں سے وابستہ تھے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ زوال پذیر درباروں اور خانقاہوں نے ہماری شاعری کو صالح قومی عناصر سے محروم کر دیا تھا۔ اربابِ نظر جانتے ہیں کہ کبھی زبانیں سلطنت، مذہب اور تجارت کے بل بوتے پر آگے بڑھتی ہیں۔ لیکن ہمارے اردو ادب کو سلطنت کا سہارا اس لئے نہ مل سکا کہ درباروں کی زبان فارسی تھی۔ مذہب کے وہ مراکز جو سلطنت سے قریب تھے وہ زیادہ تر تنگ نظر اور متعصب تھے۔ ان سے اردو کو نفرت ہی رہی۔ البتہ خانقاہیں اردو کو پالتی رہیں، اُردو کو ان خانقاہوں سے کوئی مالی امداد نہیں ملتی تھی لیکن مجلسی اور نفسیاتی سہارا ضرور ملتا تھا۔ تجارت نے بھی کچھ سہارا دیا، لیکن وہ ناقابل اعتنا ہے۔ دراصل اردو ہمارے متوسط طبقے کی محبوبہ اور عوام کی منظورِ نظر تھی۔ کوئی میر، کوئی مصحفی، کوئی انیس، کوئی نظیر، کوئی اکبر، کوئی چکبست، اسے ہمیشہ ملتا رہا۔ اور پھر ہمارے مشاعروں نے ہمارے شاعروں کو درباروں سے زیادہ عوامی پسند، بالخصوص متوسط طبقوں کے ذوق کا تابع بنا دیا تھا۔ اس لئے جب انیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے متوسط طبقوں میں بیداری کا آغاز ہوا تو ہماری اردو شاعری اور ادب نے بھی اُسے اپنایا۔ بیرونی طاقتوں کے خلاف ہندوستان میں جذبات کس طرح اُبھرے اور منظم ہوئے اس کی داستان طویل ہے لیکن پس منظر کے طور پر کچھ سمجھنا ضروری ہے۔

بیرونی اقتدار کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں برطانوی، فرانسیسی، پرتگالی اور ڈچ قوموں کا تصور آجاتا ہے۔ یہ تمام بحری طاقتیں تاجروں کی شکل میں نمودار ہوئیں اور بظاہر تجارت کے علاوہ انھوں نے اپنا کوئی اور مقصد نہیں رکھا۔ رفتہ رفتہ اُن کے کارخانے پھیلتے گئے، جن کی حفاظت کے لئے فوجیں رہنے لگیں۔ پھر یہ لوگ آس پاس کے علاقوں میں زمینیں حاصل کرتے گئے اور بادشاہ دلی سے مختلف بہانوں سے مراعات بھی حاصل کرتے گئے۔ اس طرح غیر محسوس طور پر سیاسی شکست کے اسباب تیار ہونے لگے۔

سترہویں صدی عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا اور پلک جھپکاتے ہی انگریز سواحل ہند سے بیرونی تجارت کے اجارہ دار بن گئے۔ ہماری ساری دولت کھنچ کھنچ کر مغربی ممالک کو جانے لگی اور ہماری صنعتیں کمزور ہونے لگیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں کمپنی ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت بن چکی تھی، ہندوستانی راجے مہاراجے یا تو کمپنی کے زیر اقتدار آگئے تھے یا کمپنی کی طرف اُمید اور رخوف بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شہر دلی اور مضافات دلی کا تو کیا ذکر، اُس کا اقتدار لال قلعہ میں بھی مکمل طور سے باقی نہیں رہ گیا تھا، کیونکہ ریزیڈنٹ کے جاسوس چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور ریزیڈنٹ کی مرضی کے خلاف قلعہ کے اندر کبھی تنکا اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دلی کا راجا ہندوستان کے قومی وجود کا نمائندہ تھا۔ سارا ہندوستان اب بھی اُسی کو بادشاہ سمجھتا تھا اور اس غیر ملکی حکومت سے بیگانہ تھا۔

اس قومی حکومت کے دو مخالف تھے۔ ایک تو ریاستوں کی باہمی رقابت اور دوسرے ان امیر ہندوستانی تاجروں کی کوتاہ اندیشی جو یورپین تاجروں کی بدولت سواحلی شہروں کی بڑھتی ہوئی تجارت سے پورا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ سراج الدولہ کے ساتھ اس طبقہ نے جو کچھ کیا تھا وہ واضح ہے۔ ریاستوں کی باہمی رقابت نے خود انھیں کو کمزور کرنا شروع کیا اور نتیجے کے بعد دیگرے ریاستوں کے الحاق کی شکل میں نمودار ہوا۔ انگریزوں کی اس حکمت عملی سے ہماری سیاست میں دور رس نتائج نکلے۔ مقامی امراء کتنے ہی کمزور کیوں نہ رہے ہوں، لیکن مخصوص جاگیردارانہ نظام نے اُن سے لوگوں کو وابستہ بھی کر رکھا تھا۔ اُن کی ریاستوں کے الحاق سے ایک پورا متوسط طبقہ، جاگیردارانہ نظام کے متوسلین کا بیزار ہوگیا۔ اِن میں تاجر، امراء، اہل علم، مذہبی پیشوا اور چھوٹے موٹے زمیندار اور کارندے سبھی شامل تھے۔ طاقت، سازش، ثقافتی مصالحت غرض ہر حربہ ہندوستانی قومیت کے اس اُبھرتے اتحاد کو ختم کرنے کے لئے استعمال کیا جارہا

تھا۔ بنگال میں دورِ کلائیو کی بڑھتی ہوئی بے چینی کا حل کمپنی نے یہ سوچا تھا کہ کمپنی کو ایک تجارتی کارپوریشن کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔ اس فیصلے سے وہ نیا طبقہ بھی کچھ غیر مطمئن سا ہو گیا جو نئے ہندوستانی تاجروں کی شکل میں ابھر رہا تھا اور جس میں بنگال کے مارواڑی، مدراس کے چیٹی اور سورت کے گجراتی خاص طور سے نمایاں تھے کیونکہ ان کی طاقت اور سازش کی ضرورت اب کم ہوگئی تھی۔ اب مقبوضہ اور مفتوحہ علاقوں میں بسنے والے توجہ کا مرکز بن رہے تھے۔ تجارتی حیثیت کے خاتمے کے بعد کمپنی کا کام سیاسی ہی رہ گیا تھا جس پر برطانوی پارلیمنٹ کڑی نظر رکھنے لگی تھی۔ اب گورنر جنرل کی کونسل مقبوضہ علاقوں میں برطانوی حکومت کی نمائندگی کرنے لگی تھی۔ اس کونسل نے سب سے پہلے دورِ کلائیو کی لوٹ مار کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی اور بعض شعبوں میں ایک مہذب حکومت کے ابتدائی آثار، حکومت ہند میں نظر بھی آنے لگے۔ لیکن اسی دوران میں الحاق کی پالیسی کو بھی زور شور سے آگے بڑھایا گیا۔ مرہٹوں کی طاقت توڑنے کے لئے ستارا، جھانسی اور ناگپور کا الحاق عمل میں لایا گیا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پنجاب کا الحاق ہوا۔ آخر میں اُس اودھ کی بھی باری آگئی جس پر برطانوی سرکار کلکتہ کی للچائی ہوئی نظریں مدتوں سے پڑ رہی تھیں۔ جن کی ریاستیں اس طرح چھینی گئی تھیں، وہ عوام کی نگاہوں میں مظلوم بن گئے تھے۔ خود ان میں کتنی ہی خرابیاں رہی ہوں، مگر وہ پھر بھی ہندوستانی تھے۔ اب وہ بھی مظلوم اور مفلوک الحال عوام کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ وہ تھے تو عوام ہی کی طرح بولتے رہتے سہتے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ اُن کے نہ رہنے سے عوام جیسے بے سہارا ہو گئے اور ان کو ایسے حاکم ملے جن سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ پہلے انگریزوں نے درپردہ ہندو اور مسلم کے سوال کو بھی ابھارنا چاہا لیکن چونکہ مسلم ریاستوں کی طرح مرہٹہ اور سکھ حکومتیں بھی چھن گئیں، اس لئے ہر فرقہ کے افراد تلملا اٹھے اور مذہبی مفکرین تک بیزار ہو گئے۔

ان سیاسی تبدیلیوں کے پہلو بہ پہلو ثقافتی محاذ پر بھی کچھ تبدیلیاں تیزی سے ہو رہی تھیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فارسی نے درباری اور دفتری زبان کی حیثیت سے ہندوستان میں وہ اہمیت حاصل کر لی تھی کہ سلطنت مرہٹہ تک کی زبان فارسی تھی۔ سیاسی طور سے مغل اور مرہٹے دشمن تھے لیکن فارسی اس دشمنی کے اثر سے محفوظ تھی۔ ایسا مجبوراً کرنا پڑتا تھا کیونکہ سیاسی کاموں کے لئے یہی [illegible] زبان بن چکی تھی اور فارسی کے جاننے والے ہر جگہ اور ہر مذہب اور معاشرتی حلقے میں مل جاتے تھے لیکن دلّی کی سیاسی مرکزیت کی کمزوری کا اثر بالواسطہ فارسی پر یہ پڑ رہا تھا کہ ایک طرف تو اردو شمالی ہند اور

دکن میں ایک مستقل ادبی زبان بنتی جارہی تھی اور فارسی کی حریف بن کر اُبھر رہی تھی اور دوسری طرف انگریز اپنی زبان کو آگے بڑھانے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔

درمیانی وقفے کے لئے فارسی کو بھی باقی رکھنا ضروری تھا تاکہ مقامی امراء و عمال اور مغربی حاکموں کے مابین ایک لسانی رابطہ قائم رہ سکے۔ سب سے پہلا گورنر جنرل وارن ہسٹنگز، خود فارسی اور سنسکرت کا عالم تھا۔ اُس نے ہندوؤں کے دھرم شاستر اور مسلمانوں کے شرعی قوانین کا ترجمہ کرایا اور جدید طرز پر اُن کی ترتیب دلوائی۔ غلام حسین سے "سیرالمتاخرین" بھی اُسی نے لکھوائی تاکہ کمپنی کے برطانوی ملازمین ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہوسکیں۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام ہوا۔ کمپنی کو نہ صرف جدید تعلیم پائے ہوئے ہندوستانی ملازمین کی ضرورت تھی بلکہ جو انگریز افسر ہندوستان میں آتے تھے اُن کو ہندی دار دو سے واقف کرنا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے علاوہ آگرہ کالج، دلّی کالج کے قیام کے اسباب بھی تھے۔ یہاں اور مضامین کے ساتھ اردو کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ جدید علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم بھی یہاں کرائے گئے۔ ان کالجوں نے ایک نئی روشنی پھیلانے کی ناکام کوشش کی۔ جو لوگ انگریزوں کے خلاف تھے وہ اپنے بچّوں کو ان مدارس میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے اور اِن کی تعداد کافی تھی، اس لئے ثقافتی یگانگت پیدا کرنے میں کوشش خاطر خواہ طریقہ پر بار آور نہ ہوئی۔ اِس سے گورنر جنرل نے اپنی پالیسی ہی بدل دی اور ۱۸۲۵ء میں انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیدیا۔ دس برس کی مدت بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ انگریزی تمام انگریزی کالجوں میں ذریعۂ تعلیم قرار دیدی گئی۔ ۱۸۳۵ء میں عدالتوں کی زبان بھی انگریزی کردی گئی۔

اسی سال کمپنی نے اپنا سکّہ بھی جاری کیا اور اُس سے بادشاہ دلی کا نام اُڑا دیا۔ اس طرح امراء اور علماء و ادباء کی صفوں میں بےچینی پیدا ہونے لگی۔ اِن تبدیلیوں نے انھیں جھنجھوڑنا شروع کیا۔ سرجان شور کے بیٹے، فریڈرک جان شور نے اپنی کتاب "نوٹس آن انڈین افیرس" میں ہندستان (۱۸۳۷ء) کے بارے میں لکھا ہے کہ "اگرچہ بظاہر ہر طرف ایک سکون اور خاموشی کا عالم نظر آتا ہے لیکن فی الحقیقت سارا ماحول ایک بارود خانے کے مانند ہوگیا ہے جس کو ایک معمولی سی چنگاری بھی کسی وقت مشتعل کرسکتی ہے۔" وقت کی بات کہ ایک نہیں کئی چنگاریاں مختلف سمتوں سے اُڑ اُڑ کر آنے لگیں اور سب کا رُخ اسی بارود خانے کی طرف تھا۔

وہی کمپنی جو پہلے ہر فرد کی اعانت کی محتاج رہتی تھی اب شرفاء اور اُمراء سے مشورہ تک لینا گوارا

نہیں کرتی تھی۔ اعلیٰ ملازمتوں میں کوئی ہندوستانی نہیں لیا جاتا تھا۔ فوج میں بھی نسلی امتیازات رونما ہونے لگے تھے۔ اس پر الحاق کی پالیسی سمندِ بغاوت کو ایک اور تازیانہ ہوئی۔ بالخصوص واجد علی شاہ کی معزولی سے اودھ کے سارے علاقے میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ نیویارک کے "ڈیلی ٹریبون" میں کارل مارکس نے (۲۵ جون ۱۸۵۳ء) کو لکھا تھا کہ :۔

"یوں تو ہندوستان کی تباہی میں خانہ جنگیوں، بیرونی حملوں، انقلابوں اور قحطوں کا بھی کافی ہاتھ رہا ہے لیکن اِن تباہیوں کا اثر عموماً سطحی ہوتا تھا۔ برطانیہ نے تو ہندوستان کے سماجی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اُس پر طرّہ یہ کہ ابھی تک کسی نئے نظام کی داغ بیل پڑنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہندوستان اپنی پُرانی دنیا تو کھو چکا ہے لیکن اُسے نئی دنیا نہیں مِل پائی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ برطانیہ کی غلامی میں آ کر موجودہ ہندوستان اپنی گزشتہ روایات اور قدیم تاریخ سے ناتا ہی توڑ چکا ہے۔"

اس محرومی و ناکامی کا احساس بھی عام تھا۔ برطانوی استیلا کے اثرات دور دور تک پھیل چکے تھے اور بے چینی ہندوستان گیر شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس کی تصدیق اُس فرمان شاہی سے ہوتی ہے جو بہادر شاہ ظفر نے ۲۵ راگست ۱۸۵۷ء کو جاری کیا تھا اور پہلے "دلّی گزٹ" میں اور وہاں سے "فرینڈ آف انڈیا" سیرام پور کی اشاعت ۷ راکتوبر ۱۸۵۷ء میں نقل ہوا تھا۔ اس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :۔

"..... زمینداریوں سے متعلق مقدمات میں اسٹامپ کی بہت زیادہ قیمت اور دیوانی عدالتوں کے غیر ضروری اخراجات اور مقدمات کو سالہا سال التوا میں رکھنا، اِن سب کا مقصد مقدمہ بازوں کو مفلس بنانا ہے۔ علاوہ ازیں زمینداروں پر مدارس، شفاخانوں اور گزرگاہوں کے لئے سالانہ ٹیکس عائد کئے گئے ہیں۔"

"..... برطانوی حکومت نے تمام نفیس اور بیش قیمت اشیاء مثلاً نیل، پارچہ جات اور دیگر اشیاء برآمد کی تجارت پر اجارہ داری قائم کر لی ہے اور محض چھوٹی موٹی چیزوں کی تجارت دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑی ہے اور اُس میں بھی وہ نفع کے حصہ دار ہیں..... تاجروں کے نفع پر (بھی) ڈاک محصول، چنگی، مدارس کے لئے چندے وغیرہ کے ٹیکس عائد کرتے ہیں۔"

یہ فرمان پہلی جنگ آزادی کے آغاز کے فوراً بعد جاری ہوا تھا۔ لیکن اس سے محرکات غدر پر

روشنی پڑتی ہے۔ زمیندار، تاجر، دستکار، شہری ملازم، فوجی، مولوی، پنڈت، غرض بھی طبقات غلامی کا بوجھ محسوس کرنے لگے تھے۔ اس ہمہ گیر جذبے کے تاثرات ہمارے ادب پر بہت گہرے پڑے ہیں۔ اس لئے اسی دور کو نقطۂ آغاز بنا کر ہم نے قومی ادب کا صد سالہ انتخاب شاعری پیش کیا ہے۔ قومی ادب کے ویسے تو بے شمار پہلو ہیں، جن میں ثقافتی اور سماجی مسائل بھی سامنے آتے رہے ہیں لیکن اس مجموعے میں آپ کو جنگ آزادی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق نظمیں ہی زیادہ ملیں گی اور جنگ آزادی کی عہد بہ عہد ترقی کے ساتھ آزادی کے مفہوم کے تدریجی ارتقا اور پھیلاؤ کی جھلک نظر آئے گی۔ اس ابتدائی منزل آزادی میں جس کے پس منظر کا ابھی ذکر کیا جا رہا تھا، ہمارے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ غدر کے وقت ملک کے مختلف گوشوں سے اردو کے بیسیوں اخبارات شائع ہونے لگے تھے۔ اگرچہ اُس زمانے میں سیاسی شاعری کا عام رواج نہیں تھا لیکن کئی سیاسی نظمیں اس زمانے میں شائع ہوئی ہیں۔ بعض تذکروں اور دیوانوں میں بھی واضح اشاراتی نظمیں یا اشعار مل جاتے ہیں۔

اس ابتدائی دور میں کچھ عناصر فرمانِ مذکورۂ بالا کے مطابق، اس لئے بھی جنگ آزادی میں شریک ہو گئے تھے کہ "اہل یورپ ہندومت اور اسلام دونوں کے دشمن ہیں۔" ولی اللّٰہی "جماعت کے لوگ مدتوں سے عوام کو آمادۂ جہاد کر رہے تھے۔ فی الحقیقت اس طبقے نے سب سے پہلے بڑھتی ہوئی بیرونی طاقت کے اخراج کا نعرہ بلند کیا۔ 'جہاد' کی تحریک، بظاہر مذہبی، لیکن درحقیقت سیاسی تھی اور اس تیزی سے پھیل رہی تھی کہ مومن ایسے محبت و حسن کے گیت گانے والے شاعر بھی اس سے متاثر ہوئے تھے۔ اُن کی 'مثنوی جہاد' اب بھی اُن کے کلیات میں موجود ہے۔ اُس مثنوی کو عمداً اس مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ اس سے جنگِ آزادی کے ابتدائی محرکات کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان تھا۔

بہرحال، جن لوگوں کا ذہن ہمیشہ صاف رہا اور جو غیر ملکی طاقت کے استیصال ہی پر زور دیتے رہے اُن میں مولوی احمد اللہ نے خاص کردار ادا کیا ہے۔ وہ فیض آباد کے ایک بڑے زمیندار تھے۔ رتن لال بنسل کے بقول مولوی احمد اللہ نے "نہ تو راجاؤں اور نوابوں کی ڈیوڑھی کے چکر لگائے اور نہ ولی اللّٰہی جماعت کے نیتاؤں کی طرح، مسلمان جنتا تک ہی اپنے پرچار کو محدود رکھا" بلکہ "وہ لکھنؤ سے آگرہ تک کے بیچ دورے کرتے رہتے تھے اور دس دس ہزار آدمیوں کی بھیڑ اُن کی تقریر سننے کے لئے اکٹھی ہو جایا

کرتی تھی۔ مولوی احمد شاہ اُن کو بتاتے تھے کہ انگریز کس طرح اس ملک میں بڑھتے گئے اور اگر پورا ملک ان کے قبضے میں چلا گیا تو اس کا نتیجہ عام فضا کے لئے کیا ہوگا۔ اس طرح یہ تقریریں سو فی صدی سیاسی ہوتی تھیں ـــــ اُس زمانے میں شاید مولوی احمد شاہ پہلے آدمی تھے جنھوں نے اپنے پرچار کا یہ طریقہ اپنایا۔

کہا جاتا ہے کہ نانا راؤ اور مولوی احمد اللہ نے بغاوت کے لئے ایک باقاعدہ پلان تیار کیا تھا۔ اس سلسلے میں نانا راؤ کے سفر لکھنؤ و انبالہ کا ذکر کیا جاتا ہے اسی طرح رنگو باپو اور عظیم اللہ خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مل کر کوئی پلان تیار کیا تھا۔ لیکن ان سب کے تاریخی شواہد بہت ہی کمزور ہیں۔ ولی اللّٰہی جماعت نے ایک تنظیم خاصے پیمانے پر تیار ضرور کی تھی لیکن یہ ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جس طرح شروع ہوئی اُس کا تصور بھی اس جماعت کو تھا!

جنگ آزادی کے سلسلے میں یہ سوال اہم بھی نہیں ہے کہ یہ کسی پلان کے ماتحت عمل میں آئی یا نہیں۔ اوپر جو تاریخی شواہد درج کئے گئے ہیں اور جن سے انکار کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ سلطنت اودھ کے انتزاع کے بعد ہی ہندوستان کے طول و عرض میں ہر جگہ اور ہر طبقے میں انگریزوں کے خلاف پھیلتی ہوئی بغاوت کی آگ یکایک بھڑک اُٹھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ فوج سے شروع ہوئی۔ وہاں کے علاوہ شروع بھی کہاں سے ہو سکتی تھی۔ کس کے پاس اسلحے تھے، کس کے پاس طاقت تھی اور کس میں سر اُٹھانے کی ہمت تھی۔ اس لئے اس کا قوی امکان ہے کہ ناراض مولویوں، پنڈتوں، راجاؤں، نوابوں، دستکاروں اور صناعوں میں سے سبھی نے فوج کو برانگیختہ کرنے میں ہاتھ بٹایا ہو اور اس کا بھی پورا ا[illegible] ہے کہ بغاوت کی منصوبہ بندی فوجی مرکزوں کو پیش نظر رکھ کر ہی کی گئی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ سارا ہنگامہ اس با[illegible] پر شروع ہوا ہے کہ چربی والے کارتوسوں کے استعمال کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن دورانِ جنگ آزادی اور اس کے بعد حکومت برطانیہ نے جو تحقیقاتیں اسباب بغاوت کے معلوم کرنے کے لئے کیں اُس کے نتائج یہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اِن کارتوسوں کے علاوہ بھی قوی محرکات موجود تھے۔ خود لارڈ سیلسبری نے پارلیمنٹ میں یہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ اتنا زبردست اندولن اور ہمہ گیر تحریک صرف کارتوسوں پر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

۹ مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستانی سپاہیوں نے میرٹھ میں علم بغاو[illegible] یہ جنگ آزادی کی ابتدا تھی۔ اگر صرف فوجی "غدر" ہوتا تو وہیں ختم ہو جاتا لیکن مولوی ذکاء اللہ ایسے برطانیہ دوست [illegible] نے صاف صاف لکھا ہے کہ اس واقعہ کے پہلے ہی سارے شہر میں یہ افواہیں گونج رہی تھیں کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اندر

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جنگ کی ابتدا ہوتے ہی دیہاتوں کے لوگ آ آ کر اس میں فوراً ہی حصہ لینے لگے ۔ اور فوجیوں کے ساتھ ساری شہری آبادی ہو گئی ۔ یہ جنگ غیر منظم سہی لیکن تھی عوامی جنگ جو حصولِ آزادی کے لئے لڑی جا رہی تھی ۔ مجاہدوں کی زبانوں پر "دلّی چلو" کے نعرے تھے ۔ پھر جب مجاہد دلّی پہنچتے ہیں تو سیدھے قلعے کا رُخ کرتے ہیں اور بہادر شاہ ظفر کو اُس کا کھویا ہوا اقتدار واپس کرتے ہیں ۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ میرٹھ سے دلّی تک یہ جہاں بھی جاتے ہیں وہاں ان کا استقبال ہوتا ہے اور کہیں بھی ہندوستانی سپاہی ان سے مزاحمت نہیں کرتے ۔

کچھ لوگوں نے تحریک کے بعض قائدین کی نیت پر شک کیا ہے ۔ وہ رانی لکشمی بائی اور نانا صاحب دھندوپنت کے ابتدائی رجحانات پر زور دینے لگتے ہیں ۔ یہ طریقہ بالکل ناسائنسی ہے ۔ آغاز کے خیالات سے کیا ہوتا ہے جب وہ لڑائی میں پھاند پڑے اور ارادہ کر لینے کے بعد اُن کے قدموں کو جنبش نہیں ہوئی ، اتنا ہی اہم ہے کہ جب حالات نے نئی کروٹ لی تو اُس نئی کروٹ کے ساتھ کچھ لوگ میدان میں آ گئے اور انتہائی دلیری سے لڑ مرے ۔ اور رانی لکشمی بائی اُس کا کردار تو ہمارا سب سے پیارا اور اہم قومی کردار ہے ۔ اُس نے ایک پوری صدی تک نوجوانوں کو عمل و حرکت پر آمادہ کیا ہے ۔ یوں تو جنگ آزادی کے شہیدوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن رانی لکشمی بائی کا نام یقیناً سر فہرست رہے گا ۔

اگر ہم سپاہیوں [illegible] شورش [illegible] ہم مان لیں تب بھی [illegible] کر

اس غدر نے ہر دل میں ایک نئی گرمی اور ہر اندھیرے میں ایک نئی روشنی پھیلا دی ۔ [illegible] تو معلوم ہوتا ہے ابھی سب کچھ نہیں کھو گیا ہے اور جیسے ہی میرٹھ سے پہلا شعلہ بھڑکا ویسے ہی ہر گوشے اور ہر طبقے سے ہمدردانہ تحریکیں اُبل پڑیں ۔ ان سب کا نشانہ یقیناً انگریزی حکومت تھی جس کی مخالفت کی بنیاد خاص اُس کا غیر ملکی ہونا تھا ۔ اس طرح ایک وسیع مفہوم میں یہ قومی تحریک ہی تھی ۔

ان جنگوں کو ہم ایک اور وجہ سے جنگ آزادی کا نقطۂ آغاز سمجھنے پر مجبور ہیں ۔ بظاہر، آخری نتائج کے اعتبار سے، ہم یہ جنگ ہار گئے ، لیکن اس نقطے سے ایک نئی فتح بھی شروع ہوئی ۔ اس جنگ نے سارے ملک کو اِس سرے سے اُس سرے تک چونکا دیا اور عوام و خواص کو ایک نیا قومی اور وطنی احساس پیدا کرایا ۔ اس وطنی احساس نے علامت کے لئے اودھ میں واجد علی شاہ کا اور دلّی میں بہادر شاہ ظفر کا بھیس بدل لیا تھا ورنہ بہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی انگریزوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے تھے ۔ واجد علی شاہ

معزولی کے بعد تک ملکۂ وکٹوریہ کے پاس جاکر اودھ کی واگزاری کا خواب دیکھ رہے تھے، وہ عوام سے یا اُن کی تحریکِ آزادی سے کیا دلچسپی رکھ سکتے تھے اور بہادر شاہ ظفر نے تو اپنے مقدمے میں ابد ہی میں اس کو صاف صاف لکھا کہ وہ مجاہدین آزادی سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان مجاہدین نے ان کو مجبور کرکے تمام کارروائیوں میں اُلجھا دیا تھا۔ واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر دونوں ہی کو عوام نے اس انقلاب میں کسی حد تک شامل ہونے پر مجبور کیا۔ واجد علی شاہ نے تو اپنی مثنوی "حزنِ اختر" میں جس کے کچھ اقتباسات اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں، یہ دکھایا ہے کہ عوام انھیں ڈرا اور دھمکا رہے تھے۔ عوام اِن لوگوں کو کیوں مجبور کر رہے تھے؟ کیونکہ یہ لوگ اپنی نام نہاد شاہی کے باعث قومی عزت وحکومت کی علامت تھے!

اس زمانے میں فرقہ وارانہ یک جہتی بھی اپنی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ جب مولوی احمد اللہ شاہ کو انگریزوں نے گرفتار کرکے قید کرلیا اور پھانسی کی سزا دے دی تو ان کو تختہ دار سے بچانے کے لئے فیض آباد کے گرد ونواح میں جو زبردست عوامی تحریک چلی اُس کے قائد صوبہ دار دلیپ سنگھ تھے۔ انھوں نے فیض آباد کے تمام انگریز افسروں کو قید کرکے فیض آباد کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ پھر ہندوستانی سپاہیوں اور جنتا کی بہت بڑی بھیڑ جیل کی دیواروں کو توڑ کر مولوی احمد اللہ کو وہاں سے رہا کرالائی۔ لیکن صوبہ دار دلیپ سنگھ نے فیض آباد کی حکومت اپنے پاس نہیں رکھی بلکہ مولوی احمد اللہ کے سپرد کر دی اور مولوی احمد اللہ نے فوراً اعلان کیا کہ بادشاہ اصلی واجد علی شاہ ہیں! وہی علامتی بادشاہ!

یہ جذبات اتنے ہمہ گیر تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے مقابلے میں افواج ہند کو جو پہلی کامیابی ہوئی ہے اُس سے نہ صرف میرٹھ میں بلکہ سارے نواح دلی میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور مولوی محمد حسین آزاد نے اُس مہینے کے "دلی اخبار" میں فتح افواج شرق کی تاریخ نظم کر دی۔ ایسی ہی فارسی میں بھی دو ایک نظمیں ملی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کے بعد برطانوی حکومت نے ظلم وستم کا جو بازار گرم کیا تھا اُس کے بعد ایسی نظموں کے باقی رہ جانے کا کیا امکان تھا۔ معلوم نہیں کتنا ذخیرہ ہمیشہ کے لئے ہم سے چھن گیا، پھر بھی یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ایسی نظمیں آج بھی موجود ہیں۔ کیا خود ان نظموں سے یہ صاف پتہ نہیں چلتا کہ آزاد حلقوں کو اس جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں کی فتح سے خوشی اور پسپائی سے رنج پہنچتا تھا۔ وہ اسے اپنی ہی جنگ سمجھتے تھے۔ اگر عوام کی عملی ہمدردی شامل نہ رہتی تو یہ جنگ بے تنظیم اور بے سرمایہ کے ڈھائی برس تک لگاتار چلتی کیسے؟

لڑنے والوں نے جانیں دے دیں، جانبازوں نے جامِ شہادت نوش کیا، انگریزوں سے جنگ کرنے

والے راجاؤں، نوابوں اور سورماؤں کو شکست ہوگئی ۔ اور ۔ اور پھر ایک بھیانک ظلم و تشدد کا دور شروع ہوا۔ دلی اور اودھ کے علاقوں میں دہشت انگیزی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس کی شاہد وہ بے شمار نظمیں ہیں جو اسی عہد کے شعرا نے کہی ہیں اور جن میں سے چند اس مجموعے میں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ یہ نوحے صرف مقامی رنگ رکھتے ہیں، پھر بھی رسمی نہیں ہیں بلکہ شاعر بیچ بیچ خون کے آنسو روتے ہیں۔ ان نوحوں میں حکومت کا نوحہ نہیں ملتا کیونکہ سلطنت مغلیہ تو سن ستاون سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ ان میں نوحہ ہے دلی کی بربادی کا، دلی کی کھوئی ہوئی صحبتوں کا، دلی کے [illegible] نظام کا! لیکن ایک نغمہ ان سب سے مختلف بھی سنائی دیتا ہے، وہ منیر شکوہ آبادی کی آواز ہے۔ [illegible] شکوہ آبادی اُن لوگوں میں ہیں جن کو جنگ آزادی میں شرکت کے باعث کالے پانی کی سزا دی گئی تھی، اور جو دس برس تک قید فرنگ میں محبوس رہے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانۂ اسیری و رہائی میں کافی نظمیں لکھیں۔ ظاہر ہے کہ بہت سا سرمایہ تلف ہو گیا اور جو براہ راست برطانیہ دشمن تھیں، [illegible] کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ پھر بھی جو ہے وہ بہت ہی قیمتی ہے۔

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سبھی کی آنکھیں کھل گئیں۔ دلی کے لال قلعہ میں خاندان تیموریہ کی آخری ٹمٹماتی شمع کے بجھنے کے بعد ہی لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس شمع کے بجھنے کے پہلے ہی بساط الٹ چکی تھی! اپنی صد ہزار سالہ تاریخ کی یادگار اور علامت لال قلعہ کی مصنوعی دنیا نے ہماری آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے۔ جب یہ قلعہ اجڑا تو یہ پردہ اٹھا کہ ہم جس انحطاط پذیر نظام کو سہارا دینے کی آخری کوشش میں ابھی ابھی ناکام ہو چکے تھے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو گیا تھا۔

یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا جس کی سیاسی اہمیت کو تو ہر ایک نے محسوس کیا لیکن جس کے معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی پہلوؤں پر کم لوگوں کی نظر گئی۔ ویسے تو راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۸ء میں ہی برہمو سماج قائم کر دی تھی اُن کے علاوہ مہرشی ٹیگور اور کیشب چندر سین بھی اس نئی ثقافت سے مصالحت کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے تھے اور مذہبی اور سماجی اصلاح کا کام شروع ہو گیا تھا۔ لیکن مسلمان اس نئی ثقافت سے چڑھتا تھا، کیونکہ اس کی مذہبی اصلاح کی تحریک کے قائد مولانا سید احمد بریلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولوی کرامت علی جونپوری وغیرہ انگریزی علوم و ثقافت سے ناآشنا تھے اور ذہنی طور سے ابھی تک وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ وہ ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے ختم ہو چکے ہیں۔ بہرحال مذہبی اصلاح کی تحریکوں نے ذہنوں میں ایک تازہ وسعت پیدا کرنا شروع کی۔ اسی کے ساتھ اخبار نکلنا شروع ہوئے۔ چھاپے خانے کی ایجاد سے کتابوں کی نشر و اشاعت ہونے لگی اور ایک نئی جغرافیائی وحدت کا تصور پیدا ہوا، جس نے قومی احساسات

کو اُبھارنا شروع کیا۔ سن ستاون کے واقعات نے اس نئی تحریک کی طرف سے وقتی طور سے توجہ ہٹادی لیکن جیسے جیسے حالات اعتدال پر آنے لگے یہ اصلاحی تحریکیں پھر اُبھریں بلکہ اور زور وشور سے آگے بڑھیں۔ وجہ ظاہر تھی۔ شدید شکست کے بعد ہندوستانیوں کی فوجی طاقت بالکل ختم کردی گئی، اسلحے چھین لئے گئے، قوانین سخت بنادئے گئے، احتساب شدید کردیا گیا، کچھ لوگوں کو ڈرا کر اور کچھ لوگوں کو لالچ دلا کر عوامی تحریکوں سے الگ کردیا گیا۔ اس لئے ایک یاس انگیز اور قنوطیت پسندانہ ماحول پیدا ہوگیا۔ اصلاح پسندی کا دوسرا دور جو پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد شروع ہوا وہ اسی قنوطیت کا نتیجہ تھا۔

اس موقع پر سرسید کی مصالحت پسندی اور اکبر کی ناقابل تسخیر روایت پسندی نے شرح پیدا اور طنز شدید کے لباس میں اس قنوطیت کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ اس وقت تین طاقتیں اُردو کے ادبی مورچے پر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک وہ لوگ تھے جو کسی شرط پر بھی واقعات سے مصالحت کرنے کو جُرم سمجھتے تھے لیکن سارے ہندوستان کو پیچھے کی طرف ڈھکیل لے جانا چاہتے تھے اور انگریزی تعلیم تک کے دشمن تھے۔ دوسرا وہ طبقہ تھا جو مغرب کی کورانہ تقلید سے گھبراتا تھا مگر ضروری اور فوری اصلاحات کو برا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جو نئی برطانوی ثقافت کو فوراً قبول کرنا چاہتا تھا۔ سمتیں مختلف تھیں لیکن اصلاح کی یہ تحریکیں ایک نئی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئیں اور لوگ پرانی ڈگر چھوڑ کر نئے راستوں پر چلنے کے لئے آمادہ بھی ہو گئے۔ یہ بجائے خود ایک کارنامہ تھا۔ لیکن ایک طرف ایک نئے نظام کی پیدائش کے آثار درد اور تکلیف کی شکل میں نظر آرہے تھے تو دوسری طرف ایک پرانا نظام بھی جاں کنی کے شدائد میں مبتلا تھا۔ یہ اصلاح و تبدیلی بڑی ذہنی صعوبت و کرب کے بعد، بڑی تکفیر و توہین کے بعد قبول کی گئی۔ نئی تعمیر کا جذبہ ایک نامعلوم دُنیا کی جانب لئے جارہا تھا اور خوف و خطر کا احساس فطری تھا۔ دوسری طرف ماضی سے یکایک رشتہ توڑنے میں جو تخریب یقینی تھی اُس کا بھی ڈر لگا تھا۔ سرسید کی تحریک کے رشتے ایک طرف تو اُس عام اصلاحی تحریک سے ملے ہوئے ہیں جو ایک نئے قومی احساس کو جنم دے رہی تھی اور جس کے باعث جنگ آزادی کی ابتدا کے پہلے ہی برٹش انڈیا سوسائٹی (۱۸۴۳ء)، دادا بھائی نوروجی اور جگن ناتھ شنکر سیٹھ وغیرہ کی "بمبئی ایسوسی ایشن" (۱۸۵۲ء) [جس کی بنیاد و لکھ بعد میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن قائم ہوئی] بنگال میں ڈاکٹر راجندر لال مترا اور رام گوپال وغیرہ کی "برٹش انڈیا ایسوسی ایشن" (۱۸۵۱ء) وغیرہ کا جنم ہوچکا تھا۔ دوسری طرف سرسید کی تحریک کے ڈانڈے ولی اللّٰہی تحریک سے ملے ہوئے تھے جو اصلاح پسندی کو مذہب کے حدود میں بھی داخل کرنا چاہتے تھے۔ صاحبِ "حجۃ اللہ البالغہ" یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ "مصطفوی

شریعت کو برہان و دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کر کے میدان میں لانے کا وقت آگیا ہے۔" پھر سن ستاون کے بعد جو واقعات رونما ہوئے انھوں نے اس تحریک کو ایک سیاسی تحریک بھی بنا دیا۔ وہ مسلمان جو بغاوت کے الزام میں معتوب و مقہور تھے اُن سے شکست خوردہ دشمنی کا سلوک کیا جارہا تھا۔ ملازمتوں کے دروازے اُن پر بند تھے اور انگریزی حکومت اُن پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ایک حکمراں جماعت کا بالکل ہی سیاسی زندگی سے علیحدہ کر دیا جانا ایک جماعتی سانحہ تھا جسے مسلمان شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ اس میں سرسید احمد نے تعاون کی آواز بلند کی اور انگریزوں اور ہندستانی مسلمانوں کے مابین خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے ایک ادبی، تعلیمی اور تقریری مہم جاری کردی۔ اُن کو اس میں اُن کے رفقائے کار بھی مل گئے۔ اس زمانے کے اور ہندستانی قائدین کا رویہ بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ پہلی جنگ آزادی کی کامیابی اور پوری قوم کے نہتے ہو جانے کے بعد جنگی کارروائیوں کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے دور انحطاط کی پیدا کردہ خرابیوں کے ازالے کی طرف ذہن جانے لگا۔ عیش پسندی، کاہلی، تعیش دشمنی وغیرہ کے خلاف مہم شروع ہوئی۔ لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ جو نیا نظام قائم ہوا ہے وہ مادّی اعتبار سے بھی ترقی یافتہ ہے اور علمی و ذہنی اعتبار سے بھی۔ اسلئے مادّی، علمی و ذہنی ترقی کے حاصل کرنے کی طرف توجہ کا مبذول ہونا لازمی تھا۔ اس طرف سبھی کی نظر گئی۔ سرسید کی کی بھی نظر گئی لیکن سرسید کی تحریک کی اہمیت زیادہ اس لئے ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے غم و غصہ کو فرو کر کے اشتراکِ عمل کے راستے پر ڈال دیا۔

اس سے یہ اندازہ لگا لینا غلط ہوگا کہ سرسید کے سامنے کوئی قومی تصور نہیں تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم تصور کرتے تھے۔ اور انگریزوں اور ہندستانیوں کی مساوات پر بھی زور دیتے تھے۔ وہ اس پر اصرار کرتے تھے کہ ہندستانیوں اور انگریزوں کو برابر عہدے ملنا چاہئے۔ انھوں نے کونسلوں اور لوکل بورڈوں کے لئے انتخاب پر زور دیا اور ہندستانیوں کو حصول حکومت کے قابل بننے کے لئے جدید تعلیم کی تائید کی۔ یہ ضرور ہے کہ بعد میں وہ مسلمانوں کی جماعتی مانگوں پر بھی دھیان دینے لگے تھے لیکن وہ کرتے کیا۔ انگریزوں نے اپنے برتاؤ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین فرق کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں ان خیالات کا ابھرنا بھی لازمی تھا۔ انگریزی پالیسی تو "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی تھی ہی۔ پھر بھی سرسید کے یہاں تعصب نہیں ہے اور یہ بھی کم اہم نہیں ہے۔

اس دور کے اُردو ادب میں ایک خاص انقلاب نظر آرہا ہے جس کا اظہار حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں اور آزاد نے آب حیات میں اور "نظم آزاد" کے مقدمے میں کیا ہے۔ پہلی بار اس کی ضرورت محسوس کی جانے

لگی کہ ادب میں افادیت بھی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کرنل ہال رائڈ کی "انجمن پنجاب" (۱۸۶۵ء) کے قیام کے بعد ایسی نظمیں کہی جانے لگیں جن میں واضح مقصدیت ہوتی۔ یہاں بھی دو دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالی مسلمانوں کی زبوں حالی کے مرثیہ خواں ہیں۔ لیکن آزاد عام وطنی بیداری کے گیت گاتے ہیں۔ ان نظموں میں انقلابی للکار اور باغیانہ جوش و خروش نہیں ملے گا۔ لیکن زندگی کی خواہش اور حالات کو ساز گار بنانے کا جذبہ ضرور ملے گا۔ وطن دوستی کا جذبہ سب سے پہلے صاف صاف طور پر اسی زمانے میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ "حب وطن" پر حالی اور آزاد دونوں ہی کی نظمیں موجود ہیں، لیکن حالی کے حب وطن کا تصور محدود ہے۔ وہ وطن سے صرف ایک جغرافیائی علاقہ رکھتے ہیں لیکن آزاد نے حب وطن کی بڑی جاندار تشریح کی ہے۔ اس میں وطن کو ترقی دینے کے لئے سعی کرنے اور وقت پڑنے پر جان تک دینے سے گریز نہ کرنے کی تلقین ہے۔ شاید اس کی ذاتی وجہ یہ رہی ہو کہ محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے وابستہ ہونے کے جرم میں گولی کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ حالی اور آزاد دونوں سرکاری خطاب یافتہ، یعنی شمس العلماء تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں چنگاریاں بھی روشن ہیں۔ شاید حالی کے یہاں شدت اس لئے کم تھی کہ وہ سر سید سے مرعوب تھے اور ان کے زیر اثر تھے اور آزاد اس قربی اثر سے نسبتاً آزاد تھے۔

اس دور کے ادیبوں اور شاعروں میں جن لوگوں نے نمایاں حیثیت اختیار کی ان میں سے اکثر یا تو حکومت کے دامن سے برابر وابستہ تھے، جیسے اکبر الہ آبادی، مولوی محمد حسین آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی یا پھر شبلی نعمانی اور حالی کی طرح خطاب یافتگی کے باعث گویا نیم سرکاری تھے۔ حالی تو کچھ دنوں کے لئے ملازمت سرکاری کرتے بھی رہے لیکن شبلی نے یہ بھاری پتھر ایک بار چوم کر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں تلخی سب سے زیادہ ہے۔ اسلامی ممالک کے دورے کا بھی اس پر ضرور اثر پڑا تھا۔ وہ پہلے اُردو شاعر ہیں جنھوں نے برطانوی سامراج اور مغربی استعمار کے بین الاقوامی روپ کو دیکھا اور اُنکی مغربی سیاست کی ریشہ دوانیاں بخوبی واضح ہوگئی تھیں۔ ان کے جذبِ قومی کی تلخی و شدت اور حلقہ بگوشان شاہی سے ان کی نفرت محو حیرت کر دیتی ہے۔ شبلی ہی کی طرح اکبر بھی دلیر تھے اور ان کی دلیری اس لئے اور بھی قابل تذکرہ بن جاتی ہے کہ وہ سرکاری ملازم تھے۔ خود کہتے تھے کہ اگر "مدخولۂ گورنمنٹ" نہ ہوتے تو وہ "گاندھی کے گوپیوں" میں ہوتے۔ اسمٰعیل میرٹھی اور حالی جو ان میں سب سے نرم تھے، وہ بھی وطن کی محبت سے سرشار تھے۔ نسلی امتیازات کے خلاف انھوں نے بار بار احتجاج کیا۔ ہندوستان کی غلامی کا انگلستان کی

آزادی سے تقابل کیا، اور ایک ایسے زمانے کا تصور پیش کیا جب حالات زیادہ بہتر اور سازگار ہونگے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ضرورت کے باعث ملازمت تو ضرور اختیار کرتے تھے، لیکن ان کے ذہن کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غلام نہ ہوئے۔

سن ستاون کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ کر کے تاج برطانیہ کی براہِ راست حکومت قائم ہوئی تھی اور ملکۂ وکٹوریہ کے اس اعلان سے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ ہوگا برطانوی شہنشاہ کا ہندوستان کے بارے میں خیالات تبدیل بھی ہونے لگے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت کی جانب سے بھی تالیف قلوب کی پالیسی پر عملدرآمد ہورہا تھا اور رفتہ رفتہ اظہار خیال کی آزادی بھی مل رہی تھی۔ انگریزی اور اُردو میں شائع ہونے والے اخبارات کی وجہ سے آزاد خیالی کی نشو و نما ہو رہی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" کا اجرا منشی سجاد حسین نے کیا۔ یہ پہلا اخبار ہے جو اپنے وجود کی ابتدا سے انتہا تک تقریباً ستر برس تک قوم پرورانہ خیالات کی ترویج کرتا رہا اور حکومت کی نکتہ چینی میں پیش پیش رہا۔ اس اخبار کا اور اس کے ادیبوں اور شاعروں کا جن میں مرزا مچھو بیگ، سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر اور برج نرائن چکبست وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، تحریک وطن پروری کو آگے بڑھانے میں خاص کردار رہا ہے۔ قوم پروری اور حب وطن کے سلسلے میں صرف ایک اخبار میں اتنا شائع ہوا ہے کہ اگر اُسے یکجا کیا جائے تو اُس سے ایک جلد مرتب ہو سکتی ہے۔

غرض ہم سیاسی اعتبار سے جاگنے لگے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں پونے پانچ سو اخبارات شائع ہونے لگے تھے جن میں زیادہ تر علاقائی زبانوں میں تھے۔ کئی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی انجمنیں اور ادارے قائم ہوگئے تھے۔ قانونی احتساب کی گرفت ڈھیلی ہونے سے سیاسی اظہار خیال کے ایک ہندوستان گیر تنظیم کے قیام کے آثار نظر آنے لگے۔ اس میں ہیوم ایسے انگریزوں نے بھی مدد کی اور پہلی عظیم شکست کے بعد تحریک آزادی تشکیل ہونے لگی۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو ۱۲ بجے دن کے وقت گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس" ڈبلو، سی، بنرجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے بہتر نمائندے شریک ہوئے اُس وقت اس جماعت کا خاص مطالبہ یہ تھا کہ کاؤنسلوں کو صرف نامزد ممبروں تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ اس میں ہندوستانیوں کے منتخب نمائندوں کو بھی شریک کیا جائے اور فوج کے اخراجات کم کئے جائیں۔ یہ رزولیوشن ملک کی مختلف سیاسی اور سماجی انجمنوں کو بھیجے گئے۔ سبھی نے ان کی تائید کی اور اخبارات نے بھی جوش و خروش کے ساتھ چھاپا۔

شروع شروع میں کانگریس پر اعتدال پسندوں کا قبضہ تھا جو اصلاحات ہی کے دائرے میں سوچتے تھے۔" اودھ پنچ" کا گروہ تو اس کی حمایت کرتا ہی رہتا تھا لیکن اور بھی بہت سے مقامی اخبارات اور شاعر وادیب ایسے تھے جو اس اعتدال پسندانہ سیاست کے نقیب تھے۔ یہ مراعات کے طالب تھے یہ برطانیہ کی لائی ہوئی نئی زندگی سے متاثر اور اس کے مداح تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ایک آزادی پسند طبقہ بھی نشو و نما پا رہا تھا اور اس کو حکومت برطانیہ کے نمائندے محسوس کرنے لگے تھے۔ اس کے توڑ کے لئے انھوں نے سر آکلینڈ کالون، لفٹنٹ گورنر صوبہ جات شمالی مغربی (اتر پردیش) کے زمانے (۱۸۸۸ء) سے ہی یہ پروپاگنڈا شروع کردیا تھا کہ مسلمان کانگریس کے خلاف ہیں۔ سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد نے اس خیال کو کچھ تقویت ہی دی۔ سرسید تو صرف بالواسطہ اپنی اصلاحی اسکیموں کے باعث اس تصویر میں آگئے لیکن ڈپٹی نذیر احمد نے تو باقاعدہ کانگریس کی مخالفت کی لیکن جس نے ان دونوں کی آوازیں اپنی آواز کی گرمی اور تیزی سے دبا رکھی تھی وہ شبلی نعمانی تھے۔ شبلی نے اس مسلم لیگ کی بھی شدید مخالفت کی اور اس کی سرکار پرستی کا خوب خوب بھانڈا پھوڑا جو ۱۹۰۶ء میں وجود میں آئی۔ ۱۹۰۶ء تک آتے آتے ہندوستان کے لئے سیاسی اصلاحات کا سوال بیحد اہمیت اور شدت اختیار کرچکا تھا۔ ٹھیک اس وقت سرآغاخاں کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک سیاسی وفد تشکیل ہوا کہا جاتا ہے کہ یہ وفد حکومت کے ایما پر تیار ہوا تھا اور اس کی حیثیت آئینے کے پیچھے بیٹھ کر بولنے والے طوطی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی درخواست پر مسلمانوں کے لئے انتخاب جداگانہ منظور ہوا۔ اس انتخاب جداگانہ نے دونوں فرقوں کے درمیان ایک مستقل خلیج حائل کردی۔ اس علیحدگی پسندی کی قیادت مسلم لیگ کرتی رہی اور یہی مضرت رساں پالسی تھی جس نے ایک دن دو قومی نظریے کی بنیاد ڈالی۔ علیحدگی سے متعلق ہر تحریک کو سرکار برطانیہ کی حمایت حاصل ہوتی تھی۔ علیحدگی پسندوں کو سر پر چڑھایا جاتا تھا اور جو مسلمان قومی تحریک سے وابستہ تھے اُن کو طرح طرح کی ایذائیں دی جاتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کا ایک اہم طبقہ ہمیشہ سے کانگریس کے ساتھ رہا۔ اور کانگریس ایک مشترکہ سیاسی مورچہ بنی رہی۔

خود کانگریس کے اندر تیزی سے بنیادی تبدیلی ہو رہی تھی۔ اعتدال پسندانہ اصلاح پسندی سے اب تشفی نہیں ہو رہی تھی بلکہ ہندوستان کے ثقافتی نشاۃ ثانیہ کو انقلابی آزادی پسندی سے دلچسپی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک جوان ہمت وطن پروری اُس کی جگہ لے رہی تھی۔ نہ منٹو مارلے ریفارم ہم کو مطمئن کر پاتا تھا اور نہ مانٹ فورڈ رپورٹ۔ وہ معتدلین جو پارلیمانی طرز کی حکومت کے خواہاں تھے ان کے خلاف انتہاپسندوں کا ایک طبقہ بال گنگادھر تلک کی قیادت میں اُبھر رہا تھا آخرالذکر طبقے کے طرز فکر کو تقسیم بنگال کی مخالفت کی تحریک

سے بہت مدد ملی۔ بائیکاٹ اور سودیشی کی تحریکوں کے چل پڑنے سے یہ تحریک جو ابھی تک صرف متوسط اور اعلیٰ طبقوں تک محدود تھی، اب عوام کی سطح پر بھی آگئی۔ مکمل آزادی کا دھندلا سا خاکہ بھی اسی گروہ نے سامنے رکھا۔ "بال گنگا دھر تلک کے اس مشہور جملے کو کون بھول سکتا ہے کہ سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم اسے لے کر رہیں گے۔" تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) کی تحریک نے اتنی شدت اختیار کی کہ بہت سی خفیہ جماعتیں وجود میں آگئیں اور کئی دہشت انگیز ادارے شمالی ہند میں کام کرنے لگے۔ ان تمام حالات نے مل جل کر ایک خاصا گروہ انتہا پسند سیاست کے ماننے والوں کا پیدا کر دیا جو صرف پارلیمانی طرز حکومت کے لئے درخواستیں دئے جانے کی پالیسی کو بے سود ہی نہیں بلکہ مہلک بھی تصوّر کرنے لگے۔ حسرت موہانی کا اسی گروہ سے تعلق تھا۔ ان کی سیاسی نظمیں نسبتاً بہت کم ہیں لیکن جو ہیں اُن میں یہ انتہا پسندی صاف نمایاں ہے۔ اس دور کی غزلوں میں زنجیر و قفس، دار و رسن، وغیرہ علامتی الفاظ نے نئے سیاسی معنی اختیار کر لئے تھے اور ظلم و ستم برداشت کرنے کا ایک نیا جذبہ نظر آنے لگا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں انڈین کاؤنسلز ایکٹ اسی نئی لہر کو روکنے کے لئے پاس کیا گیا۔ اس کی رو سے اسمبلی کے ممبروں کی اکثریت نامزد ہونے کے بجائے منتخب ہونے لگی۔ ایک ہندوستانی وائسرائے کی کونسل میں اور دو سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل میں مقرر ہونے لگا۔ یہ تعداد ۱۹۱۰ء میں بڑھا کر تین کر دی گئی۔ لیکن اب تو مکمل "سلف گورنمنٹ" کی مانگ ہونے لگی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں دلّی دربار ہوا جس نے احساس غلامی کو تیز تر کر دیا۔ اکبرؔ ایسے ملازم سرکار کو بھی یہ محسوس ہوا کہ " آنکھیں میری باقی اُن کا۔" اسی سال تقسیم بنگالہ کو ختم کر دیا گیا۔ یہ دور وطنی نظموں کی بہتات کا ہے۔ "مخزن" اور "زمانہ" وغیرہ میں قومی نظمیں تسلسل سے شائع ہونے لگیں۔ ان نظموں میں محبّت وطن، وطن کے ماضی کی دل آویزی و حُسن آفرینی، قومی بیداری، وطن کے محبوب مناظر فطرت کا بیان اور سارے ماحول کی عکاسی نظموں کے محبوب موضوعات میں شامل ہو گئیں۔

اس دور کے شعرا میں چکبستؔ، سرورؔ جہان آبادی، برقؔ دہلوی، حسرتؔ موہانی، تلوک چند محرومؔ اور ظفر علی خاں نے نوجوانوں میں ایک نیا جذبۂ عمل بھر دیا تھا۔ اُدھر مہاتما گاندھی نے جنوبی افریقہ میں مقاومت مجہول کی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ اس تحریک کی ہمدردانہ صدائے بازگشت چکبستؔ کے یہاں بھی سننے کو ملتی ہیں اور ظفر علی خاں کے یہاں بھی۔ حسرتؔ موہانی اس دور کے بڑے شاعر تھے لیکن ان کا میلان طبع غزلیات ہی کی طرف تھا۔ جن لوگوں نے سیاسی شاعری کے پرچم کو بلند کیا اُن میں چکبستؔ اور مولانا ظفر علی خاں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قومی شاعری نے انھیں کے دم قدم سے فروغ پایا اور انھیں

شک نہیں کہ شعراء کی آئندہ نسلوں کے لیے ان کی آزادہ گفتاری قومی محرک ثابت ہوئی۔ ظفر علی خاں خصوصیت سے بہت زود گو اور پُرگو تھے۔ جوش و خروش کے ساتھ، طنز و حاضر جوابی، ولولہ انگیزی اور سلاست و روانی اُن کی نظموں کا خاصّہ تھا۔ اُن کا ہماری قومی شاعری میں خاص مقام ہے۔ چکبست کے یہاں علوم جدیدہ سے حاصل کی ہوئی روشنی اور سیاسی بصیرت اس پر مستزاد ہے۔ آزاد، شبلی، بنیز شکوہ آبادی کے بعد چکبست اور ظفر علی خاں دو اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے تفصیلی مطالعے کے بغیر ہماری قومی شاعری کا سمجھنا نا ممکن ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ظفر علی خاں اور حسرت موہانی نے جرم سیاست میں قید فرنگ بھی کاٹی۔

ایک اور ہستی ہے جس کی طبیعت کی رنگارنگی اور خیالات کی دورنگی افسانوی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ وہ ہیں علامہ اقبال۔ پہلی جنگ عظیم کے پہلے کے اقبال "ترانۂ ہندی"، "نیا شوالہ"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" وغیرہ کے اقبال ایک جاں نثار وطنیت کا پیغام لیکر سامنے آتے ہیں۔ ان میں کہیں مراعات سیاسی کا کا نام نہیں آتا بلکہ اپنے ماضی کی عظمت کا احساس، قومی وحدت کی حقیقت و اہمیت اور اپنی سیاسی اہلیت کا والہانہ اور عقیدت مندانہ اظہار ملتا ہے۔ اقبال کا "ترانۂ ہندی" تو خصوصیت سے اتنا مقبول ہوا کہ 'بندے ماترم' کے ساتھ ساتھ وہ بھی قومی ترانہ سا بن گیا تھا اور بہت سے جلسوں اور جلوسوں میں بڑے جوش و خروش سے پڑھا جاتا تھا۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی، جس میں ہندوستانیوں نے بڑی مالی اور جانی قربانیاں پیش کیں۔ خود مہاتما گاندھی نے اس جنگ میں تعاون کیا۔ جنگ کے ابتدائی دو برس تو ذرا سکون سے گذرے لیکن ۱۹۱۵ء میں مسز بیسنٹ کے "ہوم رول" کی ہوا چلی اور اس نے کافی زور پکڑا۔ اسی تحریک سے متاثر ہو کر چکبست نے نعرہ لگایا تھا۔ ؎

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

۱۹۱۶ء میں ہی ہندو مسلم اتحاد کو باضابطہ معاہدے کی شکل دے دی گئی اور اُدھر کانگریس کے معتدلوں اور قوم پروروں میں بھی اتحاد ہو گیا۔ اس اتحاد کی فضا میں احتجاجی تحریک تیز تر ہو گئی اور مسز بیسنٹ، ارنڈیل اور واڈیا وغیرہ کو نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن ایک طرف گرمی اور دوسری طرف نرمی، یہ برطانوی سیاست کا علامتی نشان ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ کا اعلان بھی ہوا اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت تادیبی کارروائیاں بھی جاری رہیں۔ پھر ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ پاس ہوا۔ ملک میں زبردست احتجاج کی لہر دوڑ گئی۔

گاندھی جی تحریک کی قیادت کو آگے بڑھے۔ خاتمہ جنگ کے بعد مسلمان بھی ٹرکی کے ساتھ جونا انصافی روا رکھی گئی تھی اُس سے بیحد نالاں تھے۔ اس زمانے میں گاندھی جی کی زیر قیادت جو مشترکہ تحریک چلی وہ اپنی جذباتی شدت کے اعتبار سے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں منفرد ہے۔ ۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کو ہماری تحریک آزادی کا وہ بیحد دردناک واقعہ پیش آیا جو جلیان والا باغ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں شقی القلب جنرل ڈائر نے کسی معقول سبب کے بغیر ہی بیس ہزار نفوس کے ایک پُرامن مجمع پر گولیاں چلوادیں جس میں چارسو سے زیادہ افراد جاں بحق تسلیم ہوئے اور زخمیوں کی تعداد تو دو ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ خود ڈائر نے کہا کہ اُس نے سولہ راؤنڈ گولیاں چلوائیں اور اگر گولیاں ختم نہ ہو گئی ہوتیں تو وہ اور گولیاں چلواتا ہی رہتا۔ یہ وہ واقعات تھے جنھوں نے محروم ایسے ملازم سرکار کو بھی متاثر کیا۔ علاّمہ اقبال کے چار مصرعے بھی اس موضوع پر دستیاب ہوئے ہیں اور وہ بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔ یہی زمانہ تحریک خلافت کی شدت کا بھی تھا۔ اتحاد کے ایسے جاں پرور نظارے اور عام سیاسی بیداری کی ایسی مثال پھر دوبارہ ہماری تاریخ میں دیکھنے کو نہ ملی۔ اسی زمانے میں ہماری دو اور عظیم الشان شخصیتیں سامنے آرہی تھیں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی۔ مولانا آزاد خود شاعر نہ تھے لیکن انھوں نے اپنے رسائل کی وساطت سے ہماری قومی شاعری کو بڑی تقویت پہنچائی اور اپنے مقالات نثر کے ذریعے تو ملک کے طول و عرض میں آگ ہی لگادی۔ مولانا محمد علی جوش و عمل کے پتلے تھے اور بیحد جذباتی تھے۔ انھوں نے ہماری تحریک میں ایک نئی جان ڈالی۔ جیسے جیسے تحریک بڑھتی گئی برطانوی جبر و تشدد میں بھی اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ عوام بھڑک اُٹھے اور چوری چورا کا واقعہ رونما ہوا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے تحریک ہی واپس لے لی۔ لیکن تحریک کی واپسی کے بعد بھی قید و بند، دُرّے لگانا، سڑکوں پر پیٹ کے بل چلوانا اور اس طرح کے دوسرے مظالم حکومت کی جانب سے ہوتے رہے۔ قید خانے محبّان وطن سے چھلکنے لگے تھے انھیں میں محمد علی جوہر بھی تھے۔ جب مولانا محمد علی جیل سے رہا ہو کر آئے تو اُن کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ اسی موقعے پر مولانا محمد علی نے یہ تاریخی فقرہ کہا تھا کہ "میں جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں"۔

عدم تعاون یا ترک موالات کی یہ پہلی تحریک ہماری تاریخ آزادی کا پہلا موڑ تھا۔ اس نے ہمتیں توڑیں نہیں بلکہ بندھائیں۔ اُمید کے ہزاروں دیے روشن ہو گئے۔ تشدد نے نئی جرأت پیدا کردی؛ وفا کے شوق میں، گاندھی اور محمد علی نے جو زنجیر و طوق پہنے تھے وہ بقول چکبست قومی گہنے بن گئے تھے۔ وفا و جفا کا مفہوم بدل گیا تھا۔ حسن و عشق کے معنی تبدیل ہو گئے۔ جنونِ شوق، عقل سیاسی کا آئینہ دار ہو گیا۔

غزل میں ایک نئی معاشی اور سیاسی معنویت پیدا ہوئی اور اس کا سہرا یقیناً حسرت، جوہر اور چکبست کے سر ہے۔ اب نوحۂ ماضی اور غم ایام رفتہ سے کہیں زیادہ حال کی ضیا باریوں اور مستقبل کی تابانیوں پر نگاہیں جمی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس دور میں انگریزی ترجموں، ہلکے پھلکے گیتوں اور نئے تجربوں کے دروازے بھی کھلنے لگے۔ ہم دوسرے ممالک کے ادب سے روشناس ہونے لگے اور خود اپنے ملک کی ادبی روایات کو اپنانے کی کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ ہم یہ دیکھیں گے کہ ہماری نظموں میں ہندی کے لفظوں کا استعمال بھی آزادانہ ہونے لگا تھا اور متحدہ قومیت کی نشو و نما کی نئی صورتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اقبال تک اس تحریک سے متاثر تھے۔ جبلی، جوش، رواں، ظریف، سیماب کی نغمہ سرائیاں بھی اسی زمانے میں شروع ہوتی ہیں۔

یہ دور بڑے تنوع کا دور ہے۔ قومیت کے سیاسی مفاہیم کے علاوہ ثقافتی اور سماجی پہلوؤں پر بھی شاعروں کی نظریں جانے لگی ہیں۔ وطن کی محبت، وطن کی عظمت رفتہ کا تصور، وطن کے مستقبل کے شاندار امکانات، غرض وطن کے ذرے ذرے سے وہ قلبی لگاؤ نظر آتا ہے جیسے ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے وطن کو پہلی مرتبہ غور سے اور قریب سے دیکھا ہو! دریا وہی تھے لیکن انھیں ان کی لہروں میں جوانی رواں نظر آنے لگی تھی۔ کھیت، کھلیان، جنگل، پہاڑ، چاند، تارے سب وہی تھے لیکن ان میں نئی زندگی کروٹیں لینے لگی تھی۔ تحریک ترک موالات کے سلسلے میں اسکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ بھی ہوا تھا۔ اس کے طفیل میں وطن پرست نوجوانوں کی ایک باعمل جماعت ملک بھر میں تیار ہوگئی تھی اور ایک منظم، ہندوستان گیر تحریک آزادی نے جڑیں پکڑ لی تھیں۔

کانگریس کے نرم اور گرم دلوں میں پھر کشمکش شروع ہوئی۔ سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں کانگریس کاؤنسلوں میں داخل ہو کر حکومت کے کاروبار میں رکاوٹ ڈالنا چاہتی تھی۔ گاندھی جی اور دوسرے قائدین اس کے خلاف تھے۔ سنہ ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں سوراج پارٹی (معتدل گروہ) نے کافی کامیابی حاصل کی لیکن کچھ ممبران منتخب ہو کر کاؤنسل میں آجانے کے بعد یہ بھول ہی گئے کہ ان کا مقصد حکومت کے کاموں میں روڑے اٹکانا تھا اور وہ لوگ تعاون کی سرحدوں میں داخل ہونے لگے۔ اس زمانے میں ڈومینین اسٹیٹس کا مطالبہ تیز تر ہونے لگا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں اجلاس بلگام میں مہاتما گاندھی نے مکمل آزادی کے مطالبے کو یہ کہہ کر ایک نئی زندگی بخشی کہ "میں سلطنت کے اندر رہ کر سوراج کی کوشش کروں گا لیکن اگر خود برطانیہ کی غلطی سے ضرورت آپڑی تو میں سلطنت برطانیہ سے تمام تعلقات منقطع کرلوں گا۔" یہ صرف الفاظ نہیں ہیں بلکہ ہماری تحریک آزادی میں ایک نئے باب کے آغاز کی حیثیت

رکھتے ہیں کیونکہ ان سے صاف ظاہر ہے کہ برطانیہ کے مواعید پر اعتبار ختم ہوتا جا رہا تھا اور مکمل آزادی کے آنے والے رزولیوشن کی نیو پڑ رہی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کی آمد سے کسی کو کوئی تسلی نہیں ہوئی بلکہ مخالفت کا ایک طوفان ہر طرف اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسی سال نہرو رپورٹ پر غور و خوض کے لئے جو آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی تھی اُس نے نوآبادیاتی خود مختاری کی مانگ کی۔ لیکن زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ نوجوان ہرگز مکمل آزادی سے کم کسی چیز پر صلح کرنے کو تیار نہیں تھے۔ کانگریس کے کلکتہ سیشن (۱۹۲۸ء) میں باپ نوآبادیاتی خود مختار حکومت کی وکالت کر رہا تھا اور بیٹا جواہرلال نہرو، اپنے دوسرے پُرجوش ساتھی سوبھاش چندر بوس کی معیت میں مکمل آزادی کی ترمیم پیش کر رہا تھا۔ اس چھوٹے سے واقعے سے اس امر پر بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ ایک ہی نسل میں قوم پروروں کا مزاج کس طرح بدل گیا تھا! نہرو نے اسی سال ۳۰ اگست کو لیگ آزادی ہند کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس قسم کی مکمل آزادی پسند جماعتیں ملک کے اور گوشوں میں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ آخرکار جنوری ۱۹۳۰ء میں کانگریس کے انتہا پسند، اعتدال پسندوں پر غالب آ گئے اور مکمل آزادی کانگریس کا سیاسی نصب العین قرار پا گئی۔ اب تاج برطانیہ کے زیر سایہ ایک خود مختار حکومت قائم کرنے کا تصور ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا اور مکمل سیاسی اور اقتصادی آزادی کا تصور جنم لے رہا تھا۔

اب آزادی اور مادر وطن کے لئے مصائب جھیلنے اور دار و رسن کے شدائد برداشت کرنے کا والہانہ جذبہ ہماری شاعری کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ اس دور میں فرقہ وارانہ جھگڑے بھی برابر ہوتے رہے لیکن ہمارے شاعر، نہ صرف یہ کہ اس زہریلے اثر سے پاک رہے بلکہ ہمیشہ اس کو جنون اور دیوانگی سے تعبیر کرتے رہے اور اس کو آزادی اور ترقی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ کر اتحاد و اتفاق کی تلقین سے کبھی باز نہیں آتے تھے۔ آزاد کے زمانے سے ہمارے شاعر اس کو اچھی طرح محسوس کرتے آ رہے تھے کہ اختلافات سے بڑا ہمارا اور کوئی دشمن نہیں ہے اور وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ اتفاق کی فضا کو درہم برہم کئے رہنے میں بیرونی عناصر کا کتنا ہاتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعصب کی آواز اُردو شاعری میں کبھی سنائی نہیں دی۔

جنگ عظیم کے بعد "پان اسلامزم" کے نقوش ہماری شاعری میں ضرور ملنے لگتے ہیں اور اسکے سب سے بڑے ترجمان ڈاکٹر اقبال تھے۔ اقبال کی یہ ترجمانی فرقہ پرستوں کے کام ضرور آئی لیکن ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے طرز فکر کو متاثر نہ کر سکی۔ جدید ہے کہ حفیظ جالندھری بھی اس لے میں گیت نہ گا سکے۔ بلکہ اقبال نے اُردو شاعری میں انقلاب روس کی پیغامبری زیادہ کی۔ انھوں نے ۱۹۱۷ء کے آس پاس انقلاب روس سے ایک

نئی کرن پھوٹتے ہوئے دیکھی اور یہ محسوس کیا کہ دنیا میں اب مزدوروں کا دور آگیا ہے۔ سوشلزم کا نعرہ اُردو میں
چور دروازے سے داخل ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے تحریک آزادی کا جزو بن کر کافی قوت و توانائی حاصل کرلی۔

یہاں اب جنگ آزادی کی تفاصیل میں جانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ ہماری لڑائی آئینی
محاذوں پر جاری رہی اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ نافرمانیوں اور سزاؤں کا سلسلہ لا متناہی بھی
چلتا رہا۔ لیکن ہمارے ارادوں میں مضبوطی ہی آتی گئی۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت
صوبوں میں محدود خود مختاری کے مل جانے سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات اسی قانون
کے ماتحت ہوئے اور اس میں چھ صوبوں میں کانگریس کی اکثریت ہوگئی۔ اس موقع پر پھر اعتدال پسندوں
اور انتہا پسندوں میں یہ رسہ کشی شروع ہوئی کہ اسمبلیوں میں داخل ہو کر قانون کی شکست کا سامان بہم
پہنچایا جائے یا اسمبلیوں کا بالکل ہی مقاطعہ کیا جائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو انتہا پسندوں کی قیادت
کر رہے تھے۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ جب تک مکمل آزادی کا نہ ہوگی، سماج ترقی و بہبود کی اسکیموں کا آگے بڑھانا
نا ممکن ہوگا لیکن مارچ ۱۹۳۷ء میں اعتدال پسندوں نے حکومت برطانیہ سے اس بات کا قول و قرار چاہا کہ
گورنر اپنے اختیارات خصوصی کو استعمال نہیں کریں گے۔ تھوڑے سے لیت و لعل کے بعد حکومت برطانیہ
نے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس کے بعد سات صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوگئیں۔

وزارتوں کے قیام سے ایک طرف تو زبان و بیان پر پابندیاں اُٹھادی گئیں اور دوسری طرف
ترقی پسند اقتصادی و معاشرتی تبدیلیوں کے لئے راستہ ہموار کیا جانے لگا۔ اس دور میں زرعی اصلاحات
پر زور دیا جانے لگا اور مزدوروں کی طاقت بھی منظم ہونے لگی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، سمپورنانند،
اشوک مہتا، سوبھاش چندر بوس، پی، سی، جوشی، اجے گھوش، سوہن سنگھ جوشی، ایم، این رائے،
سومیندر ٹیگور وغیرہ کی قیادت میں مختلف سوشلسٹ اور ترقی پسند جماعتیں سامنے آئیں۔ بیسویں صدی
کی تیسری دہائی میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کی مخالفت میں ہمارے ادب میں کافی لکھا گیا۔ لیکن اسکے
کچھ پہلے ہی سے کچھ لوگ "شکست زنداں" کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان میں جوش، فراق، ساغر،
جمیل مظہری، روش، احسان دانش، سیماب، آنند نرائن ملا وغیرہ خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ۱۹۳۵ء کے
آس پاس انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کو بھی جواہر لال نہرو، جے پرکاش نرائن،
اختر رائے پوری، یوسف مہر علی، اچاریہ نریندر دیو، سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم جیسے مارکسسٹ دستوں نے آگے
بڑھایا۔ لیکن شاعروں میں ایک نیا اور بڑا گروہ اُبھرا۔ جن میں مجاز، مخدوم، جذبی، جعفری، زیدی، شمیم

سلام مچھلی شہری، جاں نثار اختر، فیض، راشد، میراجی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ادبی اعتبار سے ایسا کوئی اور دور نظر نہیں آتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ چاروں طرف تخیلی قوتیں اُبل رہی تھیں۔

اب آزادی کے تصور کے ساتھ سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی ترقی کے تصورات بھی وابستہ ہوگئے۔ دولت کی نابرابر تقسیم کے خلاف احتجاج، سرمایہ داری کی مخالفت، مساوی امکانات و مواقع کے لئے جد وجہد کا آلۂ کار ادب کو بنایا گیا۔ قدامت پرستی، توہم پرستی، تعصب، مذہبی اختلافات، رنگ و نسل و ذات وغیرہ کے خلاف باقاعدہ ادبی مورچہ قائم ہوا۔ اب جنگ کسی ملک کے خلاف نہیں رہ گئی بلکہ ایک نظام کے خلاف ہوگئی۔ اس کو مہاتما گاندھی کی "اہنسا" سے بھی سہارا ملا کیونکہ مہاتما گاندھی نے بھی بار بار کہا کہ جنگ برطانوی عوام سے نہیں ہے بلکہ غلام بنانے والے نظام سے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب میں نعرہ بازی کم ہونے لگی اور اسباب و حالات کا اقتصادی جائزہ اور اُس کے طبقاتی محرکات پر توجہ زیادہ مبذول ہونے لگی۔ تخریب سے ایک رومانی دلچسپی اسی دور میں پیدا ہوئی اور تعمیر کا حقیقی اور عملی حوصلہ بھی اسی زمانے میں نظر آیا۔ بقول آل احمد سرور، اس دور کی شاعری نے

"ہمیں اپنی موجودہ قانع، سست رو تماشائی کی زندگی سے بیزاری سکھائی ہے۔ اُس نے اُس قحط سالی کا عکس پیش کیا ہے جو عشق کو بھی بھلا دے۔ اُس نے ادب میں عوام اور جمہور کے دل کی دھڑکن پیدا کی ہے۔ ..... اُس نے سیکڑوں زبانوں کو بولنا سکھایا ہے ..... مگر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس تحریک کے بعض علم برداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے۔ یہ زندگی کو مارکسی فارمولوں اور اقتصادی اُصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے ..... یہ ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں انسان کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔"

یہاں کوئی نظریاتی بحث اُٹھانا مقصود نہیں ہے۔ اس اقتباس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ جہاں ایک طرف ہزاروں نئے دروازے کھلے وہاں ایک نئی طرح کی ادبی تنگ نظری بھی آنے لگی۔ مبلغ نقیب اور نعرہ لگانے والے بہت سے آگئے لیکن پروپاگنڈے اور نظریاتی ادب کے باریک فرق کو سمجھنے والے کم ملے۔ پھر بھی اس تحریک نے ہمیں بہت کچھ دیا اور اس کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے ہمارے ادیبوں کو ہم آواز ہوکر فرقہ پرستی کی مخالفت کرنا سکھایا۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہی زمانہ مسلم لیگ کی حیات ثانیہ کا ہے لیکن اُردو کا ایک بھی اچھا شاعر مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کا حامی نہ بن سکا۔ چنانچہ پاکستانی ادیب، محمد حسن عسکری نے اپنی تصنیف "انسان اور آدمی" کے ایک باب "ہمارا ادبی شعور اور مسلمان"

میں لکھتے ہیں کہ :۔

" نئے ادیبوں کی غالب اکثریت کو مسلمانوں کے سیاسی عزائم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہت سے ادیب تو مسلم لیگ کی سیاست کے سخت مخالف تھے اور بہت سے ادیب بالکل بے تعلق و بے نیاز تھے۔ اسی طرح یا تو ادیب پاکستان کے مطالبے کے خلاف تھے یا پھر گومگو کے عالم میں تھے اور سمجھتے تھے کہ پاکستان بن جائے تو ہمیں کیا اور نہ بنے تو ہمیں کیا۔ مذہب اور سیاست کا تعلق انھیں پسند تھا ہی نہیں۔ جن لوگوں کو اشتراکیت سے نظریاتی دلچسپی نہیں تھی اُن کا بھی یہی خیال تھا کہ سیاسی گتھیوں کا معاشی حل دوسرے سب حلوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ پھر یورپ کو تعریف کی نظروں سے دیکھنے کے طوگ ایسے عادی ہوچکے تھے کہ جو بات یورپ والوں کی عقل میں بھی نہیں آ سکتی تھی وہ ہمارے ادیبوں کی عقل میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی میں کسی جماعت کا مذہبی اختلاف کی بنا پر حقوق مانگنا انھیں بالکل ہی ناقابل قبول معلوم ہوتا تھا۔"

یہ ایک پاکستانی کا بیان ہے جو پاکستان اور دو قومی نظریے کا حمایتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس کی خواہش یہی ہے کہ یوں نہ ہوتا تو اچھا ہوتا اسی لئے اس کو وہ یورپ کی کورانہ تقلید سمجھتا ہے اور جن لوگوں نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے اُن کے بارے میں اُس کا یہ خیال ہے کہ وہ گومگو کے عالم میں تھے۔ اس تجزیہ کا کوئی جواز نہیں ہے اور منطقی قلابازی کا نتیجہ ہے لیکن اس حقیقت کو کسی قدر تکلیف کے ساتھ اُسے تسلیم ہی کرنا پڑا کہ ہمارے ادیب مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ تلقین و تبلیغ سے بالکل ہی متاثر نہیں ہوئے۔ اس دور کی ترقی پسند شاعری کا یہ ایک کارنامہ بہت بڑا ہے۔ ایسے طوفان میں جب بڑے بڑے سیاست دانوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے ہمارے شاعر پامردی و استقلال کے ساتھ وحدتِ قومی کا علم فضاؤں میں بلند کئے رہے۔

۱۹۴۲ء میں ہماری قومی تحریک اپنے سب سے اہم موڑ پر پہنچی اور ہماری تاریخ آزادی کا سب سے اہم اندولن شروع ہوا۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا اور آخری اندولن تھا جس نے سامراج کی چولیں ہلا دیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روس دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ اور امریکہ کا حلیف بن چکا تھا اور یہاں کے اکثر ترقی پسند ادیب "عوامی جنگ" کا نعرہ لگا کر اتحادیوں سے اتنے قریب آ گئے تھے کہ وہ ہماری قومی تحریک سے فطری طور پر دور ہو گئے لیکن اس زمانے میں بھی فریدی و شمیم وغیرہ اس تحریک آزادی کے گیت گاتے رہے۔ سن بیالیس کے اندولن کے زمانے میں جو نظمیں لکھی گئیں ان سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ہمارے شعراء تخریب کو بھی نہیں سمجھتے تھے بلکہ تعمیر کے لئے

ایک لازمی برائی کے طور پر فتوائے جواز دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہماری سچی انقلابی اور ترقی پسند شاعری وہی تھی جو دار و رسن کے بیابانوں اور خاک و خون کے طوفانوں کے ماورا بھی دیکھ سکتی تھی اور آنیوالی بہاروں پر نظر جمائے تھی۔

اس طرح عہد بعہد قومی تحریکوں کا ساتھ دیتے ہوئے ہم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی منزل پر پہنچ گئے۔ کاروان ایک صدی تک جنگ کرنے کا عادی ہو گیا تھا لیکن جب اس کی تاریخ میں خوشی کی سب سے اہم گھڑی آئی تو اُس نے عیش و عشرت کے ترانے بھی جی کھول کر گائے۔ مگر اس کو بھی محسوس کرتے رہے کہ " یہ انتہا نہیں آغاز کار مرداں ہے"۔ ایک طبقے نے جس کی راہ سن بیالیس کے اندولن کے بعد سے کچھ بدل سی گئی تھی اسی موقع پر مستقبل کے بارے میں شبہات کا اظہار شروع کیا۔ لیکن اس بار بھی اُس کی آواز قومی فتح و ظفر کے غلغلوں میں دب گئی۔ اور اس لئے یہ منفیانہ شاعری بھی جلد ختم ہو گئی۔

مہاتما گاندھی کی شہادت نے اُردو کے شاعروں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ جس مقصد کے لئے اور جس دلیری کے ساتھ انھوں نے جان دی تھی، اُس کے باعث ہر شاعر کے دل پر اس واقعے نے زبردست چوٹ لگائی۔ مہاتما گاندھی پر جتنی اچھی نظمیں اُردو میں لکھی گئی ہیں شاید ہی کسی اور زبان میں مل سکیں گی۔

جو لوگ آزادی کے وقت شک و شبہ میں مبتلا ہو گئے تھے اُن کے یہاں نظریے کا واضح تصوّر صاف موجود نہیں تھا۔ آزادی کا مقصد یہی تو تھا کہ بیرونی اقتدار ختم ہو۔ وہ ختم ہو گیا لیکن اس کا یہ مقصد کب تھا کہ آزادی ملتے ہی ہندوستان کے زمین و آسمان بدل جائیں گے۔ آزادی نے ہمیں کام کرنے اور آگے بڑھنے کا ایک موقع عطا کیا تھا، اس موقعے کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھنا ہی ہمارے ادیبوں کا سب سے بڑا کام تھا۔ سامراج کے آہنی پنجوں سے ضرور نجات مل گئی تھی لیکن ابھی اقتصادی آزادی کی جنگ باقی تھی۔ اب بھی دنیا کے کئی عناصر ترقی اور امن کے راستوں میں کانٹے بو رہے تھے۔ ان سے بچ بچ کے چلنا تھا اور آگے بڑھتے جانا تھا۔ ہمارے سامنے تعمیر کے اہم منصوبے تھے۔ انھیں کی کامیابی پر ہماری آئندہ زندگی اور ہماری نئی حاصل کی ہوئی آزادی کے استحکام کا انحصار تھا۔ ابتدائی تشکیک کے بعد اب ایک تنومند رجائیت اور جذبۂ تعمیر کا ظہور ہو رہا ہے اور تعمیری ادب کی تشکیل میں شمیم کرہانی، اعجاز صدیقی، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، کمال احمد صدیقی اور راہی معصوم رضا سبھی مشغول ہیں۔

ہمارے قومی محسوسات کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے ہماری شاعری نے گذشتہ ایک صدی میں جو نمایاں خدمتیں انجام دی ہیں اُن پر جب بھی نظر پڑتی ہے تو ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ ع

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اُردو میں

قومی شاعری

کے

سَو سال

سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک

داستانِ انتزاعِ سلطنت*

بس اب ترک تمہید کر دے جواں ـ سُنا ابتدا سے تو یہ داستاں

یہ واجد علی ابن امجد علی ـ سُناتا ہے اب داستاں رنج کی

کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے ـ جو طالع تھے بیدار سونے لگے

ہوا حکم جنرل گورنر یہ یار ـ کرو سلطنت کو خلا ایک بار

جو تھے ملک میں بیٹھتے سہ کروڑ ـ اسی کی تھی یہ بادشاہی بہ زور

جفاکش کا شاہِ اودھ نام ہے ـ حکومت کا آخر یہ انجام ہے

جو وہ لاٹ ڈلہوزی اس وقت تھے ـ مضامیں انھوں نے یہ خط میں لکھے

"رعایا بہت تم سے ناراض ہے ـ تمہاری ریاست ہے بدنام شے"

"رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ ـ فقط نام کے تم رہو بادشاہ"

"مہینہ ہر اک ماہ اک لاکھ کا ـ ملے گا تمہیں کچھ نہیں شک ذرا"

ریزیڈنٹ جنرل اوٹرم جو تھے ـ گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے

ہوا گھر میں کہرام سن کر یہ بات ـ وہ دن دوپہر ہو گئی ساری رات

وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج ـ کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج

---

* مثنوی حزنِ اختر جس کا یہ ٹکڑا ہے اگرچہ واجد علی شاہ نے ۱۸۵۶ء میں بحالت قیدِ فرنگ کہی تھی لیکن واجد علی شاہ کی معزولی اور اودھ کی سلطنت پر البسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط انگریزوں کی کوشش ملک گیری کے سلسلے کی ایک کڑی تھا جس کے خلاف محبانِ وطن نے ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی چھیڑی تھی اس لئے اُسے بھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وطن دوست عوام واجد علی شاہ کی معزولی سے بیحد برافروختہ تھے اور اس پر کسی طرح تیار نہ تھے۔ یہ انھیں کی شدید ناراضگی تھی جس نے ۱۸۵۷ء میں حکومت برطانیہ کے خلاف کھلی بغاوت کی شکل اختیار کی۔

یہ بندہ بہت اُن دنوں تھا علیل | کہا دل نے کیا سوچوں اس کی سبیل
علیؔ نقی خاں تھے مرے وزیر | وہی میرے ہر حال میں تھے مشیر
مرے دل میں آتا تھا ہردم خیال | جو ہونا تھا وہ ہو چکا کیا ملال
کروں مُہر تم راضی نامہ پہ اب | گئی سلطنت تو گئی بے سبب
مگر سارے گھر نے نہ چھوڑا مجھے | دبایا، ڈرایا، جھنجھوڑا مجھے
رعایا یہ سب کہتی تھی "واہ واہ | کیا ہم کو اسی بادشاہ نے تباہ
یہ جائے جو فریاد کو خوب ہے | یہ ناحق جو راضی ہو معیوب ہے"
علیؔ نقی خاں کو دہلا دیا | کہ سب آبِ طعنہ میں نہلا دیا
خصوصاً مرا حال تھا یہ کیا | کہ پہرا ہر اک سمت پہ تھا کھڑا
جو آجائے کوئی نہ یہ تھی مجال | سبھی زندگی ہو گئی تھی وبال
کہ اب میراں جی کا مہینہ رستم | کہ جس میں ہوا حکم تھا یہ علم
دلا بست و ہفتم تھی اس ماہ کی | چھٹی سلطنت جس میں مجھ شاہ کی
اِکھتر تھے سن بارہ سو پر زیاد | تو میری زباں سے رکھو اب اس کو یاد
وہ دن پنجشنبہ کا تھا اے عزیز | نہ باقی رہی کچھ ریاست کی چیز
کہا دل نے آخر کروں کیا سبیل | طبیعت کا یہ حال ہے ہوں علیل
سبھوں کی بس آخر یہ ٹھہری صلاح | کرو چل کے فریاد ہے یہ فلاح
بلا کر عزیزوں کو میں نے کہا | کہ رخصت میں ہوتا ہوں حافظ خدا
رعایا سے اور تھے جو میرے عزیز | ہر اک سے کہا میں نے اے باتمیز
رہے جب تلک میرے سایہ میں سب | کرم سے کیا پرورش روز و شب
جو کچھ رنج پہنچا ہو ظاہر کرو | دلِ خستہ شہ کو باہر کرو
سبھوں نے دئے راضی نامے مجھے | کہ آخر کے تھے سب کے یہ حوصلے

حُزنِ اختر ۞

رجب کی ہوئی پانچویں جبکہ یار — شب پنجشنبہ ہوئی آشکار

کیا بندے نے لکھنؤ سے سفر — لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ماحضر

رجب بھر رہے کانپور میں مقیم — برنڈن کے بنگلے میں با خوف و بیم

دکھائی دیا ماہ شعباں کا جب — روانہ ہوئے واں سے با صد تعب

الہ آباد جو ہے ایک نام — رہے آٹھ دن اس میں اے خوش خرام

بنارس میں آکر رہے چودہ روز — وہ راجہ کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز

بہت پیش آیا اطاعت کے ساتھ — اُتارا مجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ

وہ مصروفِ خاطر ہوا اس قدر — فرشتہ بنا کہنے کو تھا بشر

وہاں پر دخانی کیا اک جہاز — چڑھے اس پہ جس دم ہوئے سرفراز

رہے اس پہ ہم بیس[۲۰] انیس[۱۹] دن — وہ جا شو تھے اس پر کہ جس طرح جن

دکھائی دیا جب کہ ماہِ صیام — تو کلکتہ میں آئے اے نیک نام

جو گئے، تو تاریخ تھی ساتویں — کہ داخل ہوئے ہم ملول و حزیں

ہر اک جا ہماری سلامی ہوئی — جو توپیں چلیں نیک نامی ہوئی

○

برس گزرا ہم کو جو اے خوش سیر — یکایک جہاں میں اڑی یہ خبر

کہ بلوائی کچھ جمع ہونے لگے — وہ لکھا مقدر کا دھونے لگے

۞ مثنوی حزنِ اختر جو واجد علی شاہ نے بزمانہ قید تصنیف کی تھی اس سے حسب ضرورت انتخاب کیا گیا۔

ہوئی خوب برگشتہ انگریزی فوج　　اُمنڈتی ہے جس طرح دریا کی موج
سبب اس کا ہم نے تو تھا یہ سُنا　　کہ کچھ کارتوسوں پہ قصہ ہوا
وہ تھے گاؤ کے چرم کے کارتوس　　اسی پر ہوئی تھی یہ بانگِ خروس
کہوں کیا میں ان روزوں تھا جو علیل　　شفا کی نکلتی نہ تھی کچھ سبیل
غرض بعد تبرید پائی شفا　　نہ طاقت ابھی آئی تھی اے مہ لقا
ہوئیں نذر کی گھر میں تیاریاں　　لگی کھلنے خلعت کی گل کاریاں
ہوا ہر طرف ناچ گانا شروع　　درخت خوشی کے جمے سب فروع
وہ جلسہ رہا دھوم سے ثلث شب　　گھڑی چار باقی رہی رات جب
تو سو سو رہے جا کے سب گلبدن　　گیا خواب میں وہ چمن کا چمن
میں سوتا تھا غفلت کا جاگا ہوا　　مقدر اُدھر مجھ سے بھاگا ہوا
یکایک یہ غل کان میں آ گیا　　غضب ہو گیا ہے ستم چھا گیا

○

ارے دوڑو للہ لوگو چلو　　اٹھاؤ اٹھاؤ اٹھاؤ اُٹھو
اٹھا خواب سے سن کے آواز میں　　ٹھٹھک رہ گیا دیکھ انداز میں
جو دیکھا تو لہری ہے انگریزی فوج　　چلی آتی ہے جیسے دریا کی موج
کوئی کہتا ہے اب اڑا دیں گے یہ　　کہ سب موچی کھولا[۵] گرا دیں گے یہ
کوئی کہتا ہے اے خدائے جہاں　　مری آبرو اب تو رکھ الاماں
کہا میں نے کیا شور و غوغا یہ ہے　　یہ کون آیا ہے کیسا چرچا یہ ہے
کوئی بولا کیا کہیے اے بادشاہ　　علی نقی خاں ہوئے قید آہ
سکرتر جو تھے لاٹ کے پیشکار　　وہ کہنے لگے مجھ سے اے شہریار
کہ چلیے میرے ساتھ یہ حکم ہے　　نہ کیجے سوا اس کے اب کوئی شے
کہا میں نے کیا وجہ فرمائیے　　قصور آپ بندے کا بتلائیے
کہا حکم سرکار سے یہ ہوا　　کہ کچھ شبہ سرکار کو آ گیا

---

۵ موچی کھولا یعنی مٹیا برج (کلکتہ) جہاں لکھنؤ سے آنے کے بعد واجد علی شاہ مقیم ہوئے۔

جو تھا اڈمنسٹن سکرتر کا نام ‏ — میں کرنے لگا ان سے بڑھ کر کلام
کہ میرا تو ہرگز نہیں ہے قصور — میں جھگڑوں سے رہتا ہوں خود دور دور
مفصل تو بتلائیے اس کا حال — مجھے رنج ہے اس سخن سے کمال
کہ مجھ سے الٰہی ہوئی کیا خطا — ہوئے لاٹ صاحب جو مجھ پر خفا
انھوں نے کہا اتنا معلوم ہے — کہ غیروں کی شرکت کی کچھ دھوم ہے
میں کھانے لگا اُن سے قسمیں شدید — کہ یہ افترا وہم سے ہے بعید
دوم یہ طبیعت بہت ہے علیل — سوائے خدا کون ہے اب کفیل
مرے گھر یہ ہو انتظامِ حضور — نہیں کیجئے مرا ثابت قصور
نہ مانا انھوں نے یہ میرا پیام — کہا کچھ نہیں ہے دلائل سے کام
چلیں گے جو ہمراہ فرمائیے — جنھیں ساتھ لینا ہو بتلائیے
وہاں جمع تھے میرے سارے رفیق — کہا میں نے ہیں یہ ہمارے رفیق
چلیں گے یہ سب ساتھ لکھ لیجئے نام — وہ کرنے لگے اس طرح سے کلام
سوا آٹھ لوگوں کے ہووے نہ اور — انھیں ناموں میں کیجئے آپ غور
مجاہد کو دولہ سے کیجے بہم — تو ہو نام اس خوش لقب کا رقم
پُھپا ہیں یہ میرے عجب ذی کرم — وہ آکر ہوئے مجھ سے اس دم بہم
دیانت سے دولہ جو آکر ملے — قلم نام خوش اس جواں کا لکھے
جواں تھا وہ بے مثل زنگی نژاد — وہ گاڑی کے پیچھے چڑھا خوش نہاد
سکرتر، پُھپا، میں وہ زنگی جواں — ہوئے ایک گاڑی میں جلوہ کناں
قلی؎ وہ جو دروازہ قلعہ تھا — اتارا وہاں مجھکو با صد بکا
میں اترا وہاں زرد و غم کے قریں — ملول و مفکر الم میں حزیں
جو کلکتہ کے قلعہ میں میں رہا — تو ان لوگوں نے ساتھ میرا دیا

؎ فورٹ ولیم کا ایک پھاٹک قلی دروازہ کہلاتا تھا آٹھ دن یہ قیدی اس کے بالاخانہ پر رہے اور اس کے بعد قلعہ کے اندر ایک کوٹھی میں بادشاہ اور ان کے ہمراہیوں کو جگہ دی گئی۔

رہے جب قلی باب میں آٹھ روز — ہوئی آتشِ رنج و غم سینہ سوز
جو کوٹھی ہے اک قلعہ کے بیچ میں — یہ تجویز ٹھہری وہاں پر رہیں
غرض ہم کو لائے اٹھا کر یہاں — فلک الاماں الاماں الاماں
کوئی آنکھ ہم سے ملاتا نہیں — پرِ جانور تک بھی آتا نہیں
ہوئے بند در قید خانے کے جب — لکھوں کیا جو گزرا ستم اور غضب
کلیجہ مرا منہ کو آ گیا — رکا دم جو سینہ میں گھبرا گیا
زن و مرد ٹیبن میں تھے میرے ساتھ — انھیں لائے کوٹھی میں سب بانھوں ہاتھ
پُچھا میرے نواب والا حشم — نہایت ہیں محسن بڑے ذی کرم
یہ کہتے تھے وہ ہاتھ میں لیکے تیغ — نہیں تم سے جان اپنی مجھ کو دریغ
اگر حکم ہو لالہ گوں رنگ ہو — کہا میں نے موقوف یہ ڈھنگ ہو
میں ہوں بے گنہ میری تربت لیے — مصیبت پڑے پر بھی طاعت لیے

○

کوئی رنج زنداں میں ایسا نہیں — جو اس بے سروپا کو پہنچا نہیں
مگر دردِ فرقت ہے سب سے سوا — ہر اک غم دیا ہے اسی نے بھلا
یہ گرداب فرقت ہے زنداں نہیں — یہ وہ بحر ہے جس کا پایاں نہیں
یہ وہ غم ہے جس سے نہیں بچتی جاں — اسی غم سے بوڑھے ہوئے ہیں جواں
اسی غم نے پانی سا دل کر دیا — اسی غم نے کوہِ الم دھر دیا
مرا غنچۂ دل ہوا غم سے بند — چمن بن گیا داغوں سے بند بند
دلِ زار ہرگز سنبھلتا نہیں — وہ کوہِ گراں ہے کہ ٹلتا نہیں
ہر اک سمت پہرا ہر اک سمت یاس — رفیق و ملازم میں خوف و ہراس
کبھی سر پہ رکھتا تھا میں کج کلاہ — اودھ کا کبھی میں بھی تھا بادشاہ
ملازم مرے تھے کبھی سو ہزار — مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
ہوئے قید اس طرح ہم بے گناہ — اسیروں میں ہوں نام ہے بادشاہ
زن و مرد اٹھارہ اور اک بیجاں — شب و روز زنداں میں ہیں دل طپاں

ہر اک اپنے جینے سے بیزار ہے — ہر اک قیدِ غم میں گرفتار ہے
بھشتی جو آتا ہے اور خاکروب — وہ پہرے کی شدت سے ہے سینہ کوب
جو جاروب دیتا ہے وہ سینہ سوز — تو گورا بھی ہمراہ آتا ہے روز
بھشتی کا یہ حال تحریر ہے — وہ جس طرح ہے نقشِ تصویر ہے
کبھی روشنی والا لائے جو تیل — تو دیتا ہے گورا اسے بھی ڈھکیل
اور اک سر برٹ صاحبِ خوش بیاں — سحر شام ہوتے ہیں جلوہ کناں
وہ مجبر ہیں کرنیل کے پیش دست — وہ کرتے ہیں زنداں کا خود بندوبست
وہ گنتے ہیں خود آکے شام و سحر — جو بیمار ہو لیتے ہیں وہ خبر
ہے اک اور داروغہ زنداں کا — کہ کالن ہے نام اس نگہباں کا
وہ تکلیف ہے جس سے دل تنگ ہو — شب و روز زنداں کا بد رنگ ہو
زبس ہے یہ کوٹھی[ے] نہایت کلاں — مگر میرے کس کام کی اے جواں
ہر اک اس کا در بند ہے آہ آہ — وہ گرمی وہ گرمی کہ دل ہے تباہ
کھلے ہیں جو در تو ادھر دھوپ ہے — یہ ہے رنگ کوٹھی کا یہ روپ ہے
اس اوسط کے درجہ میں دل تنگ ہیں ہم — نہ اوپر نہ نیچے معلق ہیں ہم
کئی خط کئے لاٹ کو بھی رقم — ہوئے سرفراز ایک کر بھی نہ ہم
کسی خط کا لکھا نہ ہم کو جواب — خدا جانے کس امر پر ہے عتاب

○

یہ ناکارہ اختر کی ہے التجا — نہ رد کرنا تو اس کو اے کبریا
کہ یہ بے گنہ قید میں ہے تباہ — شب و روز زنداں میں کرتا ہے آہ
نہ کوئی خطا ہے نہ کوئی قصور — نہ خاطیِ غلماں نہ ہے دزدِ حور
نہ خونی، نہ رہزن، نہ ٹھگ ہے نہ چور — کیا ہے نہ گا ہے غریبوں پہ زور
گرہ بُر نہیں ہیں اُچکا نہیں — نہ لے بھاگا تھا میں کوئی نازنیں

ے فورٹ ولیم کی وہ کوٹھی جس میں واجد علی شاہ اور ان کے ہمراہی قلی دروازہ کے بالائی حصہ میں آٹھ روز قیام کے بعد منتقل کئے گئے۔

شرابی نہیں ہوں جواری نہیں — کسی مال کی راہ ماری نہیں

کسی کو نہیں مجھ پہ دعویٰ کوئی — کہے گا مرے سامنے کیا کوئی

تو ہی جانتا ہے تو ہی ہے علیم — جو میں ہوں سزاوارِ نارِ جحیم

جلائے اگر تو تو تن پاک ہو — جو ہوں خاک تو کیمیا خاک ہو

نظر رحم کی چاہئے کردگار — یہ بخشائے برمن پئے جانِ زار

دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں میں — درِ اشک رو کر بہاتا ہوں میں

مری آبرو رکھ خدا اے کریم — بہت اپنے بندوں پہ ہے تو رحیم

الٰہی رہیں شاد یارانِ ہند — پھر آباد ہو دیں جوانانِ ہند

رہائی تری ہو تو ہے بے گناہ — یہ در گذرا اس سے نہیں بادشاہ

عوض بادشاہی کا گر جان ہے — تو بندہ بھی خائف ہر اک آن ہے

فقط نامِ شاہی سے ہوں میں خراب — کہاں میں کہاں قید کیا عذاب

اٹھاتا ہوں قرآں نہیں ہے یقیں — کروں کس سے فریاد میں دل حزیں

دلِ زار ہونٹوں پہ آ آ گیا — میں گھبرا گیا سخت گھبرا گیا

الٰہی مجھے قید سے دے نجات — نکلتی نہیں غم سے اب منہ سے بات

بس اب الحذر الحذر اے خدا
کر اس اختر زار کو تو رہا

قیدِ فرنگ

بالعکس ہیں زمانے میں جتنے ہیں کاروبار　　شیوہ کیا ہے اُلٹا زمانے نے اختیار
ہے موسمِ بہار خزاں اور خزاں بہار　　آئی نظر عجب روشِ باغِ روزگار

جو نخل پُر ثمر ہیں اُٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

بادِ صبا اُڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک　　ملتے ہیں سر بہ سر کفِ افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک　　کرتی ہیں بلبلیں یہی فریادِ دردناک

شاداب حیف خار ہوں گُل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخل مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں　　ہو وے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں　　چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں

یہ گنبدِ فلک ہے عجب طرح کا قفس طاقت نہیں ہے نالہ کی بھی جس میں اک نفس
جنبش ہو ایک پر کی تو پر ٹوٹ جائیں دس رہ جائے دل کی دل میں نہ کس طرح سے ہوس

کیا طائرِ اسیر دہ پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ آواز کر سکے

کیا کیا جہان میں ہوئے شاہانِ ذی کرم کس کس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم دارا کہاں، کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم

کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفرؔ رہے تو نکوئی یہاں رہے

بیانِ درد

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہو کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے، کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
ولے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی اُن کے دل میں بخار ہے

نہ تھا شہر دہلی، یہ تھا اک چمن، کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

یہی تنگ حال جو سب کا ہے، یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی، جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے

شب و روز پھول میں جو تُلے، کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب اُنھیں، کہا گُل کے بدلے یہ ہار ہے

؎ بعض حضرات اسے حسامی کی غزل بتلاتے ہیں لیکن نیشنل آرکائیوز کے کاغذات سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ غزل حقیقتاً بہادر شاہ ظفر ہی کی ہے۔ حسامی ۱۸۸۲ء تک زندہ تھے انھیں موسیقی سے بھی لگاؤ تھا اور اکثر ظفر کی یہ غزل موثر انداز میں گایا کرتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے ظفر کی یہ غزل اُن کے نام سے منسوب ہوگئی۔

(حوالہ: ——— N.A.F.D. POL. A. No. 3/4 AUG. 1862)

سبھی جا وہ ماتمِ سخت ہے کہو کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے، نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے

جو سلوک کرتے تھے اور سے، اب ہیں دیکھو وہ کس طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، رہا تن پہ اُن کے نہ تار ہے

نہ وبال تن پہ ہے سر مرا، نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا، مجھے اپنی زندگی بار ہے

کیا ہے غم ظفرؔ تجھے حشر کا جو خدا نے چاہا تو برملا
ہمیں ہے وسیلہ رسولؐ کا، وہ ہمارا حامیٔ کار ہے

مولوی محمد حسین آزاد

فتحِ افواجِ شرق

گو ملک سلیمان و کجا حکم سکندر ۔۔ شاہان اولی العزم و سلاطین جہاندار

گو سطوتِ حجاج و کجا صولتِ چینگیز ۔۔ گو خانِ ہلاکو و کجا نادرِ خونخوار؟

نہ شوکت و حشمت ہے نہ وہ حکم نہ حاصل ۔۔ کس جا ہے جہاں اور کہاں ہیں وہ جہاندار

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں ۔۔ ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحبِ ابصار

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ ۔۔ تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاندار

تھے صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت ۔۔ تھے صاحب جاہ و حشم و لشکرِ جرّار

اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے ۔۔ آفاق میں تیغ غضب حضرت قہّار

سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھتے ۔۔ سب ناخن تدبیر و خرد ہو گئے بیکار

کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت ۔۔ پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو وہیں مار

یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا ۔۔ ہے گردش گردوں بھی عجب گردشِ دوّار

نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجیئے تو عیاں ہے ۔۔ ہر شعبدۂ تازہ میں صد بازیٔ عیّار

ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل ۔۔ ہیں بند یہاں اہل زباں کے لبِ گفتار

کیا کہیئے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے ۔۔ حیراں ہیں سب آئینہ صفت پشت بدیوار

حکام نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش ۔۔ مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یکبار

اس واقعہ کی چاہی جو آزاد نے تاریخ

دل نے کہا "قل فاعتبرو یا اولی الابصار"

۱۲۷۳ھ

مولوی محمد حسین آزاد

حُبِّ وطن

ہے قول جملہ تجربہ کاران فارسی — اور کہتے ہیں یہ نظم نگاران فارسی

حُبِّ وطن زملکِ سلیماں نکوتر است — خارِ وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است

سلطانِ دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے — اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے

پر ملکِ مصلحت کا ہے کچھ انتظام اور — اس سلطنت کو چاہیئے طرز نظام اور

حُبِّ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے — نکلے جو گُل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حُبِّ وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو — ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

اب میں تمھیں بتاؤں کہ حُبِّ وطن ہے کیا — وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا

وہ رحمتِ خدا ہے کہ بندوں پہ عام ہے — وہ لُطفِ عام جس سے جہاں شاد کام ہے

وہ نورِ مہر جس سے زمانے میں نور ہے — وہ نور ذرّے ذرّے پہ جس کا ظہور ہے

حُبِّ وطن ہے جلوہ اسی نورِ پاک کا — اور روشن اس کے نور سے عالم ہے خاک کا

ہو مہر میں یہ نور تو اس کو کرن کہیں — گر دل سے جلوہ گر ہو تو حُبِّ وطن کہیں

رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو — اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو

آوارۂ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو — باتھ اپنا جیب نفع میں ہو یا ضرر میں ہو

ہر حال میں رہیں اسے اہلِ وطن عزیز — اور ہوویں نیک و بد روش جان و تن عزیز

حُبِّ وطن کے ملک میں فرمانروا ہے وہ — تاج و سریر ہو کہ نہ ہو پادشا ہے وہ

اور جس وطن کی چاہ تھی یوسف کے سینے میں	اُس کا تو نقش دیکھ لو دل کے نگینے میں
لیکن یہ راز اہلِ حقیقت سے پوچھئے	اس کا طریق پیرِ طریقت سے پوچھئے
دل جو گھڑی کی طرح برابر ہے چل رہا	ہر دم وطن کی سمت ہے منزل بدل رہا
حُبُّ الوطن کی راہ میں گرمِ نفس ہے یہ	نالاں غمِ فراق سے مثلِ جرس ہے یہ
یعنی کہ پاؤں اپنے وطن کا پتا کہاں	بلبل تھا کس چمن کا میں اور آ پھنسا کہاں

- -

لکھتے ہیں اس طرح سے مورخ فرنگ کے	دانا رموزِ معرکۂ صلح و جنگ کے
یعنی یورپ کے مُلک میں دو تاجدار تھے	دونوں کے اہلِ مُلک مگر جاں نثار تھے
سرحد پہ کچھ فساد تھا پر ایسا پڑ گیا	دونوں کے اتفاق کا نقشہ بگڑ گیا
آخر کو تھے جو واقفِ اسرارِ سلطنت	سمجھے بہم یہ مصلحتِ کارِ سلطنت
دو جاں نثار ملک روانہ اِدھر کریں	اور اپنے دو اُدھر کو وہ گرمِ سفر کریں
تا چاروں جس جگہ کہ بہم ایک بار ہوں	سرحدِ ملک کے وہیں قائم منار ہوں
جاں باز اس طرف کے مگر جان توڑ کر	ایسے اُڑے کہ پیچھے ہوا کو بھی چھوڑ کر
اک حصہ طے نہ رستہ حریفوں نے تھا کیا	یہ تین حصے بڑھ گئے اور اُن کو جا لیا
لیکن حریف شرط کے میداں کو چھوڑ کے	بولے یہ عہد قول و قرار اپنا توڑ کے
دو اپنے اپنے ملک کے جو جاں نثار ہوں	پھر اب کے دو طرف سے رواں یک بار ہوں
یہ اتنی بات پہلے ہر اک شخص جان لے	اور یہ ارادہ خوب طرح دل میں ٹھان لے
یعنی جو شرط جیت کے خرسند ہووے گا	سرحد پہ وہ زمین کا پیوند ہووے گا
جاں باز آئے تھے جو ابھی راہ مار کے	حُبُّ الوطن کے جوش میں بولے پکار کے
جو شرط اب لگائی ہے تم نے یہی سہی	اور بات جو کہ ہوتی ہے پھر وہ ابھی سہی
پر بیچ میں نہ حیلہ حوالہ کی آڑ دو	سرحد ہماری ہو چکی بس ہم کو گاڑ دو
حاصل یہ ہے کہ دونوں اسی جا پہ اڑ گئے	جیتے کے جیتے ملک کی سرحد پہ گڑ گئے

○

اور لکھا ہے مورخ عہدِ قدیم نے	روما پہ کی جو فوج کشی اک غنیم نے

تیار اہلِ فوج ہوئے کارزار تھے — پر اہلِ ملک اُن سے سوا جاں نثار تھے
آیا حریف جب کہ نہایت قریب شہر — اُٹھے برائے جنگ امیر و غریب شہر
پر اُن میں کوکلینز جو مردِ دلیر تھا — حُبِ وطن کے حق میں نیستاں کا شیر تھا
نکلا وہ سج کے اسلحۂ جنگ اپنے شہر سے — اور لشکرِ عدو کی طرف آیا قہر سے
دو جاں نثار حُبِ وطن اور ساتھ تھے — اعدا کے خوں میں ڈوبے ہوئے جنکے ہاتھ تھے
ہے جیسا بحر گنگ کا "مائی" لقب یہاں — تھے "ٹائبر" کو باپ کہا کرتے سب وہاں
وہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر — پُل سے اتر کے آئے یہ دشمن کی فوج پر
پُل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے — اعدا کے خوں بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے
اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم — حملہ تو ہم نے روک لیا پُل گرا دو تم
مسمار اُدھر وہ کرتے رہے پُل کو آن کر — یہ تیر و نیزہ مارے گئے تان تان کر
پل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا — اک آدمی کا راہگذر جبکہ رہ گیا
تب کوکلینز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم — اے میرے پیارے ہم وطنو غم نہ کھاؤ تم
قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو چھوڑ دو مجھے — تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے
اک اک رفیق جب کہ ادھر پار ہوگیا — اور پُل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہوگیا
للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے — اور "ٹائبر" میں کودا یہ کہہ کر دھڑام سے
ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو — اے میرے باپ لیجو اپنے سپاہی کو
دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی — اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی
دیکھو تو فیضِ حُبِ وطن اس کو کیا ملا — جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں میں جا ملا

○

گر اس ہوا میں رکھتے ہو دل لالہ زار تم — اور ہو بہ تیغ حُبِ وطن دل فگار تم
ایرانیوں کے عہدِ کیانی کو دیکھ لو — اس بحرِ سلطنت کی روانی کو دیکھ لو
کیا کیا مخالفوں سے بچایا ہے ملک کو — کیا کیا عروج دے کے بڑھایا ہے ملک کو
کیا کیا خجل کیا ہے سپہرِ بنفش کو — کیا کیا شکوہ دی ہے کیانی درفش کو
اعدا کے خوں سے تیغیں ہیں کیا آبدار کیں — کیا کیا وطن کے نام پہ جانیں نثار کیں

ان میں بھی سیستاں کے بہادر وہ شیر تھے — جن سے کہ اک جہاں کے زبردست زیر تھے
کرتے تھے عیش دامنِ کہسار میں کبھی — اور لوٹتے تھے سبزۂ گلزار میں کبھی
مثلِ غزال دشت میں کرتے کلیل تھے — جنگ پلنگ و شیر انھیں بچوں کے کھیل تھے
آبِ رواں پہ لیتے بہاروں کے لطف تھے — تیر و کماں سے لیتے شکاروں کے لطف تھے
پر سنتے جب کہ شاہ بعزمِ غنیم ہے — یا یہ کہ اپنے ملک کی حالت سقیم ہے
درد و الم میں ہوں کہ نشاط و سرور میں — ہوں گھر میں یا کہ وادیٔ نزدیک و دور میں
جس حال میں ہوں بے سروپا اُٹھ کے دوڑتے — روئے زمیں پہ مثلِ ہوا اُٹھ کے دوڑتے

○

اور اُن میں شان رستمِ دستاں کی دیکھئے — الفت وطن کی شیرِ نیستاں کی دیکھئے
وہ جس طرف بپھر کے بہ شکلِ بلا چلا — بولی زمیں لرز کے کدھر زلزلا چلا
وہ گرزِ گاؤ سر کو دھرے کاشِ زین پر — لنگر کا جس کے صدمہ ہو گاؤِ زمین پر
ریشِ دو شاخ دوش ہوا پر اُڑی ہوئی — افعی کے پیچ و خم میں وہ مونچھیں مڑی ہوئی
فولاد کا وہ خود جو کلا تھا شیر کا — کرتا فزوں تھا دبدبہ گُردِ دلیر کا
بُز میں وہ چرمِ شیر کا خفتاں پھنسا ہوا — اور پائے عزم نات زمیں میں دھنسا ہوا
پا کھڑی وہ رخش پہ چیتے کی کھال کی — اور دوش پر شکوہ وہ گینڈے کی ڈھال کی
جانا چھڑانے شاہ کو مازندراں میں — لڑنا وہ دیو و دد سے رہِ ہفت خواں میں
وہ بار بار معرکے افراسیاب سے — ہونا ہمیشہ سینہ سپر انقلاب سے
جب گرم کارزار ہوا خوں بہا دئے — اور دشمنوں کے خون سے جیحوں چلا دئے
وہ سیستاں کا شیر عجب کام کر گیا — حب الوطن کے معرکے میں نام کر گیا

○

ہر چند شہرہ خلق میں رستم کا عام ہے — اور لینا آج تک بھی ہر اک اس کا نام ہے
پر جو وہاں دلاور فرخندہ کام تھے — حب الوطن کے رستمِ دستاں و سام تھے
جب سنتے تھے کہ شاہ کہیں گرمِ جنگ ہے — یا جنگ سے وطن پہ ہوا عرصہ تنگ ہے
سوتے ہوں یا کہ بیٹھے ہوں یا مستِ خواب ہوں — یا شوق میں شکار کے پا در رکاب ہوں

حُبّ الوطن کے جوش میں ہر کام چھوڑ کر
چاروں طرف سے دوڑتے تھے جان توڑ کر
اور معرکہ میں جنگ کے بھر جوشِ عزم میں
گرز و کمند و تیغ سے میدان رزم میں
لڑتے تھے اور مرتے تھے اور جان کھوتے تھے
اپنے وطن کے نام پہ قربان ہوتے تھے
میدان جنگ جیت کے ہمّت کے داؤں میں
لاتے تھے اپنے شاہ کو تیغوں کی چھاؤں میں
چہروں کو رنگ دے کے گلِ نو بہار سے
جاتے تھے گھر کو معرکۂ کارزار سے

○

حُبّ الوطن ہے نور میں ہم نورِ آفتاب
اور کرتا ہے ظہور بدستورِ آفتاب
اس کا بھی روز و شب کی طرح ہیر پھیر ہے
اک جا جو روشنی ہے تو اک جا اندھیر ہے
آج اس کا آفتاب ہے اوجِ فرنگ پر
اور رات ہند کی ہے رُخِ تیرہ رنگ پر
ہے کچھ حساب اور وہاں کی کتاب کا
رکھتا ورق ورق ہے نشان آفتاب کا
جاں باز ہیں تو بہر وطن جاں نثار ہیں
اور تیغ عزم رکھتے سدا آبدار ہیں
قائم ہوتا کہ دبدبہ اہلِ غرور پر
اور بیٹھے سکّہ ملک کے نزدیک دور پر
وہ مال کچھ سمجھتے نہیں نقد و جان کو
دیتے ہیں شان اپنے وطن کے نشان کو

○

عالم جو علم و فضل کے ہیں جوہری بہت
ہیں دل میں رکھتے مایۂ دانشوری بہت
ٹپکاتے کوششوں کے پسینے جبیں سے ہیں
اور قطرہ قطرہ کرتے بہم ہر کہیں سے ہیں۔
تا ہوئے سرابِ وطن آب جو نصیب
اپنے وطن کے واسطے ہو آبرو نصیب
شائستگی کے ساتھ رواجِ کمال ہو
علم و ہنر میں اپنا وطن بے مثال ہو

○

تاجر کہ وہ بھی عقل کے سرمایہ دار ہیں
ہر چند فکرِ مال میں لیل و نہار ہیں
کھوتے وطن کے نام پہ ہیں مال و جان کو
طے کرتے ہیں بہ پائے سیاحت جہان کو
لیکن نہ یاد گھر ہے نہ ہے فکرِ زر انھیں
حُبّ الوطن کا نقش ہے پیشِ نظر انھیں
کرتے ہیں دانہ دانہ بہم خوشے خوشے سے
اور ذرّہ ذرّہ ڈھونڈتے ہیں گوشے گوشے سے
چُنتے ہیں ساتھ مال کے علم و ہنر کے پھول
تا گلشنِ وطن میں کھلیں سیم و زر کے پھول

دولت کا ہو شگفتہ وطن میں چمن سدا ۔۔۔ اور اس سے بہرہ یاب ہوں اہلِ وطن سدا

○

ایسے بھی ان میں صاحبِ بخت و نصیب ہیں ۔۔۔ دارالشفاءِ حبِ وطن میں طبیب ہیں
عالم میں بہرِ تجربہ پھرتے ہیں گشت کو ۔۔۔ اک اک قدم پہ ناپتے وہ کوہ و دشت کو
ہیں ذرّہ ذرّہ چھانتے دریا و کان کا ۔۔۔ ہیں برگ برگ دیکھتے باغِ جہان کا
ہیں گاہ ڈال ڈال ہیں گہ پات پات میں ۔۔۔ ہے غور بات بات کی ذات و صفات میں
اک اک ورق میں صورتِ تحریر دیکھتے ۔۔۔ اور اس میں برگ برگ کی تاثیر دیکھتے
تا نکلے کوئی تازہ مداوا گزند کا ۔۔۔ اور ہو دوائے درد کسی دردمند کا
پر اُن میں وہ ہیں زینتِ تاج و نگیں سدا ۔۔۔ اور زیبِ سر ہیں اُس کے گُلِ آفریں سدا
لایا جو بحر و بر کے سفر کو نہ دھیان میں ۔۔۔ آیا وطن کو چھوڑ کے ہندستان میں

○

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانروائے ملک ۔۔۔ اور غیرتِ نسیم و صبا تھی ہوائے ملک
پر ہند پر تھا حادثۂ غم عجب پڑا ۔۔۔ یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا
اس طرح کا فتور پڑا تھا مزاج میں ۔۔۔ تھا مبتلا وہ اک مرضِ لاعلاج میں
سب اہلِ عقل ہوش و حواس اپنے کھو چکے ۔۔۔ سارے طبیب ہاتھ علاجوں سے دھو چکے
پر اُس مسیح دم نے جو آ کر کیا علاج ۔۔۔ ایسا بہ حسبِ طبع موافق پڑا علاج
گویا دوا بہ کارِ دعا ہو گئی اُسے ۔۔۔ اور تین چار دن میں شفا ہو گئی اُسے
نوبت خوشی کی بج گئی سارے جہان میں ۔۔۔ اور جانِ تازہ آ گئی اک اک کی جان میں
فرخ سیر کہ شاہ سخاوت مآب تھا ۔۔۔ بحرِ کرم کا جس کے جھکولا سحاب تھا
اک جشنِ عام اُس نے کیا دھوم دھام سے ۔۔۔ اور شورِ تہنیت کا اُٹھا خاص و عام سے
حاضر ہوئے امیر و وزیر آ کے سامنے ۔۔۔ اور اُس طبیب کو کہا بلوا کے سامنے
لا دامنِ اُمید کہ بھر دیں ابھی اُسے ۔۔۔ تا عمر بھر تو پائے نہ خالی کبھی اُسے
دریا دلی طبیب کی دیکھو مگر ذرا ۔۔۔ ڈالی نہ اُس نے لعل و گہر پر نظر ذرا
حب الوطن کے جوش سے بیتاب ہو گیا ۔۔۔ دل آب ہو کے سینے میں سیماب ہو گیا

کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی
بندہ کو آرزو نہیں کچھ عزّ و جاہ کی
زر کی ہوس نہ مال کی ہے جستجو مجھے
پر آرزو جو ہے تو یہی آرزو مجھے
کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو
جس سے مرا تمام وطن شاد کام ہو
بولا یہ شاہ اس کا بھی تجھ پر مدار ہے
جو مانگنا ہے مانگ تجھے اختیار ہے
تب عرض کی طبیب نے یوں بادشاہ سے
روشن جلال شاہ ہو خورشید و ماہ سے
تھوڑی زمیں نواحِ دریا کنار میں
مجھ کو عطا ہو مملکتِ شہریار میں
تا اس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں
اور اُن میں تاجرانِ ذوی الامتیاز آئیں
کچھ اُن پہ ہوے راہ نہ بیم و زوال کو
آرام سے اُتاریں یہاں اپنے مال کو
اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دور سے
محصول سب معاف ہو اُس کا حضور سے

○

پہلا علاج گرچہ بہت کارگر پڑا
یہ نسخہ لیکن اس سے سوا پُر اثر پڑا
اس کی بھی یعنی کلفتِ غم دور ہوگئی
اور تھی جو کچھ کہ بات وہ منظور ہوگئی
ہر چند اُسے نہ فائدہ سیم و زر ہوا
پر نفع بہرِ اہلِ وطن کس قدر ہوا
دامن میں اک عطائے خداداد پڑگئی
اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑگئی
نوبت بجا کرے گی سدا صبح و شام کی
آوازیں دیں گے طبل مگر اُسکے نام کی

○

اے آفتابِ حبِّ وطن! تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا
اور انتظامِ دل زبر و زیر ہو رہا
تجھ بن سب اہلِ درد ہیں دل مُردہ ہو رہے
اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو رہے
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہوگئے
کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہوگئے
حبِ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیراں ہوں آجکل ہے پڑا اسکا کال کیوں
کچھ ہوگیا زمانہ کا اُلٹا چلن یہاں
حُبّ الوطن کے بدلے ہے بغض الوطن یہاں
بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو

عالم سے تاکہ تیرہ دلی دور ہو تمام　　اور ہند تیرے نور سے معمور ہو مدام

اُلفت سے گرم سب کے دلِ سرد ہوں بہم　　اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں ہم

تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا دفور　　اور مملکت میں دولت و اقبال کا دفور

علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں　　اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

لبریز جوش حُبّ وطن سب کے جام ہوں

سرشارِ ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں

مولوی محمد حسین آزاد

اولوالعزمی کیلئے کوئی سدّ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو

دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو

چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن
دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن

نہریں اِدھر اُدھر ہیں امیدوں کی موجزن
اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن

کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھولے اپنے نشانِ ننگ و نام نے
باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شادکام نے

کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے
دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے

سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا امیدِ یمین و یسار تم

میدان عزم و جزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤگے کروگے اگر مار مار تم

چلّا رہی ہے ہمت مرداں چلے چلو

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائینگے
دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائیں گے

طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے
نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائیں گے

بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

آئینۂ دل کا گردِ سفر سے اُجال دو　　پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو　　ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو

اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم　　اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم　　دو رُخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم

گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے　　چمکایا چہرہ صبح نے باآب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے　　اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے

تم بھی ہو آفتاب درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے　　اب خاتموں پہ آ گئے ہیں ان کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے　　وہ گو نجا طبلِ فتح کہ میدان لے لئے

ہے کترنائے جنگ کی الحاں چلے چلو

سنہ ۱۸۵۷ء

بسکہ فعّال ما یُرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں نے مانا کہ مِل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کئے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کئے باہم
ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

منیرؔ شکوہ آبادی ؎

داغِ غم

دل تو پژمردہ ہے داغِ غم گلستاں ہوں تو کیا
آنکھیں روتی ہیں دہانِ زخم خنداں ہوں تو کیا

سیکڑوں کو لوٹ کر دو چار گھر بھر دے فلک
سب میں ماتم ہے اگر دس تہنیت خواں ہوں تو کیا

ہو گئے برباد شاہانِ سلیماں منزلت
اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا

پڑ گئے پتھر جواہر پوشوں پر اے آسماں
کوڑیوں کے مول اب لعلِ بدخشاں ہوں تو کیا

بیگمیں شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
سب چڑیلیں صاحبانِ قصر و ایواں ہوں تو کیا

ہو کے محتاج کفن مر مر گئے زرّیں لباس
خلعتِ زیبا نصیب شخص عریاں ہوں تو کیا

جو دو شالے دیتے تھے کمل بھی اب پاتے نہیں
پاجیوں کو قاقُم و سنجاب ارزاں ہوں تو کیا

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صَومعہ ویران ہیں
یادِ حق میں ایک دو دلہائے سوزاں ہوں تو کیا

خانقاہیں منہدم ہیں میکدے آباد ہیں
رنج میں ہیں اہلِ دیں خُوش اہلِ عصیاں ہوں تو کیا

دانہ دانہ کے لئے محتاج ہیں عالی گہر
اشکِ حسرت اپنے مروارید غلطاں ہوں تو کیا

جاں بلب ہیں غم سے استادانِ فن نظم و نثر
مطمئن اس عہد میں دس بیس ناداں ہوں تو کیا

بکتے ہیں ایمان اچھی قیمتوں کو آج کل
اس تجارت میں اگر شاگرد شیطاں ہوں تو کیا

منعم و فیاض ہیں محتاج نانِ خشک کے
خاکروبوں کو میسر خوانِ الواں ہوں تو کیا

بھیڑیوں سے بچ رہے جو چند یوسف لے فلک
خانماں برباد اسیرِ بند و زنداں ہوں تو کیا

پیشوایانِ رہِ دیں ڈر سے ہیں عزلت گزیں
گنج کے مانند ویرانوں میں پنہاں ہوں تو کیا

؎ منیرؔ کو ۱۸۵۷ء کی تحریک کے سلسلے میں کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔

نوحہ گر ہیں قاضیان و مفتیان و اہل عدل
چند نا منصف پناہ اہل دَوراں ہوں تو کیا

عالمانِ باعمل تو پیتے ہیں خونِ جگر
راحتوں میں رہزنانِ دین و ایماں ہوں تو کیا

تعزیہ خانوں میں خاک اڑتی ہے چلتی ہے شراب
غم سے آنکھیں صورت زخم شہیداں ہوں تو کیا

چھپ گئے گوشوں میں عنقا کی طرح نباض عقل
آج بیمار و مسیحا دونوں یکساں ہوں تو کیا

روئے کس کس مزے کو یاد کر کے اے فلک
زخم دل پر سیکڑوں خالی نمکداں ہوں تو کیا

یہ غزل ہے حسب حال دہر مثل قطعہ بند
سست بندشیں صورت خواب پریشاں ہوں تو کیا

نوٹ : ۔ منیر شکوہ آبادی کا دیوان نایاب ہے ۔ دیوان کا ایک نسخہ رام پور ٹرسٹ لائبریری میں موجود ہے اور یہ نظم منیر کی دوسری نظمیں اسی دیوان سے لی گئی ہیں ۔

فریادِ زندانی

سیہ کاروں کے سر پر افسرِ عزت نظر آئے
بنے ہیں مُرغِ عیسیٰ اِن دنوں مُرغِ سلیمانی

ہوا ہے مشتری محبوس گویا برجِ عقرب میں
نظر آتے ہیں اہلِ علم و فضل اس سال زندانی

کیا زاغ و زغن نے آشیانہ چترِ منزل پر
سرِ تختِ ہُما ہیں بُوم صرفِ بال افشانی

عدالت سے ملی ہے جغد و بوم و زاغ کو ڈگری
ہوئی ہے ضبط ملکِ بُلبل و طاؤسِ بُستانی

بہار آئی بھی دنیا میں تو دیوانے کہاں ہونگے
کرے گی بُوئے گل کس کے دماغِ جاں کی مہمانی

ملا ہے عہدۂ خورشید شاید سعد ذابح کو
کہ لاکھوں ہر سحر تلوار سے ہوتی ہیں قربانی

قضا جتنی معلق تھی وہ مبرم ہو گئی اَبکی
لٹک کر پھانسی میں جاتی رہی بنیادِ انسانی

کٹی سُرخی سڑک پر جانتے ہیں دیکھنے والے
ہوا ہے خونِ ناحق سے یہ فرشِ خاک افشانی

لڑے ہیں گورے کالے ہند میں باہم غضب آیا
غراب البین کے سایہ سے پہلے ہے یہ ویرانی

جہاں دیکھو سپاہی مست ہیں حکام مجنوں ہیں
اب اس کو فوجداری کوئی سمجھے خواہ دیوانی

نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے[1] میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہو گیا پانی

پھنسے ہیں ایک جا ادنیٰ و اعلیٰ واہ ری قسمت
برابر خانۂ زنجیر میں ہے سب کی مہمانی

مٹا ہے نام شاہی ہند سے اس درجہ اِن روزوں
نہیں ممکن کہ اب بانات بھی کہلائے سُلطانی

عدالت اِن دنوں ایسی بڑھائی ہے زمانے نے
کہ شمشیر و گلو پیتے ہیں ایک ہی گھاٹ پر پانی

پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے
الٰہی روئے کس کا سر پکڑ کر تاجِ سُلطانی

---

[1] جزیرہ انڈمان جہاں منیر ۱۸۵۷ء کی تحریک کے سلسلے میں قید کرکے بھیجے گئے تھے۔

کسی نے کوڑیوں کے مول بھی پوچھا نہ اِن روزوں — چڑھے نیلام پر سلطانی و نوابی و خانی

نکلوا کر وطن سے بھر دیا جنگل میں لاکھوں کو — جگہ رہنے کی اب پاتے نہیں غولِ بیابانی

پھنسا ہے اس طرح مجھ سا مفیدِ خلق محبس میں — کہ علم کیمیا جیسے دل قاروں میں زندانی

اگر اشیا میسّر ہیں تو خود محتاج ہیں قیدی — بڑی قسمت جو روٹی دال مل جائے باسانی

مناجات و دعا و استغاثہ بڑھتے جاتے ہیں
نہیں جاتی نہیں جاتی نہیں جاتی پریشانی

مصائب قید

فرخ آباد اور یارانِ شفیق
چھُٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے

آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے

اِک مرا شاگرد تھا اس شہر میں
پھل وہ پائے گلشنِ تقدیر سے

لفظ خاں کا جزو اوّل کر وزیر
نام اس کا جان اس تقریر سے

کیں سعادت مندیاں اُس نے بہت
رہ گیا عاجز میری تقدیر سے

جس قدر احباب خالص تھے وہاں
در گزر کرتے نہ تھے تدبیر سے

پر کہوں کیا کاوشِ اہلِ نفاق
تھے وہ خونریزی میں بڑھکر تیر سے

شمر کا خنجر زبانیں اُن کی تھیں
قتل کرتے تھے مجھے تزویر سے

مصطفیٰ بیگ ایک صاحب انیں ہیں
کجروں میں بڑھ کے چرخِ پیر سے

کر کے خونِ ناحق نوابِ جاں
مجھکو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

کچھ شدائد قید کے کہہ دوں اگر
خون ٹپکے ہر لبِ تقریر سے

باندہ کے زندان میں لاکھوں ستم
سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے

پانی تھا نایاب مثلِ آبرو
چاہتے تھے خنجر و شمشیر سے

مثل گوہر جانتے اس کو عزیز
قطرۂ پیکاں جو مِلتا تیر سے

گالیاں کھانے کو تھیں یا زخم و داغ
تھا یہ حاصل مطبخ تقدیر سے

روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں
نانِ گندم تھی سوا اکسیر سے

گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب — خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے

بھینس کی سانی سے بدتر دال تھی — سخت دانہ دانۂ زنجیر سے

تھا بچھونا ٹاٹ کمل اوڑھنا — گرم تر پشمینۂ کشمیر سے

کوٹھری گرمی میں دوزخ سے فزوں — دست و پا بدتر تھے آتشگیر سے

کانپتے تھے موسم سرما میں یوں — جیسے عریاں سردیٔ کشمیر سے

محنت و مزدوری و تکلیف و رنج — تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے

اس جہنم کے موکل سب کے سب — دشمنی رکھتے تھے بے تقصیر سے

قاتل اشراف و اہل علم تھے — رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے

بے مروت بے حیا اہل دغا — کج طبیعت ہر جوان و پیر سے

جعل میں ٹھگ بدیا میں بے بدل — نقد جاں تک چھین لیں تزویر سے

پھر الٰہ آباد میں بھجوا دیا — ظلم سے تلبیس سے تزویر سے

ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش — نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے

جو الٰہ آباد میں گزرے ستم — ہیں فزوں تقریر سے تحریر سے

پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں — گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے

ہتکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں — ناتواں تر قیس کی تصویر سے

راستے میں ظلم اعدا بے شمار — ہر گھڑی تھے شامت تقدیر سے

بے حواس و بے لباس و بے دیار — دل گرفتہ جور چرخ پیر سے

سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے — تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

نقشہ کلکتہ میں کھچوایا مرا — رنگ منہ کا اڑ گیا تصویر سے

کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک — کٹ گئی قید ستم تقدیر سے

یہ کہی تاریخ ہم نے اے منیر
صاف نکلے خانۂ زنجیر سے

رُباعیات اسیری

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا
زہر غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس منیر
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

○

زنداں میں تو ہم اسیر و مجہول آئے
کس طور سے نیند حسبِ معمول آئے
گھر سے نکلے جو بے حواسی میں منیر
خوابِ راحت پلنگ پہ بھول آئے

○

ہیں ضعف سے ہڈیاں عیاں سرتاپا
سونے سے زمیں کے بہت ہے ایذا
اکسیر ہے فرشِ خواب زنداں میں منیر
سونا ہے پلنگ کا نصیبِ اعدا

○

زنداں میں جو بڑھ چلنے کے آہنگ ہوئے
کپڑے بھی ہم سے عازمِ جنگ ہوئے
ملبوس خلافِ وضع کے شکوے میں
کچھ عرض کیا تو پائینچے تنگ ہوئے

○

ہر چند کہ زنداں میں جگر جلتا ہے
پر چھوڑ کے ضعف ہیں کب ٹلتا ہے
اُٹھتے ہیں عصا کے زور سے پاؤں منیر
ٹٹو لاٹھی کے خوف سے چلتا ہے

○

پہلے ہوئے چھ روپے ہماری تنخواہ
پھر آٹھ سے دس ہوئے خدا ہے آگاہ
ننانوے کا پھیر رہا قید میں بھی
لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ

قطعات تاریخ

نوّابین فرخ آباد

ریاضِ خلق سخاوت[۵۱] حسین خاں نواب	نہالِ باغِ کرم زیب مسند شوکت
جوان قابل و فرزند خاص نصرت جنگ	غلام آلِ نبی سرو قد قمر طلعت
وہ بے گناہ ہوا تیغ مرگ سے مقتول	عنایت اس کو کیا حق نے گلشن جنت

منیر نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ
ہوا شہید امیر دلیر با ہمت
۱۲۷۴ھ

○

اقبال مند خاں[۵۲] و غضنفر حسین خاں	دونوں در محیط قضا آہ آہ ہائے
دونوں جوانِ نیک امیرانِ ذی حشم	مقتولِ تیغ تیز قضا آہ آہ ہائے

تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے یہ منیر
دونوں شہید راہ خدا آہ آہ ہائے

---

۵۱ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے پر فرخ آباد کے نواب سخاوت حسین خاں کو پھانسی دی گئی تھی۔
۵۲ اقبال مند خاں اور غضنفر حسین خاں نوابین فرخ آباد کو بھی بجرم بغاوت پھانسی دی گئی تھی۔

منیر شکوہ آبادی

قید سے نجات

بارے آئی نجات کی باری — کھل گیا عقدۂ گرفتاری

ہم کو منصب ملا رہائی کا — قید کو جائداد بیکاری

پاؤں کو چھوڑ بھاگے مارِ دوسر — سر کو پشتارۂ گرانباری

کوچ ٹھہرا انتقام غربت سے — اب وطن چلنے کی ہے تیاری

رخصت اے دوستانِ زندانی — الوداع اے غمِ گرفتاری

الرحیل اے مشقتِ ہر روز — الفراق اے ہجومِ ناچاری

دال فی عین اے کتابتِ قید — گاف میم اے حسابِ سرکاری

دال چاول سے کہدو رخصت ہوں — پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری

مچھلیوں سے کہو کہ ہٹ کے سڑیں — گھاس کھودے یہاں کی ترکاری

چینی، برہما، ملائی، مدراسی — اہلِ آشام، جنگلی، تاتاری

اپنے دیدار سے معاف کریں — اپنی باتوں سے دیں سبکساری

کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت — اشکِ شادی ہیں آنکھوں سے جاری

بیٹھتے ہیں جہاز دوری پہ ہم — اٹھتے ہیں لنگر گرانباری

کرم اے خضرؑ المدد اے نوحؑ — رحم اے فضلِ حضرتِ باری

السّلام اے خروشِ بحرِ محیط — السفر اے سفینۂ جاری

زادِ راہِ سفر توکّل ہے — رہنمائی کو اس کی غفّاری

ہے ارادہ کہ فکرِ شعر کریں — تاکہ ہو دور رنجِ بیکاری

بسکہ برسوں رہا ہوں زنداں میں — بھولی قصرِ سخن کی معماری

مصطفیٰ و صہبائیؔ [1]

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے، اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

---

[1] شہیدِ راہِ آزادی۔

شاعر لا معلوم

صہبائی کا مرثیہ

ندانم کجا رفت آں نقش پاک — فلک بُرد یا ماند بر روئے خاک
ندانم کسے داد او را کفن — و یا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کردہ است با او سپہر — ز جامہ کفن کرد یا تابِ مہر
بخاکش نمودند او را نہاں — و یا مرتفع شد سوئے آسماں
کسے فاتحہ ہم براو خواندہ است — بعطر گلابی برافشاندہ است

کدامے گل و بلبل و باد دشت
بخاکش بہ حسنِ عقیدت گزشت

ﮯ یہ مرثیہ اگرچہ فارسی میں ہے لیکن ایک ایسے ادیب کی یاد دلاتا ہے جس نے جنگ آزادی کے سلسلے میں جام شہادت نوش کیا، اس لئے معذرت کے بغیر شامل کیا جا رہا ہے۔

مصیبت دہلی

ہائے کیا دہلی پر آفت آگئی　　چین سے بیٹھے تھے شامت آگئی
سر پہ عالم کے مصیبت آگئی　　فوج کیا آئی قیامت آگئی
وقت تنگ آمد ترحم یا رحیم
لطف کن بر دردمندان سقیم

تھی یہ دہلی رشک گلزار ارم　　خاک سے تھا جس کی بنتا جام جم
ہوگئی برباد و ویراں ہے ستم　　ہے یہ وہ غم جس پہ خود رو دیوے غم
باز شں از لطف وکرم آباد کن
ساکنانش را خدایا شاد کن

آشنائے قلزم عیش وطرب　　ہوگئے سب غرق دریائے تعب
جوششِ گریہ ہے جوشِ خندہ اب　　چشم تر ہے جوں حُبابِ بحر سب
از کجا ایں سیل آفت در رسید
کایں چنیں چشم فلک طوفان دید

بانٹتے تھے رات دن جو سیم و زر　　پھینکتے تھے کوڑیوں کی جا گہر
مانگتے پھرتے ہیں اب وہ دربدر　　رکھتے ہیں جائے درم داغ جگر
الکرم، العفو، اے ربّ العلا
از طفیلِ حضرتِ خیرالوریٰ

جن کو گھر بیٹھے تماشے تھے ہزار پھرتے ہیں وہ دربدر رسوا و خوار
عیش و عشرت تھا جنھیں لیل و نہار یوں خزاں اب ہوگئی ان کی بہار

عفو کن گر جرمے از کس سر زند
یارب آں کن کاں بہ عفوت می سزد

پھر گیا پھر آسمانِ پُرجفا مخبروں نے کردیے فتنے بپا
بے گنہ اور با گنہ پکڑا گیا جس کی جو قسمت میں لکھا تھا ہوا

نیست شکوہ از سپہرِ فتنہ جو
آنچہ در تقدیر بود آمد برو

ابرِ حسرت دل پر اپنے چھا گیا یاں تو حسرت کو بھی رونا آگیا
ہائے قاضی اپنا پھانسی پا گیا غم بھی افسردہ کو رُلوا گیا

آنچہ برمن کرد چرخ بد نہاد
ایں چنیں اندوہ کافر را مباد

غیرتِ باغ جناں یہ شہر تھا یک بیک برباد جو ایسا ہوا
انتقامِ عیش و عشرت ہو چکا اب یہ ہے ہر شخص کی ہر دم دُعا

لُطف کُن بر اہلِ دہلی اے خدا
تاکہ باشد آب و آتش را بقا

دار و رسن

عجیب کوچۂ رشک جناں تھا دہلی کا بہشت کہتے ہیں جس کو مکاں تھا دہلی کا
دماغ بر سرِ ہفت آسماں تھا دہلی کا خطاب خطۂ ہندوستاں تھا دہلی کا
غضب ہے اس کو کوئی شادماں نہ دیکھ سکا
زمیں نہ دیکھ سکی آسماں نہ دیکھ سکا

ہزاروں زلف پری وش کے یاں تھے سودائی ہزاروں مےکش و میخوار و مست و صہبائی
شراب عیش پلاتا تھا چرخِ مینائی قبول کرتے تھے اس در پہ سب جبیں سائی
جو آتا تھا سو وہ ہو رہتا تھا اسی گھر کا
زمیں کی ناف ہے کعبہ ہے بطنِ مادر کا

وہ تخت سلطنت و بارگاہِ سلطانی کہ جس میں بیٹھتے تھے آ کے ظلِ سبحانی
پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی بجا اس اوج پہ تھا دعوئے سلیمانی
ہر ایک قصر کو دعویٰ تھا طاق کسریٰ کا
دماغ عرش پہ تھا قلعۂ معلّٰے کا

زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے ناگاہ تمام ہو گیا تاراج ملک و مال اور جاہ
کہ اس سے ہو گئے بدتر غریب شاہنشاہ رعیت اس کی ہوئی اس سے بھی زیادہ تباہ
وہ ساہوکار نہ تھا جس کی ساکھ میں بٹا
اب اس کے نام پہ لگتا ہے لاکھ میں بٹا

سہ دعوائے ہونا چاہیئے تھا۔

ملا یہ حکم کہ سب لوگ یاں سے ٹل جائیں
اسی میں خیر ہے جو شہر سے نکل جائیں
دبی ہے پونجی تو دکھلا کے یاں بغل جائیں
جو کچھ ہے چھوڑ یہاں صاحب دول جائیں

نہ سر پہ ٹوپی ہے ان کے نہ پاؤں میں جوتی
بغل میں طوطے کا پنجرہ انبی جی بھیجو جی

یہاں جو آن کی دیکھی تو دار کی صورت
وہ دار کہیئے جسے ذوالفقار کی صورت
شادی چشم زدن میں ہزار کی صورت
نظر پڑی نہ کسی بیقرار کی صورت

برنگِ تیر شہاب آگ میں جلے لاکھوں
سپرد دار و رسن ہو گئے، گلے لاکھوں

شہر آشوب

فلک زمین و ملائک جناب تھی دہلی　　بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دہلی
جواب کا ہیکو تھا لاجواب تھی دہلی　　مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

فلک نے قہر و غضب تاک کر ڈالا　　تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا　　غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

لہو کے چشمے ہیں چشمِ پُر آب کی صورت　　شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر دلِ خانہ خراب کی صورت　　کہاں یہ حشر میں توبہ عذاب کی صورت

زبانِ تیغ سے پرسش ہے دادخواہوں کی
رسن ہے، طوق ہے، گردن ہے بے گناہوں کی

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے　　ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے　　غرض یہاں کے لیے اک جہان روتا ہے

جو کہیے جوششِ طوفاں کہی نہیں جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگ بوئے گل اہل چمن چمن سے چلے — غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھ زندوں کو بے چارے کس چلن سے چلے — قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت — چڑھے ہی آتے تھے سر پر بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی اک اک گنوار کی صورت — چھپی نہ ان سے پر اہل دیار کی صورت
کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا
تو اہل قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا

زبان بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی — ملیں جو خاک بھی منہ پر تو کل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی — پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی
جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں

بنا ہے خال سیہ، رنگ مہ جمالوں کا — دوتا ہوا ہے قد راست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا — عجیب حال دگرگوں ہے دلّی والوں کا
کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی — تلاش بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی
یہ نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی — کہ حکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی
یہ اہل سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ

غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں — کہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں — جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں
پئیں جو آب بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمت باری تو قہر ہو جائے

فغانِ دہلی

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی
تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی
اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں ہو ویگا حساب
بس یہی ہو گا کہ ہم اور بیانِ دہلی
دے دیئے فوج کو حکام نے انعام میں سب
گنج قاروں سے فزوں گنجِ نہانِ دہلی

نیرؔ و غالبؔ و آزردہؔ سے پھر لوگ کہاں
داغؔ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

انقلابِ دہلی

یہ انقلاب ہے یا ہے قیامت صغرا　　کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی ہے آدمی کی شکل شہر میں عنقا　　بنا ہے ہو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچا
ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد
ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہان آباد

کسی کے لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر　　کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پر کوئی ہے تھامے جگر　　غرض کہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر
بجائے زمزمہ ہر جائے شیونِ غم ہے
محلِ عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے

سمجھ کے اپنا ٹھکانا گئے جہاں ہم لوگ　　ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ　　پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ
زمین ہو گئی دشمن نہ پائی جائے ثبات
ٹھہر سکا نہ کسی جائے اپنا پائے ثبات

وہ لوگ کھاتے تھے جن کی نشاط کی قسمیں　　پڑے ہیں طالعِ ناسازگار کے بس میں
محل میں رہتے تھے یا اب پڑے ہیں مجلس میں　　نہ تاب دل میں ہے، طاقت نہ جان بیکس میں
جو تشنہ لب ہوں تو آبِ دمِ سناں موجود
جو گرسنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود

ہوئے ہیں قتل جو بے جرم لوگ دِلّی کے　　بہشت چاہئے پہلے انھیں قیامت سے
کیا جناب الٰہی میں عرض رضواں نے　　کہ آج کل درِ فردوس کس طرح سے کھلے

ملا جواب کہ دلّی کو لاؤ اُٹھوا کر
اور اس گروہ کو اس میں بساؤ لے جا کر

وہ جس کی طبع کہ آسودگی پہ مائل ہے　　پیادہ کیونکہ چلیں ناقہ ہے نہ محمل ہے
اٹھائیں ایک قدم بھی اگر تو مشکل ہے　　قدم کہے کہ ٹھہر جاؤ یہ ہی منزل ہے

سروں پہ بوجھ ہے گٹھڑی کا لڑکھڑاتے ہیں
بس اپنے جی کی طرح بیٹھ بیٹھ جاتے ہیں

لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا ہے ہے　　بیان مجھ سے ہو کیونکر یہ ماجرا ہے ہے
نہ آئی جن کی کبھی در تلک صدا ہے ہے　　نکل کے گھر سے چلی ہیں پیادہ پا ہے ہے

کبھی نہ غصے میں بھی جامہ سے جو باہر ہوں
غضب ہے یہ کہ وہ یوں بے رداو چادر ہوں

داستانِ انقلاب

سواد ہند میں عرشِ احتشام تھی دہلی | بیاض مردمکِ خاص و عام تھی دہلی
زمین چرخ کی قائم مقام تھی دہلی | جب آیا عہد جوانی تمام تھی دہلی

یہ وہ زمیں ہے زمیں جسکی زر اگلتی ہے
یہ خاک وہ ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے

جہان آباد لقب تھا یہ عزّو شاں کے لئے | جہاں کا لفظ بنا تھا اسی مکاں کے لئے
یہ درجے اس کے لئے تھے نہ آسماں کے لئے | کہ اس سے کام زمانہ نے دو جہاں کے لئے

فلک سے رتبہ میں رتبہ دو چند تھا اس کا
مقام عرش سے پایہ بلند تھا اس کا

یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا حسن والوں کا | یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا مہ جمالوں کا | یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا ذی کمالوں کا

یہ وہ مکاں ہے مکیں جس کے قیصر و جم تھے
یہ خطہ وہ ہے گدا جس کے فخر حاتم تھے

بدی کے تخم شقی کشت دل میں بونے لگے | کہ بے گناہ زن و بچہ قتل ہونے لگے
جو اہل درد تھے رو رو کے جان کھونے لگے | مسیح و خضر بھی منہ ڈھانپ ڈھانپ رونے لگے

ستونِ خانہ نصفت گرا دیئے یکسر
چراغ بزم عدالت بجھا دیئے یکسر

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سروساماں　　وہ جانا پردہ نشینوں کا باسرِ عریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے ناداماں　　وہ دار وگیر سپاہ شریر بے ایماں

دراز دست تطاول ستم شعاروں کا
فلک کو یاس سے تکنا ستم کے ماروں کا

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے　　ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے　　قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے

کمند موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمین شہر نے اک اک کے پاؤں پکڑے ہیں

گلوں سے جسموں پہ اک مردنی سی چھائی تھی　　وہ سہ سے چہروں پہ گویا چھٹی ہوائی تھی
غضب وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی　　غرض کہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی

بیان کیجے نصیبوں کی کیا برائی کا
وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا

ظہیر دہلوی

ہنگامۂ دار و گیر

نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے　　گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور یہ کیا زوال ہوئے　　کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے

جو عطرِ گل کو نہ ملتے، ملے وہ مٹی میں
جو فرشِ گل پہ نہ چلتے، ملے وہ مٹی میں

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی　　سنانِ نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی　　ہر ایک سمت سے فریادِ گیرودار ہوئی

ہر ایک دشتِ بلا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا

ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا　　ہر اک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہلِ زبان خوش بیان قتل ہوا　　غرض خلاصہ یہ ہے ایک جہان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے　　وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگر میں الم سمائے ہوئے　　جفا کی تیغ کے سب زخم دل پہ کھائے ہوئے

وہ داغِ مرگِ عزیزاں وہ دشت پیمائی
وہ ریگِ خارِ مغیلان وہ آبلہ پائی

ے میرزا الٰہی بخش شاہزادے کی نشان دہی پر تیس شاہزادگان دہلی جن میں بادشاہ کے بیٹے، پوتے، نواسے اور داماد شامل تھے گرفتار کرکے بیرون دہلی دروازہ لائے گئے اور وہاں ان کو قتل کرکے ان کے سر کٹوا کر بادشاہ کے پاس بھیج دئے گئے۔

گنج شہیداں

پسندِ خاطرِ ہر خاص و عام تھی دہلی　　طلسمِ دل کش و جنّت مقام تھی دہلی
طرب فزائے جہاں صبح و شام تھی دہلی　　گل خوشی سے معطّر تمام تھی دہلی

اُجاڑا ایسا چمن جس کے غم سے دل ہے خوں
مئے خزاں کی ہوا خاک میں ملے گردوں

بلا بلا پہ ہے نازل خراب ہے دہلی　　تباہ ہوگئی کیسی شتاب ہے دہلی
ستم ہے موردِ ظلم و عتاب ہے دہلی　　ہزار حیف کہ وقفِ عذاب ہے دہلی

ہوا جو دیدۂ خور غم سے سرخ کیا ہے عجب
کہ تارِ اشک بھی تارِ شعاعِ مہر ہیں اب

ہر ایک سو ہے یہ غارت گری سے بیگانہ　　کہ مثلِ دیدۂ گریاں ہے ہر درِ خانہ
رُلا رہا ہے فرشتوں کو بھی یہ افسانہ　　نہ وہ ہے گھر نہ وہ محفل نہ شمع و پروانہ

بنا ہے گنجِ شہیداں بسانِ خرمنِ گُل
فرشتے لاش پہ اب نالہ کش ہیں چوں بلبل

جو ہائے پھولوں کے گہنے کو کہتے تھے بھاری　　انھیں نصیب ہوا طوق کرتے ہیں زاری
یہ ان کی نازکی اور حیف قید کی خواری　　دموں پہ آن بنی جان سے ہے بیزاری

وہ رو کے کہتے ہیں زنداں سے کیونکہ ہوں باہر
کہ ہم کو روکے ہے زنجیر پاؤں پڑ پڑ کر

داستانِ الم

ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن، انھیں روتا ابرِ بہار ہے
کہ فرشتے پڑھتے ہیں فاتحہ، نہ نشان ہے نہ مزار ہے
نہ تھا شہرِ خلد سے یہ بھی کم، سبھی جا خوشی تھی، نہ تھا اَلم
چلی ایسی بادِ سموم غم، نہ وہ رنگ ہے نہ بہار ہے
کہو کیونکہ اپنی ہو زندگی، کوئی جائے امن نہیں رہی
کہیں تیغِ موت کھنچی ہوئی، کہیں پھانسی ہے کہیں دار ہے
پھرے دشت دشت تباہ سب، بُرے دن دکھائے فلک نے اب
نہیں تھمتے اشک ہیں روز و شب، یہی شغل ہے یہی کار ہے
جو دوشالہ پوش تھے مثلِ گل، جو لبوں پہ رکھتے تھے جامِ مُل
بنے دشتِ غم کے ہیں خار و گل، نہ قبا ہے تن پہ نہ تار ہے

نوحۂ دہلی

بے نشاں ہو گیا عالم میں نشانِ دہلی
لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی

نامہ بر، کوچہ، نہ بازار و محلہ باقی
خط پہ کیا خاک لکھوں نام و نشانِ دہلی

گھر کھُدا، مال لُٹا، جان گئی اشک بہے
ہیں مصیبت میں مصیبت زدگانِ دہلی

وا رہیں آنکھیں پسِ قتل بھی مقتولوں کی
تن بے جاں تھے مگر تھے نگرانِ دہلی

طوفانِ مجزی

دیارِ ہند میں یہ تخت گاہ تھی دہلی   ثریا جاہ و فلک بارگاہ تھی دہلی
تمام شہر کی پشت و پناہ تھی دہلی   گناہ گار ہوئی، بے گناہ تھی دہلی

یہ انقلاب زمانہ سے ہو گئی برباد
اُکھڑ کے جھک گئی اب اسکی بیخ اور بنیاد

یہ شہر وہ ہے کہ تھے اس میں خلد کے ساماں   ہر ایک شخص جہاں تھا بجائے خود رضواں
ہر ایک طفل یہاں کا تھا ثانیٔ غلماں   دبیرِ چرخ کا ہمسر تھا یاں ہر ایک جہاں

رہا نہ کوئی جواں اور نہ کوئی پیر امیر
برائے مجزی کے رہ گئے ہیں چند شریر

حکیم آغا جان عیشؔ

دہلی و لکھنؤ

ہو گئے ویران دہلی و دیارِ لکھنؤ
اب کہاں وہ لطفِ دہلی و بہارِ لکھنؤ

باغِ دہلی تو ہوا یوں یک قلم برباد اور
مل گیا سب خاک میں نقش و نگارِ لکھنؤ

اہلِ جوہر تو ملائے خاک میں دہلی کے واں
رہ گئے یوں بے سر و پا وضعدارِ لکھنؤ

جو تھے دہلی میں عمائد وہ کئے یکسر خراب
اور تبہ سارے کئے صاحب وقارِ لکھنؤ

تھا خس و خاشاکِ دہلی غیرتِ صد لالہ زار
رشکِ صد گلزار تھا ایک ایک خارِ لکھنؤ

سو فلک نے یوں کیا دہلی کو تو پامالِ جور
اور کیا وقفِ جفا ہر برگ و بارِ لکھنؤ

رشکِ صد خورشید تھا ہر ذرّۂ دہلی سنا
مارتا چشمک صفا پر تھا غبارِ لکھنؤ

غم میں دہلی کے گلوں کے تو گریباں چاک ہیں
اور سوسن ہے چمن میں سوگوارِ لکھنؤ

ٹکڑے ہوتا ہے جگر دہلی کے صدمے سن کے عیشؔ
اور دل پھٹتا ہے سن کر حالِ زارِ لکھنؤ

سنہ ۱۸۶۰ء

واسوخت[1]

گورے اور کالے

یاد ایام کہ جرأت کا کہیں نام نہ تھا   کبھی نہ درائی کا ہم پر کوئی الزام نہ تھا
لکھنے پڑھنے کا کوئی گھر میں سرانجام نہ تھا   بھولے ایسے تھے سمجھنے سے کبھی کام نہ تھا
گھی کے اور دودھ کے تھے یاد سمندر تم کو
گھڑکیاں دور ہی سے دیتے تھے بندر تم کو

ایک دن وہ تھا لنگوٹی بھی نہ باندھ آتی تھی   ٹرکی ٹوپی کی بھلا وضع کہاں بھاتی تھی
کب چپت گاہ پہ سندیل سجی جاتی تھی   سیر دریا کی نہ یوں آپ کو لہراتی تھی
سر و گردن کا مری جان تمھیں ہوش نہ تھا
قومی ہمدردی کا پہلے تو کبھی جوش نہ تھا

اپنے حق کا کبھی دعویٰ کہو آگے کب تھا   اتنا سر دس کا تقاضا کہو آگے کب تھا
انتظامات میں جھگڑا کہو آگے کب تھا   لڑنے بھڑنے کا سلیقہ کہو آگے کب تھا
خشک وعدے بھی جو کرتے تھے تو جی جاتے تھے
غصے ہو کر جو گھڑکتے تھے تو پی جاتے تھے

اب تو ہر وقت تمھیں رہتا ہے اخبار سے کام   ملکوں ملکوں کے گزرنے لگے پرچے پیغام
کھچڑی پکتی ہے بدے جاتے ہیں جلسوں کے مقام   اب تو ہر لحظہ ہے اپنے لئے مشکل الزام

---

[1] مطبوعہ اخبار اودھ پنچ لکھنؤ۔ مورخہ ۲ر جولائی [illegible]ء۔

برملا ہونے لگی اب تو شکایت اپنی
خیر سے آپ بھی اتنے ہوئے اللہ غنی

آتو مغلانیاں رکھ رکھ کے سکھایا ہم نے | لکھنے پڑھنے میں تمہیں طاق بنایا ہم نے
کرسیوں پر تمھیں جلسوں میں بٹھایا ہم نے | مانو احسان تو انسان بنایا ہم نے

پائی تعلیم تو انداز ادب بھول گئے
بھر گئی ایسی ہوا سر میں کہ سب بھول گئے

سب سے اخلاص ہے ہم سے تمھیں کچھ پیار نہیں | اپنی ہر بات پہ ہو جاتی ہے ہر بار نہیں
کوئی جلسہ ہو تمھیں جانے سے انکار نہیں | کالے گورے کی تمیز آپ کو زنہار نہیں

دل میں جرأت ہے خیالات میں آزادی ہے
کہئے ان باتوں کا ہم سا کوئی کب عادی ہے

خیر اگر جوتیاں کھانے سے ہے تم کو اکراہ | جوتی خوروں کا ہے کچھ قحط عیاذاً باللہ
گرم بازارِ خوشامد ہے کہ خلقت ہے تباہ | کچھ نہ کچھ یاں بھی نکل آئے گی صحت کی راہ

تم جو مختار ہو بے بس نہیں ہم بھی صاحب
شہر معمور ہے مفلس[1] نہیں ہم بھی صاحب

---

[1] خانساماؤں کی اصطلاح -

مرثیہ حکیم محمود

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار
ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دو چار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار
شہر میں تھی چارسو گویا قیامت آشکار
آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلہ سے کہیں سب خشک و تر

بالیقیں جن مجرموں کو اس نے سمجھا بے خطا
مارشلا میں ثبوت ان کی گواہی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہوگیا اک اک رہا
جو کہ تھے نادار کی ان کی اعانت برملا
زر دیا، کھانا دیا، کپڑا دیا، بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا، بے گھروں کو گھر دیا

قصہ جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی جس کو خو نہ تھی
دی گواہی جس نے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی
جس نے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی
ہاتھ سے جس نے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی
بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پاؤں اس کا اک عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

دہلی مرحوم

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی، مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیشِ نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی ہرگز — یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

کالے گورے کی صحت کا مڈیکل اِمتحان

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل، مگر پہلا سوارِ راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ مُشت مُشت
کوکھ میں کالے کی اک مُکّا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلّی کو بہت مسکین کے
آکے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اُتار

○

ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمے سے غش کالے کو آیا چند بار

○

آخرش کوٹھی پہ پہنچے جاکے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصّہ ایک بار

دی سند گورے کو لکھ، تھی جس میں تصدیق مرض

اور یہ لکھا تھا کہ " سائل ہے بہت زار و نزار

یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکّے سے مرے

کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار"

اور کہا کالے سے " تم کو مل نہیں سکتی سند

کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار

ایک کالا بیٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے

آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار"

انگلستان کی آزادی

اور

ہندستان کی غلامی

کہتے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آکر، کرامت ہے یہ انگلستان کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہیں رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی
قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندستان بھی
آن کر آزاد' یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام، اس کی ہوا جن کو لگی

آزادی غنیمت ہے

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوفِ ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو
بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

اِتحاد

جب تک سبق ملاپ کا یاد رہا　　بستی میں ہر اک شخص دل شاد رہا
جب رشک و حسد نے پھوٹ ان میں ڈالی　　دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا

اچھا زمانہ آنے والا ہے

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ
بجے گا محبت کا نقّار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

○

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن
چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن
رُکے گا نہ عالم ترقی کئے بِن
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

○

ہر اک توپ سچ کی مددگار ہوگی
خیالات کی تیز تلوار ہوگی
اسی پر فقط جیت اور ہار ہوگی
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

○

زبان قلم سیف پر ہوگی غالب
دبیں گے نہ طاقت سے پھر حق کے طالب
کہ محکوم حق ہوگا دنیا کا طالب
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

○

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ہے کیا
مگر وصف ذاتی کا ڈنکا بجے گا
اسی کو بڑا سب سے مانے گی دنیا
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

○

لڑائی کو انسان سمجھیں گے ڈائن
تفاخر یہ ہوگی نہ قوموں میں اَن بَن
مشیخت کی خاطر اُڑے گی نہ گردن
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

○

عقیدوں کی مٹ جائیگی جب رقابت
مذاہب کو ہوگی تعصب سے فرصت
مگر ان کی بڑھ جائے گی اور طاقت
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

○

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر
یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اُٹھ جائے چھپّر
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

اسمٰعیل میرٹھی

کورانہ انگریز پرستی

رہا وہ جز گر جسے چر گئی ہے انگریزی
سو واں خدا کی ضرورت نہ انبیا درکار

وہ آنکھ میچ کے برخود غلط بنے ایسے
کہ ایشیا کی ہر اک چیز پر پڑی دھتکار

جو پوششوں میں ہے پوشش تو بس دریدہ کوٹ
سواریوں میں سواری تو دُم کٹا رہوار

جو اردلی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید
بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار

وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹلمین
اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار

نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق نے خدا ترسی
گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار

وہ اپنے زعم میں لبرل ہیں یا ریڈیکل ہیں
مگر ہیں قوم کے حق میں بصورت اغیار

نہ انڈین میں رہے وہ نہ وہ بنے انگلش
نہ ان کو چرچ میں آز نہ مسجدوں میں بار

نہ کوئی علم نہ صنعت نہ کچھ ہنر نہ کمال
تمام قوم کے سر پہ سوار ہے ادبار

شبلی نعمانی

طمطراق لیگ

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں / ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ / منظرِ لطفِ رئیسانِ خوش انجام بھی ہے
کوئی ہے جو نہیں اِس حلقۂ قومی کا اسیر / اس میں زہّاد بھی ہیں رندِ مے آشام بھی ہے
فیض اِس کا ہے باندازۂ طالب، یعنی / بادۂ صاف بھی ہے دردِ تہِ جام بھی ہے
کعبۂ قوم جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں / مرجعِ خاص ہے یہ، قبلہ گہِ عام بھی ہے
پختہ کاروں کے لئے آلۂ تسخیر ہے یہ / نوجوانوں کو صلائے طمعِ خام بھی ہے
رہنمایانِ نوآموز کا ہے مکتبِ درس / زینۂ فخر و نمائش گریٔ عام بھی ہے
جن مہمات میں درکار ہے ایثارِ نفوس / ان میں طرزِ عمل بوسہ بہ پیغام بھی ہے
صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پُر آب / دل میں غمخواریٔ ترکانِ نکونام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کو جو پوچھے تو یہ ہیں / محسنِ قوم بھی ہے خادمِ حکام بھی ہے
ربطِ ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک کی بھی / جس طرح ''سرف'' میں ایک قافاً عمداً ادغام بھی ہے

○

اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا سامان ہے درست / ورقِ سادہ بھی ہے کلکِ خوش اندام بھی ہے

ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو — جا بجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل — کچھ اسسٹنٹ ہیں، کچھ حلقۂ خدّام بھی ہے
ہو جو تعطیل میں تفریح و سیاحت مقصود — سفرِ درجۂ اوّل کے لئے دام بھی ہے
یہ تو سب کچھ ہے، مگر ایک گزارش ہے حضور — گرچہ یہ سوءِ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
"سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے"

شبلی نعمانی

مسلم لیگ

لیگ کو جب نظر آیا کہ چلی ہاتھ سے قوم
اک نیا روپ بھرا اس نے باندازِ دگر

منظرِ عام پہ لوگوں سے کیا اس نے خطاب
کہ نہیں سلف گورنمنٹ سے اب ہم کو مفر

اک ذرا سی مگر اس لفظ میں تخصیص بھی ہے
جس سے ہیں متفق اللفظ سب اربابِ نظر

یعنی وہ سلف گورنمنٹ کہ ہو "سوٹ ایبل"
یا کہ موزوں و مناسب ہو بالفاظِ دگر

جو حکومت کہ کناڈا کے لئے ہے موزوں
ہے وہی مملکتِ ہند میں سرمایۂ شر

ملک میں ہم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی
جو کہ ہیں نخلِ حکومت کے لئے برگ و ثمر

○

واقعی قید "مناسب" ہے بجا اور موزوں
آپ اس قید کو کس کام میں لائیں گے مگر

پہلے بھی آپ تو اس حصن میں لیتے تھے پناہ
پہلے بھی آپ اسی دشت میں تھے راہ سپر

جب کبھی کوئی بھی تحریک سیاسی ہوگی
آپ اس قید "مناسب" کو بنائیں گے سپر

اب بھی ہیں جلوۂ مقصد کے وہی نقشِ قدم
اب بھی اوراقِ سیاست کا وہی ہے مسطر

یہ وہی لفظ ہے مجموعۂ صد گونہ فریب
یہ وہی لفظ ہے سرمایۂ صد گونہ ضرر

آپ ہر بار جو بڑھ بڑھ کے پلٹ آتے ہیں
ہے اسی شیوۂ تعلیمِ غلامی کا اثر

آپ کے فلسفۂ نو کے یہ الفاظ جدید
گو بظاہر ہیں فریبندۂ اربابِ بصر

ہے حقیقت میں اسی متنِ غلامی کی یہ شرح
ہے حقیقت میں اسی نخلِ سیاست کا ثمر

چند جملے جو زبانوں پہ چلے آتے ہیں
آپ دہراتے ہیں ہر بار باندازِ دگر

ایک ان میں سے ہے یہ بھی کہ "ابھی وقت نہیں"
ہے اسی لفظ کی تشریح بالفاظ دگر

آج یہ لفظ "مناسب" جو نیا وضع ہوا
آپ اسی لفظ کو ہر بار بنائیں گے سپر

آپ کے دائرۂ بحث کا مرکز تھا یہی
آپ کی گردشِ پیہم کا یہی تھا محور

آپ اس دام سے برسوں بھی نہ چھوٹیں گے کبھی
آپ اس کوچۂ پُرخم سے نہ ہوں گے سربر

آپ اس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی
دل سے جائے گا نہ تعلیمِ غلامی کا اثر

جب کہیں بھی کوئی پہلو سے غلامی ہو گا
ہر طرف پھر کے اسی نقطہ پہ ٹھہرے گی نظر

○

اس قدر سرد مزاج اور پھر اس پر تبرید
خوف یہ ہے کہ پہنچ جائے نہ فالج کا اثر

آپ کچھ گرم دوائیں جو گوارا فرمائیں
ہم دعا گو یہ سمجھتے ہیں کہ ہوگا بہتر

شبلی نعمانی

اِحرارِ قوم اور طفلِ سیاست

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے
احرارِ قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی

چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
گم گشتہ طریق ہے یہ کارواں ابھی

زوداعتقادیاں ہیں، تلوّن ہے، وہم ہے
ہو جاتے ہیں ہر اک سے یہ بدگماں ابھی

دل میں نہ عزم ہے نہ ارادوں میں ہے ثبات
جھیلے نہیں یہ معرکۂ امتحاں ابھی

بے اعتدالیاں ہیں ادائے کلام میں
باہر ہے اختیار سے ان کی زباں ابھی

ہردم ہیں گو مسائلِ ملکی زبان پر
ان میں سے ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی

○

یہ سب بجا درست، مگر سچ جو پوچھیے
جو کچھ کمی ہے، یہ ہے اثرِ رفتگاں ابھی

یہ ہے اسی سیاستِ پارینہ کا اثر
گو شمع بجھ چکی ہے مگر ہے دھواں ابھی

موزوں نہیں ہے جنبشِ اعضا تو کیا عجب
شب کے خمار کی ہیں یہ انگڑائیاں ابھی

چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں اک اک قدم پہ پاؤں
چھوٹے ہیں قیدِ سخت سے یہ خستہ جاں ابھی

بیکار کر دیے تھے جو خود بازوئے عمل
گو کھینچتے ہیں پر نہیں کھنچتی کماں ابھی

آئے کہاں سے قوتِ رفتار پاؤں میں
کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بندِ گراں ابھی

غوں غاں ہے، کچھ مباحثِ ملکی نہیں ہیں یہ
اک طفل ہے سیاستِ ہندوستاں ابھی

تفرقۂ حق و باطلؔ

احرار اور، مدعیانِ وفا ہیں اور
دونوں کا ہے طریقۂ سود و زیاں الگ

دونوں کا منتہائے نظر ہے جو مختلف
ہے خود بخود ہر ایک کا طرزِ بیاں الگ

اس پر بھی صاف صاف نہ تھا امتیازِ حق
کھلتا نہ تھا کہ کون الگ ہے؟ کہاں الگ

دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اٹھا دیا
قائم ہوا جو معرکۂ امتحاں الگ

اب صاف ہوگیا حق و باطل کا امتیاز
اب فصلِ نوبہار الگ ہے خزاں الگ

اب آفتابِ صدق گہن سے نکل گیا
اب شمع دل فروز الگ ہے دھواں الگ

وہ اختلاطِ دُرد و مئے صاف اب نہیں
گم گشتگانِ راہ سے ہے کارواں الگ

جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار
کھولیں گے اب وہ ملک میں اپنی دکاں الگ

یہ مختصر فسانۂ بزمِ شبینہ ہے
سنئے گا "الہلال" میں یہ داستاں الگ

ؔ بعض مسلم رہنما حکومت اور مسلمانوں کے درمیان ملاپ کرانے کے خیال سے ۲۵ راپریل ۱۹۱۴ء کو "حزب الاحرار" کی سرگردگی میں ایک وفد وائسرائے کے پاس لے گئے اور وفد نے مسجد کانپور کے تصفیہ میں صلح کے شکریہ اور مسلمانوں کی وفاداری کا ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ احرار کی دوسری جماعت کے ارکان کو اس طریقۂ کار سے اختلاف تھا چنانچہ انھوں نے وفد میں شرکت نہیں کی۔ یہ نظم اسی واقعہ سے متعلق ہے۔

پہلی جنگِ عظیم اور ہندستانی

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں

برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں

باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل
آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں

میں نے کہا غلط ہے ترا دعوئے غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں

سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں

"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

درگا سہائے سرورؔ جہان آبادی

گلزارِ وطن

پھولوں کا کنج دل کش بھارت میں اک بنائیں
حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں

پھولوں میں جس چمن کے بو بوئے جاں نثاری
حب وطن کی قلمیں ہم اس چمن سے لائیں

خونِ جگر سے سینچیں ہر نخل آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں

ایک ایک گل میں پھونکیں روحِ شمیم وحدت
اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں

فردوس کا نمونہ اپنا ہو کنج دل کش
سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں

چھایا ہوا برِ رحمت کا شانۂ چمن میں
رم جھم برس رہی ہوں چاروں طرف گھٹائیں

مرغانِ باغ بن کر اڑتے پھریں ہوا میں
نغمے ہوں روح افزا اور دلربا صدائیں

حبِّ وطن کے لب پر ہوں جانفزا ترانے
شاخوں پہ گیت گائیں پھولوں پہ چہچہائیں

چھائی ہوئی گھٹا ہو موسم طرب فزا ہو
جھونکے چلیں ہوا کے اشجار لہلہائیں

اس کنج دل نشیں میں قبضہ نہ ہو خزاں کا
جو ہو گلوں کا تختہ، تختہ ہو اک جناں کا

بلبل کو ہو چمن میں صیاد کا نہ کھٹکا
خوش خوش ہو شاخ گل پر غم ہو نہ آشیاں کا

حبِّ وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں
لہجہ جدا ہو گرچہ مرغانِ نغمہ خواں کا

ایک ایک لفظ میں ہو تاثیر بوئے اُلفت
انداز دل نشیں ہو ایک ایک داستاں کا

مرغانِ باغ کا ہو اس شاخ پر نشیمن
پہنچے نہ ہاتھ جس تک صیاد آسماں کا

موسم ہو جوش گل کا اور دن بہار کے ہوں
عالم عجیب دل کش ہو اپنے گلستاں کا

مل مل کے ہم ترانے حبِّ وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

درگا سہائے سرور جہان آبادی

عروسِ حُبِّ وطن

آ اے عروسِ حبِّ وطن! میرے بر میں تو
آنکھیں تری تلاش میں ہیں محو جستجو

زانو ہو تیرا اور سرِ شوریدہ سر میرا
میرا مشامِ جاں ہو تری زلف مشکبو

تیری شرابِ عشق کا آنکھوں میں ہو سرور
خلوت میں ہو نہ ذکرِ مئے و شیشہ و سبو

ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں
اس کے لئے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو

جلوہ نہ ہو کسی مِس رعنا کا سامنے
وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

درگا سہائے سرور جہان آبادی

بدنصیب بنگال

آہ اے بنگال آلام و مصائب کے شکار — آہ اے کرزن کی پالیسی کے صید بیقرار
آہ اے نخچیرِ ناوک خوردۂ دستِ اجل — آہ اے خونیں جگر خونیں کفن خونیں مزار
آہ اے محنت کش و حرماں نصیب و دردمند — آہ اے برگشتہ ایام و پریشاں روزگار
مل گئیں تیری وفائیں خاک میں سب ہائے ہائے — ہوگیا حکام کی نظروں میں تو بے اعتبار
کرکے دو ٹکڑے کلیجے کے ترے یہ آہ کون — چلدیا تجھکو تڑپتا چھوڑکے بیگانہ وار

کرزنِ بیداد خو، اہل پولس، حکام وقت
تو ہوا اُف! اُف!! نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار

برٹش راج

بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشین برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے

جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل ہیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے

نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے
تمھاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

طرح طرح کے بنالو لباس رنگارنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی اور دول بھی ہے

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ محو دید ہے خاطر اگر ملول بھی ہے

اندھیری رات میں جنگل میں ہے عیاں انجن
کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے

شگفتہ پارک ہیں ہر سمت رہروؤں کے لئے
نظر نواز ہے پتی حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبرؔ
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اسکے ڈیم فول بھی ہے

جلوۂ دہلی دربار

سر میں شوق کا سودا دیکھا   دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا   کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

○

نظم ہے مجھ کو بادۂ صافی   شغل یہی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی   خیر اب دیکھیے لطف قوافی

○

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا   اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا   حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

○

پلٹن اور رسالے دیکھے   گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے   بینڈ بجانے والے دیکھے

○

خیموں کا اک جنگل دیکھا   اس جنگل میں منگل دیکھا
برمھا اور ورنگل دیکھا   عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

○

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری   پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری   تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

○

کچھ چہروں پر مردی دیکھی　　کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی　　دل نے جو حالت کردی دیکھی

○

ڈالی میں نارنگی دیکھی　　محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی　　دہر کی رنگا رنگی دیکھی

○

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا　　بھیڑیں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا　　دل دربار سے اٹکا دیکھا

○

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم　　ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زرّیں جھولیں نور کا عالم　　میلوں تک وہ چم چم چم چم

○

پُر تھا پہلوئے مسجد جامع　　روشنیاں تھیں ہر سُو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع　　سب کے سب تھے دید کے طامع

○

سُرخی سڑک پر کُٹتی دیکھی　　سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتشبازی چھٹتی دیکھی　　لطف کی دولت لُٹتی دیکھی زمفت

○

چوکی اِک چوکھی دیکھی　　خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی　　شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

○

ایک کا حصّہ منّ و سلوا　　ایک کا حصّہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا　　میرا حصّہ دور کا جلوا

○

اوج برٹش راج کا دیکھا — پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا — رُخ کرزن مہراج کا دیکھا

○

پہنچے پھاند کے سات سمندر — تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر — اپنی جگہ ہر ایک سکندر

○

اوج بخت ملاقی اُن کا — چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا — آنکھیں میری باقی ان کا

○

ہم تو اُن کے خیر طلب ہیں — ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
اُن کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں — سب سامانِ عیش و طرب ہیں

○

اگزیبیشن کی شان انوکھی — ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی — من بھر سونے کی لاگت سوکھی

○

جشنِ عظیم اس سال ہوا ہے — شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے — قصّۂ ماضی حال ہوا ہے

○

ہے مشہور کوچہ و برزن — ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائر ہوش تھے سب کے پرزن — رشک سے دیکھ رہی تھی ہرزن

○

گو رقّاصۂ اوج فلک تھی — اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی — بزم عشرت صبح تلک تھی

حسرت موہانی

دیکھئے کب تک رہے

رسمِ وفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حبِ وطن محوِ خواب دیکھئے کب تک رہے

دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ شرم و حجاب دیکھئے کب تک رہے

تا بہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزمِ حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

حسرت موہانی

چکّی کی مشقّت

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقّت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھُل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی

دشوار ہے رندوں پر انکارِ کرم یکسر
اے ساقیٔ جاں پرور کچھ لطف و عنایت بھی

رکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمت بے تابی
یاں نالۂ مضطر کی جب مجھ میں ہو قوت بھی

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی حیرت بھی

ہر چند ہے دل شیدا حرّیت کامل کا
منظورِ دعا لیکن ہے قید محبّت بھی

ڈاکٹر محمد اقبال

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ڈاکٹر محمد اقبال

ہندستانی بچوں کا قومی گیت

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سُنایا ‏ نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا ‏ جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا ‏ سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ‏ ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے ‏ پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لَے سُنی تھی دنیا نے جس مکاں سے ‏ میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بندے کلیمؑ جس کے پربت جہاں کے سینا ‏ نوحِ نبی کا آ کر ٹھیرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا ‏ جنّت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ڈاکٹر محمد اقبال

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن اگر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنے سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاک دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آب یاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

سب سُور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے　　اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے　　فردوس گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں　　کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں　　پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا　　دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا　　اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صور حبِ قومی اس خواب سے جگا دے　　بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے　　اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک　　رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک　　ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا　　آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا　　تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

فریادِ قوم

ہے آج اور ہی کچھ صورتِ بیاں میری   تڑپ رہی ہے دہن میں مرے زباں میری
چھدیں گے قلب و جگر تیر ہے فغاں میری   لہو کے رنگ میں ڈوبی ہے داستاں میری
مبالغہ نہیں تمہیدِ شاعرانہ نہیں
غریب قوم کا ہے مرثیہ فسانہ نہیں

وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز   ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو ملک کے ہمدرد قوم کے دمساز   ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز
وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا
"ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا"

جو مٹ رہے ہیں وطن پر یہ ہے صدا ان کی   لہو ٹپکا رہا ہے یہ ہے وفا ان کی
بندھی ہے عالمِ تہذیب میں ہوا ان کی   غضب کی جا ہے جو گردن جھکے ذرا ان کی
تمھارے دل میں نہ الفت کی ہوک اُٹھے افسوس
وطن کا قافلہ پردیس میں لٹے افسوس

ٹرینسوال کے حاکم وفا شعار نہیں   کچھ ان کے قول کا دنیا میں اعتبار نہیں
ہماری قوم پہ احساں کا ان کے بار نہیں   یہ ظلم کیوں ہے ہم ان کے گنہگار نہیں
اگر وہ دولت برطانیہ کے پیارے ہیں
تو اہل ہند اسی آسماں کے تارے ہیں

مگر جفا سے نہیں ظالموں کو مطلق عار — اُجاڑتے ہیں وہ بستی جو تھی کبھی گلزار
جہاں خوشی کے ترانوں کا گرم تھا بازار — سنائی دیتی ہے واں بیڑیوں کی اب جھنکار

کیا ہے بند مسافر سمجھ کے راہوں کو
پنہائی جاتی ہے زنجیر بے گناہوں کو

نصیب چین نہیں بھوک پیاس کے مارے — ہیں کس عذاب میں ہندوستان کے پیارے
تمھیں تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے — وہاں بدن سے رواں ہیں لہو کے فوارے

جو چپ رہیں تو ہوا قوم کی بگڑتی ہے
جو سر اٹھائیں تو کوڑوں کی مار پڑتی ہے

اگر دلوں میں نہیں اب بھی جوش غیرت کا — تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزت کا
وفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا — جنازہ لے کے چلو قوم و دین و ملت کا

نشاں مٹا دو امنگوں کا اور ارادوں کا
لہو میں غرق سفینہ کرو مرادوں کا

کہاں ہیں ملک کے سرتاج قوم کے سردار — پکارتے ہیں مدد کے لئے در و دیوار
وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار — زمین ہلتی ہے اُڑتا ہے خون بن کے غبار

جگہ سے اپنی ہے چتوڑ کی زمیں سرکی
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی

اگر نہ قوم کے اس وقت بھی تم آئے کام — نصیب ہوگا نہ مرنے پہ بھی تمھیں آرام
یہی کہے گا زمانہ کہ تھا برائے نام — وہ دھرم ہندوؤں کا وہ حمیتِ اسلام

ذرا اثر نہ ہوا قوم کے جیبوں پر
وطن سے دور چھری چل گئی غریبوں پر

جو دب کے بیٹھ رہے سر اٹھاؤ گے پھر کیا — عدوئے قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا و جور کی ذلت مٹاؤ گے پھر کیا — تم اپنے بچوں کو قصے سناؤ گے پھر کیا

رہے گا قول یہی ان سے ان کی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمھاری ہے بے حیاؤں کا

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے   نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے   نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

نوٹ :- یہ نظم جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی جو ٹرانسوال کے حکام کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے عاجز اور پریشان تھے حالت زار سے متاثر ہو کر کہی گئی ۔ گاندھی جی ان غریب الوطنوں کی حالت کو سدھارنے میں دل و جان سے مصروف تھے ۔ چنانچہ یہ نظم ایک رسالے کی شکل میں شائع کی گئی اور اسے گاندھی جی کے نام اس طرح معنون کیا گیا :-

بخدمت فدائے قوم مسٹر کرم چند گاندھی

نثار ہے دلِ شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے نام ترا نقش اس نگینے پر

چکبست لکھنوی

برج نرائن چکبست

کرزن سے جھپٹ[1]

وہ شبِ تار میں تاروں کا فلک پر جمگھٹ
چھپ گیا آنکھ سے بدلی جو زمیں نے کروٹ

دیکھنا شرق میں وہ صبح کا تارا چمکا
وہ عروسِ سحر نور نے اُلٹا گھونگھٹ

بڑھ کے رضواں نے وہ جنت کے دریچے کھولے
آئی وہ گلشنِ فردوس سے پھولوں کی لپٹ

چونک اٹھا پیرِ فلک بانگ لگائی ایسی
مرغ نے گربۂ مسکیں کی جو پائی آہٹ

گدگدایا نسیمِ سحری نے آ کر
ناز سے سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ

نظر آتا ہے گلستاں میں پرستاں کا سماں
گل کھلے ہیں کہ ہے پریوں کا چمن میں جمگھٹ

یہ بہارِ چمنستاں یہ سحر کا عالم
ہاں ذرا بادۂ گلرنگ تو لانا جھٹ پٹ

ہاں وہ مے ہو کہ جو مل جائے کہیں تھوڑی سی
شیرِ مادر کی طرح شیخ بھی پی لے غٹ غٹ

دیکھنا لے کے صراحی مرا ساقی آیا
جام میں بادۂ گلرنگ دیا اس نے اُلٹ

اب میں پیتا ہوں لبوں تک مرے ساغر پہنچا
ختم مے ہو گئی لو حلق سے اتری تلچھٹ

آ گیا جوش طبیعت میں بڑھی گردشِ خوں
ڈورے آنکھوں کے ہوئے لال پھری گرماہٹ

نشہ میں چور ہوں اور سوجھتی ہے دور کی اب
ڈر ہے کرزن سے نہ ہو جائے کہیں مجھ سے جھپٹ

لیجیے سامنے میرے ہے شبیہِ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ

---

[1] کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر لارڈ کرزن نے اپنی تقریر میں ہندوستانیوں کی تہذیب و اخلاق پر بہت ہی ناروا حملے کیے تھے، اس واقعہ سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی گئی اور اخبار اودھ پنچ لکھنؤ میں شائع ہوئی۔

سرخ غصے سے کبھی زرد کبھی صدمے سے   خوف کے مارے کبھی رنگ میں ہے نیلاہٹ
آئے ہیں آپ تو کچھ حضرتِ کرزن سنئے   آپ اگر منہ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منہ پھٹ
آ گیا طیش مجھے دل کا نکالوں گا بخار   صاف کہتا ہوں نہیں بات میں اپنے ہونٹ
مانئے گا نہ بُرا آدمی ہیں آپ شریف   عالمِ نشہ میں بَک جاؤں اگر کچھ سٹ پٹ
ہاں یہ کیوں آپ کے گم ہو گئے ہیں ہوش و حواس   کنووکیشن میں یہ دکھلائی ہے کیا جھلاّہٹ
گل فشانی کے عوض دور کیا دل کا بخار   خوب کھینچا سراحباب پہ کوڑا کرکٹ
دیں صلاحیں ہمیں کس رنگ کی ماشاءاللہ   خوب ہم جانتے ہیں آپ ہیں جیسے نٹ کھٹ
گالیاں کس لئے در پردہ سُنائیں ہم کو   ناچنے نکلے تو پھر منہ پہ یہ کیسا گھونگھٹ
یاد رہ جائے گی لیکن ہے وہ ٹھوکر کھائی   توسنِ طبع کو اب پھر نہ اڑانا سرپٹ
اہلِ بنگال نے کیا خوب کیا ہے حملہ   کر تری فوج مضامین نے کھایا گھونگھٹ ۵
منہ دکھانا تجھے واجب نہیں کلکتہ میں   اب مناسب ترے رہنے کے لئے ہے جنہٹ
پانیر تک کو نہ خوش آئی تری زیٹ زپٹ   خوب بوچھار ہوئی چار طرف سے تجھ پر
کانگرس والے تو کیا خوش نہیں تجھ سے دل میں   دشمنِ ملک، علی گڈھ کے پُرانے کھوسٹ
تاج وقعت کا اُٹھا سر سے ترے چلتے وقت   بے چراغ آئے نظر صبح کو جیسے دیوٹ
جس سے ناشاد رعایا ہے وہ ہے دَور ترا   کر دیا ملک کو اس پانچ برس میں چوپٹ
بس ترا چل نہ سکا قحط و وبا سے کچھ بھی   شہر ویران ہیں آباد ہوئے ہیں مرگھٹ
اب مناسب ہے یہی کیجئے پنجرا خالی   ہم بھی خوش آپ بھی خوش دور کہیں ہو جھنجھٹ
تو ہو جانے پہ جو راضی تو قسم سر کی ترے   کر کے چندہ تجھے ہم لے دیں ولایت کا ٹکٹ
اور جو تجھ کو نہیں منظور یہ احساں لینا   بھیج دیں ہم تجھے بیرنگ بنا کر پیکٹ
یہی اقرار، یہی قول، یہی وعدہ تھا   او! سخن ساز، دغا باز، فسونگر نٹ کھٹ
پھونک ڈالے تری اسپیچوں کے بنڈل ہم نے   اب کی ہولی میں جلائے نہیں چیلے بنکٹ
چیمبرلین سے اُستاد کا شاگرد ہے تو   یاد ہیں مِل کے مقولے نہ اصولِ بیکٹ
کونسل کے جو ترے ممبر سرکاری ہیں   وہ بھی کمبخت ہیں چور کے ساتھی گٹھ کٹ

---

۵ لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ ہے جہاں ۱۸۵۷ء کی ایک لڑائی میں انگریزوں کو شکست ہوئی تھی۔

یا الٰہی یہ چلی بادِ مخالف کیسی — آ گیا اُڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ
ہیں مگر ملک میں دو چار تہمتن یاں بھی — آستیں تیرے مقابل ہیں جو لیتے ہیں اُلٹ
یاد رکھ حشر تلک بھی نہ تجھے بھولے گی — گوکھلے کی وہ جھتھاڑ اور مہتا کی ڈپٹ
چل یہاں سے تو ولایت میں خبر لیں گے تری — چین سے رات کو سوئے گا نہ تو اک کروٹ
دادخواہوں کا تو بس ہے وہی دربار عظیم — پارلیمنٹ میں لکھوائیں گے ہم تیری رپٹ
بچ گیا واں بھی تو پھر حشر میں ہوگا انصاف — کام آئے گی خدا سے نہ تری زیٹ زپٹ
تالیاں پیٹیں گے رسوائی پہ تیری مظلوم — دیدنی ہوگی قیامت میں تری گھبراہٹ
اب بھی آ ہوش میں اندازِ حکومت کو بدل — مرد ہو کے تجھے واجب نہیں یہ تریاہٹ
سوچ انجام کو اک روز ہے سب کو مرنا — ہے نمک خوار ہمارا تو نہ کر ہم سے کپٹ
بیٹھ کرسیٔ وزارت پہ سنبھل کر پیارے — آہ مظلوم نے شاہوں کے دیئے تخت اُلٹ
اب مرا نشہ اُترتا ہے میں ہوتا ہوں خموش — بس ترے واسطے کافی ہے یہی سرٹیفکٹ
آگیا ہوش مجھے کھل گئیں آنکھیں لیکن — اب وہ کرزن نظر آتے ہیں نہ وہ ان کا چرٹ

○

میرے مولا مری بگڑی کے بنانے والے — تو ہی تقدیر اب اس خطۂ بیکس کی پلٹ

○

بس زباں اب نہ ہو تو معرکہ آرائے سخن — رشک سے مرقدِ سودا نہ کہیں جائے پلٹ
اے عروسِ سخن اللہ رے جوبن تیرا — لاٹ صاحب کو بھی ناتھے ہے تری زلف کی لٹ

حضرت پنچ سے بگڑیں گے تو بن جائیں گے
لاٹ صاحب کو مناسب نہیں یاں گھبراہٹ

خاکِ ہند

انجم سے بڑھ کے تیرا ہر ذرّہ ضو فشاں ہے
جلووں سے تیرے اب تک حُسنِ ازل عیاں ہے
انداز دل فریبی جو تجھ میں ہے، کہاں ہے
فخرِ زمانہ تو ہے اور نازشِ جہاں ہے
اُفتادگی میں بھی تو ہم اوجِ آسماں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

وہ کج کلاہ تیرے، وہ شور بیر تیرے
وہ تیغ زن کماں کش، وہ قلعہ گیر تیرے
ناپید آج ہیں گو تاج و سریر تیرے
شاہوں سے ہیں زیادہ لیکن فقیر تیرے
پستی میں سر بلندی سب پر تری عیاں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

منظر وہ جاں فزا ہیں اور دل پذیر تیرے
جانیں ہیں تجھ پہ شیدا اور دل اسیر تیرے
شیرین و صاف دریا ہیں جوئے شیر تیرے
ہیں دشت و کوہ و صحرا جنّت نظیر تیرے
آنکھیں جدھر اُٹھاؤ فردوس کا سماں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

تجھ کو مٹا دیا ہے ہر چند آسماں نے پھونکا ہے آہ! دل کو سوزِ غمِ نہاں نے
چھوڑی نہ تاب اپنی پر حسنِ دل ستاں نے جوہر بھرے ہیں تجھ میں صنّاعِ دو جہاں نے

فصلِ خزاں ہے تیری، پھر بھی تو گل فشاں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

گو حد سے بڑھ گیا ہے رنج و ملال تیرا اب تک مٹا نہیں ہے نقشِ جمال تیرا
آخر کبھی تو ہوگا ظاہر کمال تیرا ہوگا کبھی تو آخر دورِ زوال تیرا

کب اک روش پہ قائم یہ دورِ آسماں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

تاریخ تباہیٔ انگریز

آں قومِ بہانہ جو نصارا — ظالم بہ نہان و آشکارا
فرمان دہِ ہند گشتہ بودند — از حدِ ادب گذشتہ بودند
ناگاہ عذابِ حق رسیدہ — از اوج بخاک در کشیدہ
یعنی ہمہ فوج و لشکرِ او — گردید عدوے پیکرِ او
در ماہِ صیام گشت ناگاہ — قتل و قمعش بحکم اللہ
اکثر شدہ ازاں گروہ فی النار — مفرور شدند نیز بسیار
تاراج شدہ خزانۂ شاں — یکبار بسوخت خانۂ شاں
در بنگلہ و کمرہ آتش افتاد — شد مال و منال جملہ برباد
آں لشکرِ غازیانِ جرار — آمد بحضور شاہ دیندار
یعنی کہ ابوظفر شہِ دیں — مقبولِ خدا شریعت آئیں
شد لشکر و ملک تابعِ او — باز آمدہ آبِ رفتہ در جو
حاضر شدہ بخت خاں بہادر — در حشمت و جاہ شد تکاثر
تاریخ تباہیٔ نصارا — خواہم کہ نمایم آشکارا
فرمود خرد کہ اے سخن گو — انگریز تباہ شد بہر سو

سنہ ۱۲۷۳ ھج

؎ یہ نظم فارسی کی ضرور ہے لیکن جنگ آزادی کی ابتدائی فتوحات کا سب سے زیادہ واضح بیان اسی نظم میں ملتا ہے اس لئے اسے یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ مختصر سے تغیر الفاظ کے ساتھ یہ نظم "صادق الاخبار" دلی کی اشاعت مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۵۷ء میں شائع بھی ہوئی تھی۔ یہ نظم بعد میں دستیاب ہوئی اس لئے اسے آخر میں شامل کرنا پڑا ہے۔

اُردو میں

قومی شاعری

کے

سَو سال

سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک

مغربی قوموں کا فلسفہ

مہذب جنھیں آج کہتی ہے دنیا　　اُن اقوام ہی نے یہ آئین نکالا
جو منظور ہے امن ہو اس جہاں میں　　نہ جانے کوئی جنگ کو اس جہاں میں
تو تم جنگی طاقت کو اپنی بڑھاؤ　　جہاں تک بنے، توپیں گیسیں بناؤ
ہوا پر سمندر میں اور اس زمیں پر　　کرو قتل و غارت کے سامان یکسر
جو تیار ہو جاؤ اس طرح سب تم　　تو ہو جائے گی جنگ ہی دہر سے گم
مدبر یہ مغرب کے کہتے ہیں ہم سے　　جہانگیر ہو امن توپ اور بم سے
یہ مغرب کی قوموں کا جو فلسفہ ہے　　اسی پر عمل ہر ریاکار کا ہے
کسی نے بدی تم سے کی یا نہ کی ہو　　بدی تم کرو اس سے ہو سکتی ہو جو

غرض یہ کہ تم سے ڈریں لوگ سارے
کرو داؤں پہلے تو ہیں وارے نیارے

پیامِ وفا

ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے جیسے برسوں کا مریض اُٹھتا ہی بیماری سے
قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے چاندنی پھیل گئی حُسنِ وفاداری سے
تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نور ہے محفل بھر میں

حکم حاکم کا ہے فریادِ زبانی رُک جائے دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رُک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رُک جائے پر یہ ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رُک جائے
ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشہ یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہر دل میں ٹھنی
مادرِ ہند کی تصویر ہو سینے پہ بنی بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور گلے میں کفنی
ہو یہ صورت سے عیاں عاشقِ آزادی ہیں
قفل ہے جن کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

آج سے شوقِ وفا کا یہی جوہر ہوگا فرش کانٹوں کا کہیں پھولوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جائے گا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا
سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

ے یہ نظم جس کے چند بند یہاں دیے گئے ہیں ۱۹۱۷ء میں مسز بسنت کی گرفتاری پر "مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیام وفا" کے عنوان سے کہی گئی۔

وطن کا راگ

زمینِ ہند کی رتبے میں عرشِ اعلیٰ ہے　　یہ ہوم رول کی اُمید کا اُجالا ہے
مسز بسنٹ نے اس آرزو کو پالا ہے　　فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے　　ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد دُکھ اُٹھائیں گے　　یہی پیامِ وفا قوم کو سُنائیں گے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے　　وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں درد و رنج سہنا ہے　　مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے　　خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے　　یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی پیام ہے کوئل کا باغ کے اندر اسی ہوا میں ہے گنگا کا زور آٹھ پہر
ہلالِ عید نے دی ہے یہی دلوں کو خبر پکارتا ہے ہمالہ سے ابر اُٹھ اُٹھ کر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر وطن کا پاس ہے ان کو سہاگ سے بڑھ کر
جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے ان کے سینہ پر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہوم رول

خوشی سے منتظر رہو اگرچہ ہو ملول ہی　　زمانہ اس میں جتنا چاہے کھینچ جائے طول ہی
ملے گا کچھ تمہیں ضرور گو کہ ہو فضول ہی　　مگر یہ کیا ضرور ہے کہ ہو وہ ہوم رول ہی

ہزار آسمان اپنے سر پہ تم اٹھاؤ گے
جو آج تک ملا کیا اسی طرح تو پاؤ گے

جو ڈپٹی بھی مل گئی کلکٹری بھی پا گئے　　وہ کیسی ہی ہو کونسلوں کی ممبری بھی پا گئے
سوار سے رسالدار میجری بھی پا گئے　　لڑے بھڑے بغیر خان بہادری بھی پا گئے

تمہیں بتاؤ اور اس سے بڑھ کے تم کو کیا ملے
یہی کسر ہے مانگنے پہ اب تمہیں سزا ملے

بہادران یورپ اور تمہاری ہم سری نہیں　　یگانگی و غیریت میں کچھ برابری نہیں
تم اتنے باوفا نہیں تم اس قدر جری نہیں　　کوئی بھی تم میں واقفِ فنِ سپہ گری نہیں

کمیشن افسری میں پھر نہ کس طرح کلام ہو
ہزار ہو پڑھے لکھے مگر وہی غلام ہو

یہ فخر کم نہیں کہ گورے کالے ایک ساتھ تھے　　ولایتی و دیسی لڑنے والے ایک ساتھ تھے
غلام اور اختیار والے ایک ساتھ تھے　　جفاکش اور نعمتوں کے پالے ایک ساتھ تھے

عروج یہ لکھا تھا انڈیا کی سرنوشت میں
گناہ گار تم سے اور فرانس کی بہشت میں؟

اسی عطا پہ جان دو اگرچہ حق شناس ہو ادائے شکر، یوں کرو جو خارج از قیاس ہو
نثار کر دو مال و زر جو کچھ تمہارے پاس ہو خوشی سے کٹ مرو، تمام بنس چاہے ناس ہو
نہ فکر دل میں کچھ کرو نمود و نام کے لئے
یہ حق ہے ان کا جو بنے ہیں انتظام کے لئے

پڑھے لکھے کہ جن کی عقل ہو کسی قدر رسا جو چست کھیل کود میں ہوں جسم ہو ذرا کسا
نہ یہ خیال بھی کریں کہ کیسی ہے گرہ دسا نہ سوچیں اور بچاریں کچھ وہ چھوڑیں جلد مدرسا
ذرا بھی ویکٹ[*] ہوں اگر ایم اے، بی اے کے کورس میں
لکھا دیں نام جھٹ سے انڈین ڈفنس فورس میں

وفا کا امتحان تھا، بطورِ قرض جو لیا وگرنہ بادشاہ کی مدد کرے گا کیا گدا
عطا کا جوش تھا جو ساڑھے پانچ فیصدی دیا غرض جو کچھ کیا تمہارے نفع کے لئے کیا
خود اپنے نفع کے لئے سمجھ کے اپنا فرض دیں
یہ مفلسوں کو چاہئے کہ قرض لے کے قرض دیں

اگر تمہیں خیال ہو کہ آخر اس کی وجہ کیا کبھی شروعِ جنگ میں بھی ہم سے کچھ کہا سُنا
لڑا تو یورپ اور اس کا بار ہند پر پڑا یہ شکوہ اب فضول ہے کہ جب شریک کر لیا
اسی لئے کہ اس طرح تو مل کے بوجھ اُٹھاؤ گے
نہیں تو بعد جنگ کے ضرور فیل لاؤ گے

وہ جنگ امن و عیش کے لئے جو اک عذاب ہو وہ جنگ جس سے جلب منفعت کا سدِ باب ہو
وہ جنگ جس کو اپنے دوستوں کا گھر خراب ہو یہ فکر ہے کسی طرح سے جلد کامیاب ہو
تمھیں بتاؤ کام کیا چلے گا عذرِ لنگ سے
قلی بنو اگر تمھیں نہیں ہے بہرہ جنگ سے

تمہارے جو وکیل تھے انھیں کا ہے یہ تجربا کہ جتنا تم کو چاہئے تھا وہ ابھی نہیں کیا
اسی پہ دعوۂ وفا اسی پہ شکوہ اور گلا مدد کے نام صفر اور طلب میں اتنا حوصلا

---

[*] کمزور

خوشی سے جا کے جان دی نہ معرکہ میں سر دیا
نہ گھر کو بیچ باچ کے کسی نے مال و زر دیا

خلاف کیوں نہ ہو تمھارا بار بار مانگنا
اور اس پہ دل لگی کہ شیر سے کچھار مانگنا
تمھیں بتاؤ کس طرح سے ہو نہ بار بار مانگنا
یہ کس نے تم سے کہہ دیا کہ اختیار مانگنا

کبھی جو کوئی سر چڑھائے اس کا بال کاٹ لو
دکھانے کو جو چومے منہ تو بڑھ کے گال کاٹ لو

جو چیز ہضم ہو گئی پھر احتیاج قے نہیں
اُتر کے نشہ جس کا ہو خمار یہ وہ مے نہیں
جو بھیک مانگ کر ملے حکومت ایسی شے نہیں
یہ تان بے سری ہے ایسی جس میں کوئی لے نہیں

وہ شے زمانے بھر کی دقتوں سے جس کو لے کوئی
تمھیں بتاؤ ٹھنڈے دل سے کیونکر اس کو دے کوئی

سروں پہ بھوت ہوم رول کا جو یہ سوار ہے
ہلا ہلا کے سر ہر ایک جس سے بے قرار ہے
اتارنے کا عاملوں کو گو کہ اختیار ہے
مگر کچھ ایسا تجربے پہ اُن کو اعتبار ہے

اِدھر تو شور و غل تمام اُدھر فقط سکوت ہے
کہ جانتے ہیں خود سے بھاگ جائے گا وہ بھوت ہے

دماغ پر زیادہ جن کے ہو گیا تھا کچھ اثر
یہ جن پر اشتباہ تھا کہ پھوڑ لیں نہ اپنا سر
الگ تھلگ بٹھا دیا انھیں حصار کھینچ کر
سُنی نہ ایک کی بہت کیا کئے اگر مگر

سوال پر یہ کہہ دیا یہی علاج ٹھیک ہے
اسی عمل سے اب مریض کا مزاج ٹھیک ہے

جو دیکھتے ہو جاگتے میں آج کل وہ خواب ہے
نتیجہ اس کا خود تمھارے واسطے خراب ہے
تمھارے حوصلوں کی کوئی حد ہے کچھ حساب ہے
تمھارا بر محل سوال کتنا لاجواب ہے

خلافِ وقت چھیڑ دیں یہ کش مکش فضول کی
کسی کو دُھن ہے جنگ کی کسی کو ہوم رول کی

تمھارا جوش جس قدر ہے دودھ کا اُبال ہے
ارادہ مستقل رہے بھلا یہ کیا مجال ہے
جو پڑ چکیں ہیں عادتیں وہ چھُٹ سکیں محال ہے
جو کل تھا یہ بتاؤ آج بھی وہی خیال ہے

تمھیں تو جانتے ہیں ہم اسی سے ہول اور ہے
تمھارا فعل اور ہے تمھارا قول اور ہے

زباں سے قابلیت اپنی خوب ہی جتاؤ گے — کمیٹیاں کرو گے روز اور غل مچاؤ گے
تمھیں بناؤ گر کوئی نہ دے تو کیا بناؤ گے — جو دینے والا ہاتھ اٹھا کے دے وہی تو پاؤ گے
بقدر شوق یونیورسٹی بہم نہ لے سکے
وہ ہاتھ تیغ لیں گے کیا، جو اک قلم نہ لے سکے

لہو لگا کے کیوں شہید اپنا نام کیجئے — برابری کا کونسلوں میں انتظام کیجئے
سکت بڑھے کچھ آپ میں وہ اہتمام کیجئے — خود اپنے گھر کے تفرقوں کی روک تھام کیجئے
پریس ایکٹ ٹوٹے جب مطالبات کیجئے
زبان کھول لیجئے تو کوئی بات کیجئے

بہن نے مادرِ وطن کی کیا تمھیں پڑھا دیا — ذہین بھانجا سمجھ کے ایک سبق نیا دیا
غضب تو یہ کیا کہ مانگنے کا ڈھب سکھا دیا — مطالبہ کیا تو یوں کہ سب نے غل مچا دیا
وہ چیز مانگنے لگے جو عقل سے بعید ہو
کہے سنے میں آ گئے عجیب زن مرید ہو

جو مانگے ایک مانگے مل کے تم سبھی نہ مانگنا — حصول مدعا کا وقت ہو جبھی نہ مانگنا
بفرض ہو امید بھی مگر ابھی نہ مانگنا — رضا جو چاہتے ہو تم تو پھر کبھی نہ مانگنا
کوئی اگر کہے بھی یہ ملے گا سب سوال دیں
پڑھے لکھوں کا فرض ہے کہ ٹیکنکس کہہ کے ٹال دیں

وہ مادرِ وطن کہ جس کا راگ گا رہے ہو تم — وہی کہ جس کی خاک آنکھ میں لگا رہے ہو تم
وہ مادرِ وطن کہ جس کو یوں رجھا رہے ہو تم — یقین خدمتوں کا اپنی اب دلا رہے ہو تم
سمجھ کے بیٹھی ایسے گھر بگڑ کے پھر سنبھل گئی
تمھاری غفلتوں سے مادرِ وطن نکل گئی

مرض کسی کے واسطے کسی کے واسطے دوا — بھنور کسی کے واسطے کسی کے حق میں ناخدا
کسی کی نا امیدی اور یہ کسی کا عینِ مدعا — کسی کے واسطے سزا کسی کے واسطے جزا

کسی کے بارِ خاطر اور کسی جگہ عزیز ہیں
جناب ہوم رول بھی غرض عجیب چیز ہیں

ظریؔف اپنا قصد ہے جو کچھ وہ تم سے کیا کہیں
نہ مانگیں خود سے اپ خودی کی یہ سمائی ہٹیں
گرا پڑا اگر ملے تو ہوم رول ہم نہ لیں
ہمیں اُبالی بھاتی ہے یہ کہہ کے جھٹ سے پھینک دیں

• یہ مادرِ وطن کے پوت قسمتوں کو روئیں گے
جو مل بھی جائے ہوم رول لڑ جھگڑ کے کھوئیں گے

نوٹ :۔ ہوم رول کی تحریک کے جواب میں حکومت برطانیہ کے ہم نوا ہندستان میں جو باتیں کہا کرتے تھے اُن پر یہ شدید طنز ہے۔ بعض لوگ مقطع کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں لیکن اگر اسی نظم کا یہ مصرع ذہن میں رکھا جائے کہ ؎

جو بھیک مانگ کر ملے حکومت ایسی لیتے نہیں

تو ظریؔف کا مافی الضمیر سمجھنے میں کوئی اُلجھن نہ ہوگی۔

تلوک چند محروم

شکوۂ صیّاد

حادثہ جلیان والا باغ سے متاثر ہو کر

موسمِ گل میں جو رہ رہ کے چمن یاد آئے — ہم نوا! لب پہ نہ کیوں شکوۂ صیّاد آئے
پھر سوئے کنجِ قفس نکہتِ برباد آئے — آئے، پھر بوئے غبارِ دلِ ناشاد آئے
آتشِ حسرتِ گلگشت سوا ہوتی ہے
اُجڑے گلشن کی بھی کیا خوب ہوا ہوتی ہے

یاد ایامِ بہاراں کہ چمن تھا ہم سے — باغباں بر سرِ کیں ہم سے نہ تھا، بے غم تھے
روزنما شام و سحر عیش و طرب باہم تھے — اپنے جلسے بھی کبھی غیرتِ جشنِ جم تھے
مست صہبائے مسرّت تھے کہ آزاد تھے ہم
اُڑتے پھرتے تھے ہر اک سمت کہ دل شاد تھے ہم

تھا کمیں میں مگر اے وائے مقدر صیّاد — دشمنِ مہر، جفا پیشہ، ستمگر صیّاد
آ گیا دامِ بلا دوش پہ لے کر صیّاد — ہو گیا بہرِ چمن فتنۂ محشر صیّاد
نغمۂ بلبلِ شیدا سے فقط لاگ نہ تھی
کون سا برگ وہ تھا جس کے لئے آگ نہ تھی

خلشِ خار جنھیں زیست سے کر دیتی تنگ — ان پہ خالی کئے سفاک نے بھر بھر کے تفنگ
آزما ڈالے ہزاروں ستم و جور کے ڈھنگ — جاں ستانی میں تامل، نہ توقف، نہ درنگ
موت سے بچ کے جو اندوہِ قفس سہتے ہیں
اب وہ یوں نالہ کشِ جور و جفا رہتے ہیں

بدلے تو نے یہ لئے ہم سے بھلا کس دن کے　　ذبح کر ڈالے ہیں مرغانِ چمن گن گن کے
آشیانوں کے اُڑائے ہیں ستمگر! تنکے　　اب تری قید مصیبت میں کمیں ہیں جن کے

بے خطاؤں پہ یہ غصہ یہ عتاب اے ظالم!
کبھی دینا ہے خدا کو بھی جواب اے ظالم!

سرو شمشاد کو بے مہر اُکھاڑا تو نے　　زرِ گل دامنِ گلزار سے جھاڑا تو نے
سبزہ بیگانہ تھا، اُس کو بھی لتاڑا تو نے　　نقشۂ حُسنِ چمن آہ! بگاڑا تو نے

دل ترے سینے میں تھا پاسِ وفا سے خالی
تیرے جذبات تھے احساسِ وفا سے خالی

جل اُٹھا پھول سے کیوں؟ داغ نہاں تھا کوئی؟؟　　خار کھٹکا تری نظروں میں سناں تھا کوئی؟
کج ہوا سرو سے کیوں؟ غیر جہاں تھا کوئی؟؟　　پیکا سائے پہ عبث اس میں نہاں تھا کوئی؟

خفقاں تھا یہ ترا جس نے ڈرایا تجھ کو
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آیا تجھ کو

ہائے وہ صحنِ چمن صحبتِ یارانِ چمن　　شاہدِ بزمِ طرب وہ گل خندانِ چمن
اور وہ لالہ کہ تھا شمعِ شبستانِ چمن　　ہو گیا داغِ دلِ خانۂ ویرانِ چمن

تا سحر گاتے تھے جس باغ میں گانے والے
اب اُٹھا کرتے ہیں راتوں کو وہیں سے نالے

حکم تیرا ہے کہ فریاد نہ ہونے پائے　　کوئی بلبل کہیں آزاد نہ ہونے پائے
دہر میں شہرتِ بیداد نہ ہونے پائے　　اور مشہور یہ روداد نہ ہونے پائے

"نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے"

جلیانوالا باغ

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

ظفر علی خاں

مارشل لا

حکومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لا کی
تو قابلِ دید کے تھی اوڈوائر کی غضب ناکی

جب امرتسر میں ہم پر گولیاں برسیں تو ہم سمجھے
کہ بوندیں ہیں یہ اہلِ ہند کے خونِ تمنا کی

خدا کے قہر کی بجلی گرا کرتی ہے ظالم پر
مگر پنجاب میں اس برق کے مظلوم تھے شاکی

ہمارے بازوؤں کی دھجیاں اُڑتی تھیں گردوں تک
ہماری ٹانگ کے تسمے خبر لاتے تھے جوزا کی

یہ صورت تھی ہماری خواہ ہندو خواہ مسلم تھے
یہ حالت تھی جنابِ جارج پنجم کے رعایا کی

فریادِ جرس

کل کہہ رہے تھے ایک محبِّ وطن بزرگ
ہندوستان رہنے کے قابل نہیں رہا

انساں سے چھین لی گئی آزادیٔ ضمیر
لیلیٰ کے ناقے کے لئے محمل نہیں رہا

تھا حق کا دشنہ تیز بھی خوں ریز بھی مگر
کچھ دن سے درخورِ رگِ باطل نہیں رہا

سچ اور جھوٹ میں نہیں باقی رہی تمیز
اب امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

ہم آپ اپنی راہ کے سنگِ گراں بنے
رہرو کو فکرِ دوریٔ منزل نہیں رہا

آزادیٔ حیات کی جس دل میں تھی تڑپ
اب پہلوئے وطن میں وہی دل نہیں رہا

جو کوشش آشتی کی ہوئی رائیگاں گئی
اور کوئی اتحاد کا قائل نہیں رہا

پھر کس لئے یہ شکوہ کہ لطفِ خدائے پاک
ہندوستاں کے حال کو شامل نہیں رہا

ظفر علی خاں

فانوسِ ہند کا شعلہ

زندہ باش اے انقلاب اے شعلۂ فانوسِ ہند
گرمیاں جس کی فروغِ منتقلِ جاں ہو گئیں

بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی خاموشیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشرستاں ہو گئیں

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی
قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں

مرحبا اے نو گرفتارانِ بیدادِ فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں

زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا اُن کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں

ہندوستان

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھکو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

تہذیب ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل
یہ موج رنگ رنگ پھر آئی کہاں سے ہے

ذرے میں گر تڑپ ہے تو اس ارض پاک سے
سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے ہے

ہے اس کے دم سے گرمئ ہنگامۂ جہاں
مغرب کی ساری رونق اسی اک دکاں سے ہے

حسرت موہانی

مانٹیگو ریفارم

کس درجہ فریب سے ہے مملو — تجویزِ رفارمِ مانٹیگو
مشہور زمانہ ہیں، مسلّم، — دستور کے حسب ذیل پہلو
قانون پہ اختیار کامل — عمال پہ زور، زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی — گلہائے رفارم میں کہیں بو
کاغذ کے سمجھیے پھول ان کو — جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو
مدراس کے ڈاکٹر کا یہ قول° — کس درجہ ہے دل پذیر و نیکو
مقصود ہے صرف یہ کہ تا جنگ — ہم سب رہیں "صرفِ ایں "تگاپو"
اے ہندئی سادہ دل خبردار! — ہرگز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو

کیا پائے گا خاک پھر جب ان سے
اس وقت بھی کچھ نہ لے سکا تو

° ڈاکٹر سبرامنی آئیر۔

انقلابِ زمانہ

جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا
اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا

ناوک فگنی سے ظالم کی جنگل میں ہے اک سناٹا سا
مرغانِ خوش الحاں ہو گئے چپ آہو نے اُچھلنا چھوڑ دیا

کیوں کبر و غرور اس دَور پہ ہے کیوں دوست فلک کو سمجھا ہے
گردش سے یہ اپنی باز آیا یا رنگ بدلنا چھوڑ دیا؟

بدلی وہ ہوا گذرا وہ سماں وہ راہ نہیں وہ لوگ نہیں
تفریح کہاں اور سیر کجا گھر سے بھی نکلنا چھوڑ دیا

وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبرؔ میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

کیا دین کو قوّت دیں یہ جواں جب حوصلہ افزا کوئی نہیں
کیا ہوش سنبھالیں یہ لڑکے خود اس نے سنبھلنا چھوڑ دیا

اللہ کی راہ اب تک ہے کھُلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

وہ اور ہم

تخت کے قابض وہی دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک ان کا رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آ گیا تارِ اُمید و بیم ان کے ہاتھ میں

ہم کو سایہ پر جنوں اور وہ دھوپ میں مصروف کار
مس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے
سب کی ہے تذلیل اور تعظیم ان کے ہاتھ میں

شیخ کی جانب کوئی جاتا نہیں کہتے ہیں سب
ہے نقط اب کوثر و تسنیم ان کے ہاتھ میں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی
ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم ان کے ہاتھ میں

تاثرات

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

○

پالسی مغرب پہ مشرق پر تعصب ہے سوار
اس کو ہندو کیا کریں اس کو مسلماں کیا کریں

○

کوئی صاحب نہ ہوں للہ ناخوش سن کے یہ مصرعہ
خیالِ حبّ قومی پیچھے اور فکرِ شکم پہلے

○

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر خوشی سے پھول جا

○

انجن کو یہ آگ ہو مبارک
انگریز کو بھاگ ہو مبارک
دہلی کو سہاگ ہو مبارک
قومی ہمیں راگ ہو مبارک

○

بنے بندر سے ہم انساں ترقی اس کو کہتے ہیں
ترقی پر بھی نیٹو بدنصیبی اس کو کہتے ہیں

○

کہتے ہیں راہ ترقی میں ہمارے نوجواں حضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے

○

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

○

گولیوں کے زور سے وہ کرتے ہیں دنیا کو ہضم اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

○

آیا انجن نکل گیا زن سے سن لیا شور آگ پانی کا
علم حاضر ہمیں سکھائیں اگر تب کریں شکر مہربانی کا

ردِ سحر[1]

طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے
پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے

چاک کر سینے کو پہلو چیر ڈال
یوں ہی کچھ حالِ دلِ مضطر کھلے

لو وہ آ پہنچا جنوں کا قافلہ
پاؤں زخمی، خاک منہ پر، سر کھلے

اب تو کشتی کے موافق ہے ہوا
ناخدا کیا دیر ہے لنگر کھلے

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

---

[1] مولانا کی پہلی نظر بندی ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۷ء

اور ہی کچھ ہے

یہ جور نرالا، یہ جفا اور ہی کچھ ہے
یہ ظلم نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے

ہوں لائقِ تعزیر یہ الزام ہے جھوٹا
مجرم تو ہوں بیشک پر خطا اور ہی کچھ ہے

ہو مکر و دغا لاکھ شعارِ اہلِ ہوس کا
پر شیوۂ اخوانِ صفا اور ہی کچھ ہے

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدّار نہیں ہم
پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

یہ صدر نشینی[*] ہو مبارک تجھے جوہر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

---

[*] آل انڈیا کانگریس کی صدارت کی طرف اشارہ ہے۔

مادرِ ہند

اک ملک جو ایشیا کی ہے جاں
فردوسِ بریں ہو جس پہ قرباں

وہ قطعۂ ارض پاک و مشہور
ہم صورتِ خلد چشم بد دور

عظمت میں کنشت سے فزوں تر
خوبی میں بہشت سے فزوں تر

بتخانۂ چیں وہاں کے بازار
ہر اک مکاں، دکانِ عطار

ہر گوشہ زمیں کا رشکِ گلشن
جس نخل کو دیکھئے وہ چندن

پورب پچھم تھا معدنِ زر
دکھن اتر سے خوشنما تر

اس ارض کو زرنثار کہئے
اک قلعۂ استوار کہئے

ہر ذرہ تھا آبرو میں گوہر
ہر سنگ جواہرات پتھر

ہر نخل ہو جس کا سرو پیکر
طوطی بولے نہ اس کا کیونکر

بازارِ عدن وہاں کے رستے
پانی کے عوض گہر برستے

رنگت میں مزاج میں قوا میں
کیا ظلم و جفا میں کیا وفا میں

یہ جملہ صفات غیر محدود
اس قطعۂ ارض میں تھے موجود

خوش رنگ ہر اک شجر کے اثمار
کوزوں میں لئے نبات تیار

○

اک محتشمہ وہاں کی ساکن
اس مادرِ دہر کی تھی ہم سن

پہنچی تھی جو دور دور شہرت
پھیلی تھی جہاں میں اسکی عظمت

ذی جاہ و خجستہ کام تھی وہ — عالم میں بلند نام تھی وہ
دولت کے وفور میں تھی مشہور — خُلق و کرم و عطا سے معمور
مشہور تھا فیضِ عام اُس کا — تھا مازرِ ہند نام اُس کا
شاہوں سے زیادہ اُس کا درجہ — جتنے راجہ تھے اُس کے پرجا
ہوتا تھا بسر عجب زمانہ — ہر طرح گھر اس کا عیش خانہ
ہر گوشۂ ملک سبز و شاداب — راجہ تھا کوئی تو کوئی نواب
کالے کوسوں سے آ کے تجار — اجناس خریدتے تھے ہر بار
اس ملک کو سادہ لوح پا کے — آتے تھے جتھے بنا بنا کے
تا منزلت و وقار پائیں — رفتہ رفتہ اثر بڑھائیں
پھل پھول کا جنگلوں کے کیا مول — بک جاتے تھے وہ بھی سونے کی مول

○

اس محتشمہ کے دو پسر تھے — دونوں سے قوی دل و جگر تھے
دانا و ذکی و خوش بیاں تھے — ہر طرح سے فخرِ خانداں تھے
ایک لختِ جگر کا رامؔ تھا نام — خوشخو تھا بہت وہ نیک انجام
دلبند دوم جو نامور تھا — نام اُس کا رحیمؔ مشتہر تھا
ہر طرح سے دونوں من چلے تھے — گہوارۂ ناز میں پلے تھے
ہر شخص فریفتہ تھا اُن کا — جو دل تھا وہ شیفتہ تھا اُن کا

کہتا تھا یہ دیکھ کر زمانہ
دونوں سے ہے گھر نگار خانہ

سے ہندو مسلم

جذبۂ حرّیت

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا ہیں لے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو
کہ اپنی زندگی کو تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوزِ پنہاں سے
تری ظلمت میں مَیں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا

نہیں بے وجہ وحشت میں اُڑانا خاک زنداں کا
کہ مَیں اس خاک سے پیدا بیاباں کر کے چھوڑوں گا

شریکِ محنتِ زنداں ہوں گو یوسف صفت خود بھی
مگر تعبیرِ خوابِ اہل زنداں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ دردآشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

ابھی مجھ دل جلے کو ہمصفیرو اور رونے دو
کہ میں سارے چمن کو شبنمستاں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہمنشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبّت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی
مسلمانوں کو آخر نامسلماں کر کے چھوڑوں گا

اُٹھا دوں گا نقابِ عارضِ محبوب یک رنگی
تجھے اس خانہ جنگی پر پشیماں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو تیرا درد تھا تاکا ہے اُس نے میرے پہلو کو
تری اُفتاد نے توڑا ہے میرے دست و بازو کو

انگریزی ذہن کی تیزی

کس طرح بپا ہوں ہنگامے، آپس میں ہو کیونکر خونریزی
ہے ختم انھیں اسکیموں میں انگریزی ذہن کی سب تیزی
یہ قتل و خوں یہ جنگ و جدل، یہ جور و ستم یہ بغض و حسد
باقی ہی رہیں گے ملک میں سب، باقی ہے اگر راج انگریزی
گلزارِ وطن اک بنجر ہے، یا خاک ہے اب یا صرصر ہے
کیا پھول یہاں اور کیسے پھل، کیا شادابی کیا زرخیزی
ہر سو ہے بپا ہنگامۂ خوں، ہر سمت ہے ڈھیر اک لاشوں کا
او ڈوائر و ڈائر کے دم سے، قائم ہے نشانِ چنگیزی
شدھی ہے کہیں، تبلیغ کہیں، ناقوس کہیں، تکبیر کہیں
یہ پیچ نہ ہوں تو مشکل ہے، دم بھر کے لئے راج انگریزی

کڑے مرحلے

نہیں سہل آزادئ ہند یارو — ابھی تم کو میداں میں آنا پڑے گا
ابھی امتحاں تم کو دینے پڑیں گے — ابھی تم کو جیلوں میں جانا پڑے گا
ابھی چکیاں پیسنی ہوں گی تم کو — ابھی پمپ و گرّا چلانا پڑے گا
ابھی جسم ہوں گے لہو پتھروں سے — ابھی زخم سینے پہ کھانا پڑے گا
پڑے گا ابھی کام تیغ و تبر سے — ابھی خاک و خوں میں نہانا پڑے گا
چلیں گی ابھی ہر طرف گن مشینیں — ابھی توپ کی زد پہ آنا پڑے گا
ہوائی جہاز آ کے یورش کریں گے — ابھی سر پہ بم کا نشانا پڑے گا
یہ سب امتحاں ختم ہو جائیں گے جب — یہ سر تم کو اپنا کٹانا پڑے گا
کھچو گے ابھی تختۂ دار پر تم — ابھی تم کو پھانسی پہ جانا پڑے گا

بہت سے کڑے مرحلے راہ میں ہیں
یہ طے کر کے منزل تک آنا پڑے گا

عہد فرنگ

ہم نشیں اس کی تفاصیل میں ہے طول بہت
برکتیں اپنے میں رکھتا ہے جو کچھ عہدِ فرنگ

خیر سے ایک صدی بھی نہیں گزری اب تک
مل گیا خاک میں سب ملک کے اقبال کا رنگ

اب نہ دولت کے وہ چشمے ہیں نہ سطوت کے نشاں
ہر طرف قحط ہے ہر سمت ہے افلاس سے جنگ

اب نہ مردانگی و عزم نہ وہ جوش و خروش
نہ وہ ہمت نہ شجاعت نہ وہ جرأت نہ اُمنگ

نہ ارادوں میں بلندی نہ خیالات وسیع
سگ و روباہ ہیں اب، تھے جو کبھی شیر و پلنگ

نہ وہ پہلی سی محبت نہ وہ اگلا سا خلوص
نہ برہمن میں وہ انداز، نہ وہ شیخ میں ڈھنگ

کیا رواداری و ہمدردی و اخلاص کا ذکر
دیکھیے جس کو نظر آتا ہے گویا وہ نہنگ

عید آتی ہے تو لاتی ہے قیامت سر پر
ہولی آتی ہے تو برساتی ہوئی خشت اور سنگ

نہ دسہرے میں وہ رونق نہ محرم میں وہ شان
برچھیاں سینوں میں پنہاں ہیں نگاہوں میں خدنگ

ایک ہنگامۂ محشر ہے بپا چار طرف
گرم ہے معرکۂ دشنہ و شمشیر و تفنگ

ہیں جڑیں فتنہ و تفریق کی اتنی مضبوط
کوئی کھودے تو وہ پاتال میں دے جا کے سُرنگ

وادیٔ صلح کا طے ہونا ہے اک امر محال
اہل تدبیر کے بھی پاؤں ہیں اس راہ میں لنگ

مٹ گئے آشتی و امن و اماں کے نقشے
کھا گیا شیشۂ دل کو حسد و بغض کا زنگ

ہر طرف پھیلی ہے بے غیرتی و بے شرمی
پھر رہی ہے نئے فیشن کی دلہن ننگ دھڑنگ

پائی ڈھیل اس قدر آزادی و خودداری نے
کٹ گئی غیرت و ناموس و حمیت کی پتنگ

اب ہیں بے باکی و عریانی کے معنی تجیہ
دورِ تہذیب نے بالکل ہی بدل دی فرہنگ

اب نہ آنکھوں میں حیا ہے نہ دلوں میں احساس
ڈالدی ہے دل و دیدہ نے عجب رنگ میں بھنگ

اک طرف فقر و فلاکت کے ہیں اژدر سر پر
اک طرف کھولے ہیں منہ جورِ حکومت کے نہنگ

آج دنیا میں نہیں کوئی بجز یاس اپنا
ہمدم و ہم نفس و ہم قدم و ہم آہنگ

یا یہ حالت تھی کہ دنیا میں کوئی ملک نہ تھا
صنعت و حرفت و ایجاد میں اپنا پاسنگ

یا یہ عالم ہے کہ جاپان اگر رحم نہ کھائے
اپنی میت کو کفن کے بھی ہے ملنے میں درنگ

اب وہاں نوحہ ماتم ہے کہ آوازِ فغاں
گوش پرور تھے جہاں سازو دف و نغمۂ چنگ

فاقہ مستی نے کچھ اس درجہ کیا نشہ ہرن
نہ رہا تاک میں وہ کیف نہ مئے میں وہ ترنگ

کھا گیا بحرِ تفکر میں ادب بھی غوطہ
فاقہ و گرسنگی نے کیا وہ قافیہ تنگ

یا یہ نقشہ تھا کہ تھا روئے زمیں پر زنہار
نہ تو اپنا سا جری اور نہ اپنا سا دبنگ

یا یہ صورت ہے کہ اغیار تو ہیں پھر اغیار
آپ ہی اپنی نگاہوں میں ہیں ہم موجبِ ننگ

بڑھتی ہی جارہی ہیں ابتریاں روز بروز
چرخ کی تفرقہ سازی کے ہیں کیا کیا نیرنگ

اس قدر پستی و ادبار کے ہوتے ہوئے بھی
مخلصی کے نظر آتے نہیں ہم کو کوئی ڈھنگ

پھر بھی احساس نہیں ہے ہمیں اسکا افسوس
یاد رکھو کہ یہ جملے ہیں نقوشِ ارژنگ

سر کھجانے کی بھی اک دن نہ اجازت ہوگی
ہیں مسلط جو سروں پر یونہی برکاتِ فرنگ

اُردو میں

قومی شاعِری

کے

سَو سال

سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک

محمد علی جوہر

شرارِ جوہر

تشنہ کاموں سے ہے خود آج یہ ساقی کو گلہ — ہم تو دیں پر کوئی اس مے کا طلبگار بھی ہے
جاں فروشی کے لئے ہم تو ہیں تیار مگر — کوئی اس جنسِ گرامی کا خریدار بھی ہے

○

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے — ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلّادی کہاں تک ہے
تجھے ہے قوتِ بازو پہ غرّہ صبر پر ہم کو — لگا دے زور تو سارا تری طاقت جہاں تک ہے

○

ہیں یہ انداز آزمانے کے — اور ہی ڈھنگ ہیں ستانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید میں اور اتنی بے باکی
سب یہ لچھن ہیں مار کھانے کے

○

جورِ گلچیں یاد رکھ، قیدِ قفس کا غم نہ کر — چین کب اے بلبلِ ناداں تجھے گلشن میں تھا

○

قید ہے جو کھڑکی بیجا پور کی تسخیر ہے
گو لکنڈے بھی جو جا پہنچے تو عالم گیر ہے

اے مسیحا اس مرض سے کون چاہے گا شفا
دار پر موت آئے اس کی بھی کوئی تدبیر ہے

یا الٰہی طوق لعنت ہو نہ گردن میں دہاں
غم نہیں گر یاں ہمارے پاؤں میں زنجیر ہے

○

قید ہے قیدِ غلامی، دو برس کی قید کیا
دیکھو کب ہو خاتمہ اس قیدِ بے میعاد کا

○

ملی ہے قید آزادی کی خاطر
نہ پڑ جائیں کہیں دونوں کے چسکے

○

دلا خوش ہو نشانہ ہے اگر تو جورِ بیجا کا
یہ کیا کم ہے کہ تجھ کو مستحقِ امتحاں پایا

سنّتِ سجّادؑ

آنکھ ہے محوِ تجلّی، وصل سے دل شاد ہے
قید میں بھی طبع بیخود ہر طرح آزاد ہے
بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلت نہیں
باپ دادا کا طریقہ سنّتِ سجّاد ہے

؎ علامہ فاخر تحریک قومی کے سلسلے میں قید ہوئے تھے۔

انجم گیاوی

گرفتارِ قفس

یہ فریاد و فغاں اے بلبلِ بے خانماں کب تک — تجھے او بے خبر ہو گی نہ فکرِ آشیاں کب تک
جو اس گلشن میں رہنا ہے تو استحقاق حاصل کر — گرفتارِ قفس امیدِ رحمِ باغباں کب تک
نگہبانی کر اُن کی جو نئے پودے ہیں گلشن میں — رہیں گی سایہ افگن اب یہ سوکھی ڈالیاں کب تک
کر اب ان نونہالانِ چمن کی آبیاری خود — تری غفلت رکھے گی ان کو پامالِ خزاں کب تک
پھر اپنی قوتِ نشو و نما سے خود یہ اُبھریں گے — رکھے گا ان کو تو محتاجِ دستِ باغباں کب تک

کُن آغازِ عمل ایں قصۂ عہد کہن تا کے
پئے دلبستگی زیں شغل بزم و انجمن تا کے

علاجِ قوم کرنا ہے تو کچھ درد آشنا ہو جا — سراپا درد ہو کر درد کی اپنے دوا ہو جا
اگر آزاد ہو کر تجھ کو اس گلشن میں رہنا ہے — تو مثلِ سرو اپنے پاؤں پر خود ہی کھڑا ہو جا
مخالف ہے ہوا دشمن ہیں جیں زورِ طوفاں ہے — خدا را کشتیٔ قومی کا اپنے ناخدا ہو جا
نہ ہو پامال سبزے کی طرح پستی میں تو رہ کر — بلند ہمت بنا اپنے کو عالی حوصلہ ہو جا

بچشمِ ہمصفیرانِ چمن اعزاز پیدا کن
رہائی گر ہوس داری پرِ پرواز پیدا کن

وہ اندازِ فغاں اے بلبلِ دلگیر پیدا کر — تڑپ اُٹھے دلِ صیاد وہ تاثیر پیدا کر
بہارِ گلشنِ صیاد پر کیوں جان دیتا ہے — خود اپنے دشت میں شادابیٔ کشمیر پیدا کر
بجائے نکچر و اسپیچ سرگرمِ عمل ہو جا — زبانِ حال بن خاموشیٔ تصویر پیدا کر

زباں کی صرف تیزی سے نہیں کچھ کام چلنے کا
کوئی جوہر بھی دل میں صورتِ شمشیر پیدا کر

تلوک چند محروم

مقاومت مجہول

یہ نہیں ہے شانِ وفا صنم، کہ کریں بجوش مقابلہ
تری سختیوں سے کریں گے ہم، بخدا خموش مقابلہ

ترے پائمالِ ستم ہیں گو مگر اُن میں تاب و تواں نہیں
شب و روز کرتے ہیں موت سے ترے سرفروش مقابلہ

تو جو خوں ہوا ہے تو کیا ہوا، کہ دمِ اخیر تلک کیا
غمِ بے حساب سے تو نے اے دلِ صبر کوش مقابلہ

جو ادا ہے تیغ بکف ہے وہ، جو سخن ہے خنجرِ جاں ستاں
تری فوجِ ناز سے تا کجا، کریں چشم و گوش مقابلہ

گئی جان حسرتِ دید میں، مگر اُف نہ آئی زبان پر
تلکؔ اس کو کہتے ہیں ضبطِ غم، یہ ہے بے خروش مقابلہ

؎ تلوک کا مخفف۔

سودیشی تحریک

وطن کے دردِ نہاں کی دوا سدیشی ہے
غریب قوم کی حاجت روا سُدیشی ہے

تمام دہر کی روحِ رواں ہے یہ تحریک
شریک حُسن عمل جا بجا سُدیشی ہے

قرارِ خاطرِ آشفتہ ہے فضا اس کی
نشانِ منزلِ صدق و صفا سُدیشی ہے

وطن سے جن کو محبت نہیں وہ کیا جانیں
کہ چیز کون بدیشی ہے کیا سُدیشی ہے

اسی کے سایہ میں پاتا ہے پرورش اقبال
مثالِ سایۂ بالِ ہما سُدیشی ہے

اسی نے خاک کو سونا بنا دیا اکثر
جہاں میں گر ہے کوئی کیمیا سُدیشی ہے

فنا کے ہاتھ میں ہے جانِ ناتوانِ وطن
بقا جو چاہو تو رازِ بقا سُدیشی ہے

ہو اپنے ملک کی چیزوں سے کیوں ہمیں نفرت
ہر ایک قوم کا جب مدّعا سُدیشی ہے

سائمن کمیشن کا مقاطعہ

سائمن صاحب کے استقبال کا وقت آگیا
جاگ اے لاہور اب فرض کو پہچان کر
ان کے رستے میں کئی آنکھیں بچھائی جا چکیں
تو بھی اے خونِ جگر چھڑکاؤ کا سامان کر
چین خود لیں گے نہ لینے دیں گے ان کو ایک دم
گھر سے اے پنجابیو نکلو یہ دل میں ٹھان کر
ریل سے اتریں تو کالی جھنڈیاں ہوں سامنے
جن کے اندر تم کھڑے ہو سینہ اپنا تان کر
تجھ کو اے پنجاب اگر کچھ بھی ہے پاس آبرو
اپنی اس عزت پر اپنی جان کو قربان کر
طالب العلموں کے خونِ گرم کے کھولاؤ سے
جوشِ آزادی کا برپا آتشیں طوفان کر
نوجوانوں کو پلا جامِ شرابِ زندگی
مشکلیں رندانِ دود آشام کی آسان کر
کٹ کے بیگانوں سے مل جانا یگانوں کو سکھا
لارڈ برکن ہیڈ کو نرگس کی طرح حیران کر
ہر قدم پر ہو کمیشن کا مکمل بائیکاٹ
طول و عرضِ ملک میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کر

سوراج

ہے کل کی ابھی بات کہ تھے ہند کے سرتاج
دیتے تھے تمھیں آکے سلاطینِ زمن باج

یا رنگ زمانے نے یہ بدلا ہے کہ تم کو
دنیا کی ہر اک قوم سمجھتی ہے ذلیل آج

داماںِ نگہ جس کی فضا کے لئے تھا تنگ
وہ باغ ہوا دیکھتے ہی دیکھتے تاراج

جب تک رہے تم دستِ نگر اپنے خدا کے
ہونے نہ دیا اس نے تمھیں غیر کا محتاج

جو ہو گئے اس کے وہ ہوا ان کا نگہباں
اس کی ہے جنھیں شرم ہے ان کی بھی اسے لاج

مٹ جاؤ مگر حق کو نہ مٹتے ہوئے دیکھو
سیکھو یہ روش[1] گر تمھیں لینا ہے سوراج

---

[1] دیوان میں یہ مصرع اسی طرح لکھا ہوا ہے۔

ظفر علی خاں

پٹیل کا پیغام

دے رہا ہے ہمیں زنداں سے یہ پیغام پٹیل
منزل آزادیٔ کامل کی ہے اس عہد میں جیل

آئے دن اپنوں میں ہوتی جو نہ دانتا کِل کِل
ہونے پاتے نہ وہ اس طرح پرایوں کے ڈبیل

جان بُل برہمن و شیخ سے ہے برسرِ جنگ
اب نہ ہوگا تو پھر ان دونوں میں ہوگا کب میل

سر ہتھیلی پہ لئے جب نکل آیا پنجاب
تو یہ سمجھو کہ منڈھے چڑھ گئی اس دیس کی بیل

پھیلتی جاتی ہے گاندھی کی لگائی ہوئی آگ
کوئی اروِن سے یہ کہدو کہ نہ اس آگ سے کھیل

ڈیڑھ سو سال تک انگریز شتربان رہا
اب ہم اس اونٹ کی خود ہاتھ میں تھامیں گے نکیل

ظفر علی خاں

انقلابِ ہند

بارہا دیکھا ہے تو نے آسماں کا انقلاب
کھول آنکھ اور دیکھ اب ہندوستاں کا انقلاب
مغرب و مشرق نظر آنے لگے زیر و زبر
انقلابِ ہند ہے سارے جہاں کا انقلاب
کر رہا ہے قصرِ آزادی کی بنیاد استوار
فطرتِ طفل و زن و پیر و جواں کا انقلاب
صبر والے چھا رہے ہیں جبر کی اقلیم پر
ہو گیا فرسودہ شمشیر و سناں کا انقلاب

ظفر علی خاں

سر ملکم ہیلی کے ملفوظات

جنابِ حضرتِ ہیلی کو یہ غم کھائے جاتا ہے
نہ کر دے سرنگوں مشرق کہیں مغرب کے پرچم کو

چھڑی آزادیٔ ہندوستاں کی بحث کونسل میں
تو ظاہر یوں کیا حضرت نے اپنے اس چھپے غم کو

ہماری بھی وہی غایت ہے جو مقصد تمہارا ہے
خدا وہ دن کرے گردوں کے تارے بن کے تم چمکو

علم بردار ہیں انگریز اس تہذیب کے جس نے
دیا ہے درس آزادی تمام اقوامِ عالم کو

حکومت آج تم کو سونپ کر ہو جائیں ہم رخصت
مگر اندیشہ اس میں ہے فقط اس بات کا ہم کو

ہمارے بعد کون اس ہاتھ کی شوخی کو روکے گا
جو بیکل ہے کہ لا کر ڈال دے گنگا میں زمزم کو

مسلماں ہندوؤں کو ایک حملے میں مٹا دیں گے
اڑا لے جائیگا یہ آفتاب آتے ہی شبنم کو

کسی نے کاش یہ تقریر سن کر کہہ دیا ہوتا
کہ دے سکتے نہیں ہو تم اب ان فقروں سے دم ہم کو

مسلماں بھولے بھالے اور ہندو سیدھے سادے ہوں
نہیں احمق مگر ایسے کہ سمجھیں انگبیں سم کو

نپٹتے آئے ہیں آپس میں اور اب بھی نپٹ لیں گے
اگر تم بن کے ثالث بیچ میں ان کے نہ آدھمکو

مہاراج بہادر برقؔ دہلوی

اہلِ ہند

انقلابِ دہر سے سب شان والے مٹ گئے　　روم والے مٹ گئے یونان والے مٹ گئے
سیریا والے مٹے، توران والے مٹ گئے　　کون کہتا ہے کہ ہندستان والے مٹ گئے

نقشِ باطل ہم نہیں جس کو مٹائے آسماں
ہم نہیں مٹنے کے جب تک ہے بنائے آسماں

ہم نے یہ مانا ہمارے آن والے مٹ گئے　　بھوج سے وکرم سے عالی شان والے مٹ گئے
بھیشم و ارجن سے یودھا بان والے مٹ گئے　　اکبر و پرتاپ سے میدان والے مٹ گئے

نام لیوا اُن کے ہم زیرِ فلک باقی تو ہیں
مٹتے مٹتے بھی جہاں میں آج تک باقی تو ہیں

خاک سے اس دیش کی پیدا ہوئے وہ نامور　　نقش جن کے کارنامے ہیں بساطِ دہر پر
دبدبے سے جنکے جھکتے تھے سرافرازوں کے سر　　جن کا لوہا مانتے ہیں حکمرانِ بحر و بر

تیغ و ترکش کے دھنی تھے رزمگہ میں فرد تھے
اس شجاعت پر یہ طرہ ہے سراپا درد تھے

آشنائے رازِ وحدت، فلسفیِ بے مثال　　گوہرِ دریائے دانش، نکتہ دانِ باکمال
ماہرِ علم و ہنر، شیوا بیاں، شیریں مقال　　راستباز و صلح جو، پاکیزہ خو، روشن خیال

بادۂ تہذیب سے وہ سربسر مخمور تھے
قلب روشن معرفت کے نور سے پُرنور تھے

کیا تھے اہلِ ہند یہ چرخِ کہن سے پوچھ لو یا ہمالہ کی گپھاؤں کے دہن سے پوچھ لو
اپنا افسانہ لبِ گنگ و جمن سے پوچھ لو پوچھ لو ہر ذرّۂ خاکِ وطن سے پوچھ لو

اپنے مُنہ سے کیا بتائیں ہم کہ کیا وہ لوگ تھے
نفس کُش نیکی کے پُتلے تھے مجسّم یوگ تھے

ہم معرّا ہو کے ان اوصاف سے پستی میں ہیں دولتِ علم و عمل کھو کر تہی دستی میں ہیں
شہرۂ آفاق اب مستی و بدمستی میں ہیں شمعِ افسردہ کی صورت محفلِ ہستی میں ہے

دورِ رفتہ کا مگر سودا ہمارے سر میں ہے
بادۂ حُبِّ وطن چھلکے ہوئے ساغر میں ہے

پھر ہمیں ہوگا میسّر دہر میں جاہ و جلال چار دن میں گلشنِ ہستی میں پھر ہوں گے نہال
برق یہ ضرب المثل ہوگی ہمارے حسبِ حال "ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال"

نیرِ اقبال چمکے گا ہمارا ایک دن
اوج پر اس دیش کا ہوگا ستارا ایک دن

اچھوتوں سے نفرت

سب کے لئے ہے یکساں قدرت کا فیض جاری   مفلس ہو یا تونگر، راجہ ہو یا بھکاری
ٹوٹی سی جھونپڑی ہو یا قصر کامگاری   دونوں پہ مہر انور کرتا ہے جلوہ باری
ہیں خاک بوس کرنیں مہتابِ ضو فشاں کی
ہر گھر میں روشنی ہے قندیلِ آسماں کی

سیراب سب کو یکسر کرتا ہے آبِ باراں   تختہ ہو زعفراں کا یا کشتِ خشکِ دہقاں
جوشِ بہار کا ہے یکساں اثر نمایاں   ہو گلبنِ گلستاں یا لالۂ بیاباں
تاثیرِ فصل سے ہے سود و زیاں برابر
ہیں نخل دشت گلشن وقفِ خزاں برابر

عصیاں شعار ہے یا کوئی مہاتما ہے   خاکی لباس دونوں کو ایک سا ملا ہے
شاہنشہِ جہاں ہے یا کوئی بے نوا ہے   جس کو بقا ملی ہے آخر اُسے فنا ہے
فطرت کا سب پہ حاوی قانون ایک ہی ہے
عنوان گو جدا ہیں مضمون ایک ہی ہے

پست و بلند کا ہے پھر امتیاز کیسا   ادنیٰ کا رمز کیا ہے، اعلیٰ کا راز کیسا
سائے سے بیکسوں کے ہے احتراز کیسا   پتلوں کو خاک کے ہے ہستی پہ ناز کیسا
کیفِ مے خودی سے ہے وہم برتری کا
حاصل ہے ورنہ سب کو رتبہ برابری کا

تفریق جو ہے قائم یہ غیر قدرتی ہے
اسفل بھی آدمی ہے، افضل بھی آدمی ہے

دور از رہِ حقیقت یہ فرقِ ظاہری ہے
ہر قصرِ تن میں روشن اک شمع زندگی ہے

جلوے ہیں سب اُسی کے رازِ حیات کیا ہے
ہیں پھول اک چمن کے تخصیصِ ذات کیا ہے

مثلِ حباب کب ہے لازم ہوا میں پھرنا
بحرِ جہاں میں سب کو اک گھاٹ ہے اُترنا

زیبا نہیں کسی سے بیجا سلوک کرنا
مُنہ سے اچھوت کہنا نفرت سے نام دھرنا

تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی
اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی

جو ان کا مستقر ہے وہ ہے وطن ہمارا
ہے وجہِ ناز ان کو دورِ کہن ہمارا

تہذیب ایک سی ہے یکساں چلن ہمارا
بیگانہ اِن کو سمجھیں، دیوانہ پن ہمارا

اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب
گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

تلوک چند محروم

پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

جن سرافرازوں کی روحیں آج ہیں افلاک پر
موت خود حیراں تھی جن کی جرأتِ بیباک پر
نقش جن کے نام ہیں اب تک دلِ غمناک پر
رحمتِ ایزد ہو دائم ان کی جانِ پاک پر
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

پھول برساؤ کہ پھولوں میں ہے خوشبوئے وفا
تھی سرشتِ پاک ان کی عاشقِ جوئے وفا
موت پر اُن کی، گئے جو روئے در روئے وفا
کیوں نہ ہوں اہلِ وطن کے اشکِ خوں جوئے وفا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

تھے وہ فخرِ آدمیت، افتخارِ زندگی
تھے وہ انساں طُرۂ تاج وقارِ زندگی
ان کے دم سے تھا چمن یہ خار زارِ زندگی
تھا نفس ان کا نسیمِ خوشگوارِ زندگی
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

چشمِ ظاہر بیں سمجھتی ہے کہ بس وہ مر گئے
درحقیقت موت کو فانی وہ ثابت کر گئے
جو وطن کے واسطے کٹوا کے اپنے سر گئے
خوں سے اپنے رنگ تصویرِ وفا میں بھر گئے
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

دیکھ لینا خونِ ناحق رنگ اِک دن لائے گا
خود غرض ظالم کئے پر اپنے خود پچھتائے گا
راہ پر دورِ زماں آخر کبھی تو آئے گا
آسماں اس خاک کی تقدیر کو چمکائے گا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر

تلوک چند محروم

ہندی نوجوانوں سے

محبت کو مسرت کو سرورِ شادمانی کو تنعم کو تمول کو تعیش کو جوانی کو
وجاہت کو امارت کو، وقارِ خاندانی کو تن آسانی کی خواہش کو نشاطِ زندگانی کو
وطن پر کر دیا قرباں جواہر لال نہرو نے

جواہر لال نہرو بھی جواں ہے اور جواں تو بھی جواں ہے اور امیدِ مادرِ ہندوستاں تو بھی
اسی اُجڑے چمن کا ایک ہے سروِ رواں تو بھی جوانانِ چمن کے ساتھ ہے وقفِ خزاں تو بھی
کہ سارے باغ کو جھلسا دیا ہے بس بھری بو نے

تو مسلم ہے کہ ہندو ہے غرض اس سے نہیں مجھ کو محبت ہے وطن سے تجھ کو اتنا ہے یقیں مجھ کو
تری حالت نہ ہو حسرت فزا یاسِ آخریں مجھ کو اگر مل جائے کچھ اس کا جوابِ دل نشیں مجھ کو
کیا ہے کیا وطن کے واسطے اے جواں تو نے

وطن جس کا ہو پابندِ الم وہ شادماں کیوں ہو قفس ہو آشیاں جس کا وہ بلبل نغمہ خواں کیوں ہو
غلاموں کا وطن تیرا وطن اے نوجواں کیوں ہو جہاں آزاد ہے، ہندوستاں ننگِ جہاں کیوں ہو
مٹانے کی اسے کیوں ٹھان لی چرخِ جفا جو نے

حمیت کا تقاضہ ہے کہ ہو کچھ انسداد اس کا خود آرائی تن آسانی سے عقدہ وا نہیں ہوگا
سُدیشی، سادگی، پاکیزگی پر ہو عمل پیرا جواں مردی وطن کی ہو رہی ہے آج کیوں رسوا
اسے رسوا کیا آرائشِ رخسار و گیسو نے

شہید بھگت سنگھ

زنداں میں شہیدوں کا وہ سردار آیا
شیدائے وطن، پیکرِ ایثار آیا
ہے دار و رسن کی سرفرازی کا دن
سردار بھگت سنگھ سردار آیا

تا دار و رسن شوق سے اٹھلا کے گیا
تو شانِ شہادت اپنی دکھلا کے گیا
ٹکڑے ہوتا ہے دل ترے ماتم میں
لاشے کا انگ انگ کٹوا کے گیا

پی کر مئے شوق جھومنا وہ تیرا
بے پروایانہ گھومنا وہ تیرا
ہے نقش ترے اہل وطن کے دل پر
پھانسی کی رسن کو چومنا وہ تیرا

جامِ حُبِ وطن کے اے متوالے
اے پیکرِ ناموس، حمیت والے
ہو عالمِ ارواح میں شاداں کہ نہیں
اب تیرے وطن میں وہ حکومت والے

ہند مظلوم

حالتیں کہتی ہیں یہ قوم کے ارمانوں کی
قسمتیں جاگ اُٹھیں سوختہ سامانوں کی

پتلیاں بدلی نظر آتی ہیں دیوانوں کی
توڑ ڈالیں گے یہ دیواروں کو زندانوں کی

چند مظلوم زن و مرد، کچھ اُجڑے ہوئے گھر
سرخیاں ہیں یہ مری قوم کے افسانوں کی

لُٹ گیا ملک گرفتار ہوئی قوم مگر
طاقتیں یوں بھی کہیں لٹتی ہیں ایمانوں کی

ہندوؤں کی ابھی مالا ہے بدستور وہی
ابھی تسبیح بھی باقی ہے مسلمانوں کی

چھینٹیں کچھ خون کی دیواروں پہ کچھ کاسۂ سر
یادگاریں ابھی محفوظ ہیں دیوانوں کی

ہند مظلوم ہے فریاد کناں اے مالک
جلد لے جلد خبر اپنے پریشانوں کی

یہ عجب جنگ ہے اس دور زمانہ میں رواںؔ
اس طرف توپ ادھر ڈھال ہے ایمانوں کی

آزادی

شیروں کو آزادی ہے آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں کھائیں پئیں آنند رہیں
شاہیں کو آزادی ہے آزادی سے پرواز کرے
ننھی منی چڑیوں پر جب چاہے مشقِ ناز کرے
سانپوں کو آزادی ہے ہر بستے گھر میں بسنے کی
ان کے سر میں زہر بھی ہے اور عادت بھی ہے ڈسنے کی
پانی میں آزادی ہے گھڑیالوں اور نہنگوں کو
جیسے چاہیں پالیں پوسیں اپنی تند امنگوں کو
انسان نے بھی شوخی سیکھی وحشت کے ان رنگوں سے
شیروں سانپوں، شاہینوں گھڑیالوں اور نہنگوں سے
انسان بھی کچھ شیر ہیں باقی بھیڑوں کی آبادی ہے
بھیڑیں سب پابند ہیں لیکن شیروں کو آزادی ہے

شیر کے آگے بھیڑیں کیا ہیں اِک من بھاتا کھاجا ہے
باقی ساری دنیا پرجا شیر اکیلا راجا ہے

بھیڑیں لاتعداد ہیں لیکن سب کو جان کے لالے ہیں
ان کو یہ تعلیم ملی ہے بھیڑیئے طاقت والے ہیں

ماس بھی کھائیں کھال بھی نوچیں ہردم لاگو جانوں کے
بھیڑیں کاٹیں دَورِ غلامی بل پر گلہ بانوں کے

بھیڑیوں سے گویا قائم امن ہے اس آبادی کا
بھیڑیں جب تک شیر نہ بن لیں نام نہ لیں آزادی کا

انسانوں میں سانپ بہت ہیں قاتل بھی زہریلے بھی
ان سے بچنا مشکل ہے آزاد بھی ہیں پھرتیلے بھی

سانپ تو بننا مشکل ہے اس خصلت سے معذور ہیں ہم
منتر جاننے والوں کی محتاجی پر مجبور ہیں ہم

شاہیں بھی ہیں چڑیاں بھی ہیں انسانوں کی بستی میں
وہ نازاں اپنی رفعت پر یہ نالاں اپنی پستی میں

شاہیں کو تادیب کرو یا چڑیوں کو شاہیں کرو
یوں اس باغ عالم میں آزادی کی تلقین کرو

بحر جہاں میں ظاہر و پنہاں انسانی گھڑیال بھی ہیں
طالب جان و جسم بھی ہیں شیدائے جان و مال بھی ہیں

یہ انسانی ہستی کو سونے کی مچھلی جانتے ہیں
مچھلی میں بھی جان ہے لیکن ظالم کب گردانتے ہیں

سرمائے کا ذکر کرو مزدوروں کی ان کو فکر نہیں
مختاری پر مرتے ہیں مجبوروں کی ان کو فکر نہیں

آج یہ کس کا مُنھ ہے آئے منھ سرمایہ داروں کے
ان کے مُنھ میں دانت نہیں پھل ہیں خونی تلواروں کے

کھا جانے کا کون سا گُر ہے جو اِن سب کو یاد نہیں
جب تک ان کو آزادی ہے کوئی بھی آزاد نہیں

زر کا بندہ عقل و خرد پر جتنا چاہے ناز کرے
زیرِ زمیں دھنس جائے یا بالائے فلک پرواز کرے

اس کی آزادی کی باتیں ساری جھوٹی باتیں ہیں
مزدوروں کو مجبوروں کو کھا جانے کی گھاتیں ہیں

جب تک چوروں راہزنوں کا ڈر دُنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے جو آزادی کا طالب ہے

سیماب اکبرآبادی

ہندستان

وہ پرستش گاہِ فطرت، سجدہ گاہِ آفتاب — گردگارِ صبحِ مشرق، شامِ گیتی کا شباب
تھا صنم زارِ عرب جس کے صنم خانوں کی دھوپ — آتشِ بزمِ عجم تھی جس کے ایوانوں کی دھوپ
بتکدوں میں جس کے زندہ تھے بتانِ آذری — عشق کی پروردگاری، حُسن کی پیغمبری
سرخ صندل سی جبینیں، اُن پہ قشقوں کے چراغ — برگ سے نازک طبیعت، پھول سے نازک دماغ
جس کے دریا آئینے، پگھلے ہوئے بہتے ہوئے — جس کے پربت کائناتِ ابر کو گھیرے ہوئے
جس کی ندیاں موجِ مے کی طرح لہراتی ہوئی — گھومتی، گرتی، گزرتی، گونجتی گاتی ہوئی
شام مستی آفریں، رنگِ سحر جلوہ پناہ — عشق کی پہلی جماہی، حُسن کی پہلی نگاہ
لہلہاتے سبزہ زاروں میں بہار آئی ہوئی — اِک گھٹا برسی ہوئی اور اِک گھٹا چھائی ہوئی

جیسے رقصاں ہو فضا میں حسن کا رنگیں خدنگ
مختلف رنگوں کا جیسے اُڑ رہا ہو اِک پتنگ

دیکھ کر افغانیوں نے اُس کی پروازِ جمیل — لے لیا آغوشِ قوت میں بہ اندازِ جمیل
مل گئی شمعِ حرم، بت خانے کے فانوس سے — ابنِ آذر نے اذاں دی پردۂ ناقوس سے
مسلکِ بُدھ کو تحفظ کا اشارہ مل گیا — کرشن کے مندر کو مسجد کا سہارا مل گیا
ذرہ ذرہ محفل زہرہ نظر آنے لگا — خون سا قشقہ ثریا بن کے اترانے لگا

ہند علم و فضل و رعنائی کا گہوارہ بنا
یہ پتنگ اتنا ہوا اونچا کہ ستارہ بنا

شامِ مغرب یہ ستارہ دیکھ کر للچا گئی
سادہ و بے نور آنکھوں میں چکاچوند آگئی

فلسفی بھی دام لے لے کر بڑھے تجّار بھی
اپنا پھندا لے کے اُٹھا دیو استعمار بھی

عرش سطوت پر تھی موجِ عشرتِ افغانیاں
جلوۂ ساغر سے تھیں چمکی ہوئی مہتابیاں

تھیں یہی دو چار باتیں گرمیِ بزمِ شباب
نغمۂ مطرب، کنارِ شاہد و جامِ شراب

کارواں غافل ہوا رعبِ شبِ منزل گیا
پاسبانِ وقت کو شب خوں کا موقع مل گیا

شامِ مغرب صبحِ مشرق پر یکایک چھا گئی
سرخ اِک بدلی زمیں سے آسماں تک چھا گئی

اب وہ سیارہ جو رفعت پر سبک پرواز تھا
پستیِ حالات سے پھر نقشِ پا انداز تھا

آہ اے ہندوستاں! یہ تیری پستی، وہ شباب!
کچھ تری تقدیر ہی میں فطرتاً ہے انقلاب

گو بظاہر تو نشاطِ ندرتِ ایام ہے
فی الحقیقت بے سکوں بے چین، بے آرام ہے

وہ بہاریں، وہ چمن، وہ گلشنِ ایجادی کہاں
اے غلام آباد اب وہ تیری آزادی کہاں

بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار
ایک ذرّے، ایک قطرے پر نہیں ہے اختیار

اب بھی میدانوں میں بچھتی ہے بساطِ ماہتاب
تیری موجِ خاک سے اب بھی برستے ہیں گلاب

روح سے خالی ہے لیکن پیکرِ مردہ ترا
جلوہ پژمردہ ہے تیرا، باطن افسردہ ترا

جیسے شمعِ صبحِ محفل، جیسے چھپتا آفتاب
جیسے شاعر کا بڑھاپا اور بیوہ کا شباب

پستیوں کو ارتقا پھر جلوۂ آغاز دے
کاش مستقبل ترا ماضی کو پھر آواز دے

جعفر علی خاں اثر

درسِ اتحاد

اب ہم میں کہاں اربابِ ہمم
جرأت نہ ارادے مستحکم

ہنگامہ خودی کا برپا ہے
غوغا نفسی نفسی کا ہے

ایثار و وفا کا نام نہیں
مطلب سے غرض، پھر کام نہیں

الفت ہوئی رسمِ پارینہ
ہے اُس کی جگہ دل میں کینہ

اگلوں کے چلن ہم بھول گئے
وہ رسمِ کہن ہم بھول گئے

اخلاق انکو بھی کھو بیٹھے
اک ساتھ سبھی کو رو بیٹھے

آپس کی رواداری اُٹھی
اُلفت اُٹھی یاری اُٹھی

بدمست مئے پندار ہوئے
دولت کی ترنگ میں خوار ہوئے

مجہول ہوئے بیکار ہوئے
محکوم ہوئے نادار ہوئے

عیار ہوئے مکار ہوئے
کیا تھے اور کیا سرکار ہوئے

ہم میں ہیں نکمے یا کھوٹے
بس نام بڑا درشن چھوٹے

کیوں تنگ نہ آئیں جینے سے
فرصت ہی نہ ہو جب کینے سے

منزل کی خبر ہے نہ اپنی خبر
معلوم نہیں جاتے ہیں کدھر

ہیں خیر کے بدلے مائلِ شر
کرتے ہیں وہی جس میں ہے ضرر

اک دوسرے کے غمخوار نہیں
وہ چاہ نہیں وہ پیار نہیں

وہ یوگ رہا نہ وہ پریت رہی
بس اک نفرت کی ریت رہی

پستی اُف کیسی پستی ہے — خود پستی ہم پر ہنستی ہے
ہم سا بھی زبون و زار نہ ہو — مجبور نہ ہو ناچار نہ ہو
اللہ یہ کیسا وقت پڑا — ہے سایہ ہمارا ہم سے جُدا

○

کیوں ہم پہ نہ آفت ٹوٹ پڑے — آپس میں جب ایسی پھوٹ پڑے
یکجہتی جب مفقود ہوئی — اور فکرِ زیان و سود ہوئی
وہ جذب کی طاقت سلب ہوئی — توفیقِ ہدایت سلب ہوئی
اب سعئ عمل مشکور نہیں — وہ دورِ نشاط و سرور نہیں
صد حیف ہم ایسے کھوئے گئے — دن ڈوب گیا اور سوئے گئے
سمجھیں جو یہ کلول ٹل جائے — اب سے آئے گھر سے آئے

○

کاش ایسا کوئی شاعر ہوتا — معجز نہ سہی ساحر ہوتا
جو لفظوں میں جادو بھر دیتا — مُردوں کو زندہ کر دیتا
ملتے ہوئے آنکھیں جاگ اُٹھتے — سب نیند کے ماتے متوالے
یوں خون رگوں میں رواں ہوتا — سیلاب میں دھارا گنگا کا
سب گرد کدورت دھو جاتی — نفرت افسانہ ہو جاتی
پھر بھائی سے بھائی مل جاتا — بے خوف جدائی مل جاتا

○

کاش ایسی کوئی صورت نکلے — غفلت بیداری سے بدلے
اس طرح یہ روٹھے مل جائیں — غیر ان کی وفا کی قسمیں کھائیں
ہو دور نفاق اور میل بڑھے — اِکبار منڈھے پھر بیل چڑھے
مل مل کے رہیں سب چھوٹے بڑے — پھر سوکھے دھانوں پانی پڑے
پھولوں سے لدی ہر ڈالی ہو — باغ اپنا ہو اپنا مالی ہو
خوش وقتی ہو خوش حالی ہو — تا حدِ نظر ہریالی ہو

اِک دوسرے کے آڑے آئیں　　ہوں دور دلدر سُکھ پائیں
مٹی میں رُلی عظمت مل جائے　　پھر کھوئی ہوئی دولت مِل جائے
تہذیب کے چشمے پھر اُبلیں　　رسمیں ٹوٹیں آئین بدلیں نہ
وہ روپ سنگار وطن کا ہو　　جو تازہ عروسِ چمن کا ہو
سب اس کے سہاگ کی لاج کریں
کیوں اُٹھ رہے کل پہ آج کریں

نیاز فتح پوری

نالۂ دل

ساقیا پھر جلوہ پیرا ہو اسی انداز سے
زندہ کر دے اہلِ محفل کو اسی اعجاز سے

طائرِ سدرہ ہماری خستگی پر کر نظر
زورِ بازو گھٹ گیا، پر رہ گیا پرواز سے

جھانک لے پھر پردۂ بردِ یمانی سے ذرا
پھر سکھا طرزِ فغاں چشمِ نوا پرواز سے

وہ حدی خوانوں کے نغمے، وہ سرودِ ساز آہ!
ہو گئے نا آشنا، اپنے پرائے ساز سے

ہم نوا ہوں غیر کا میں بھی بھلا ممکن کہاں
جب کراہا تک نہیں جاتا یہاں آواز سے

محو کر دل سے خطا دلدادگانِ حُسن کی
روٹھتا ہے یوں بھی کوئی عاشقِ جانباز سے

سر اگر ہم کو دیا ہے سرفروشی بھی سکھا
ے عنایت کی تو پھر وارفتہ ہوشی بھی سکھا

روشؔ صدیقی

باردولی

عظمتِ جلوہ گرِ صدق و صفا کیا کہئے
شدّتِ جذبۂ تسلیم و رضا کیا کہئے
دور تک سلسلۂ اہلِ وفا کیا کہئے
منزلِ قافلۂ مقصدِ ہستی ہے تو
سرفروشوں کی بسائی ہوئی بستی ہے تو

نونہالوں کو شجاعت کا دھنی دیکھ لیا
جوش پر ولولۂ کوہ کنی دیکھ لیا
مرحبا جذبۂ حبّ الوطنی دیکھ لیا
ناتواں طاقتِ اغیار سے ٹکراتے ہیں
تیرے بچے رسن و دار سے ٹکراتے ہیں

یہ بہادر، یہ فدائی، یہ رضا کار کسان
یہ اولوالعزم، یہ جانباز، یہ خوددار کسان
تیری عزّت کے نگہبان و نگہدار کسان
لڑکھڑاتے ہیں نہ آلام سے گھبراتے ہیں
مسکراتے ہوئے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں

ظلم و بیداد کی شدّت ہے مگر پھر خوش ہیں
جوشِ طوفانِ شقاوت ہے مگر پھر خوش ہیں
ہاں مصیبت پہ مصیبت ہے مگر پھر خوش ہیں

جانتے ہیں کہ بھلائی سے بھلا ہوتا ہے
صبر والوں کا مددگار خدا ہوتا ہے

گھر ہو لٹ جائے تو ابرو پہ شکن کیوں آئے
قید میں لب پہ کوئی تلخ سخن کیوں آئے
نہ رُکیں اشک تو پھر یادِ وطن کیوں آئے

یہی شیوہ ہے صداقت کے پرستاروں کا
شکر ہر حال میں مذہب ہے رضاکاروں کا

کچھ نہیں ہے تو نہ ہو ہاں دلِ بیدار تو ہے
ہاتھ خالی ہیں تو کیا صبر کی تلوار تو ہے
حُسنِ کردار سے خم ظلم کی دیوار تو ہے

ہیں نہتّے مگر اُمیدِ ظفر رکھتے ہیں
یہ جری عدم تشدد کی سپر رکھتے ہیں

حوصلہ پست ہو مغرور ستم گاروں کا
بول بالا ہو صداقت کے پرستاروں کا
عبرت انگیز ہو انجام جفاکاروں کا

حق تعالیٰ تجھے اس جنگ میں منصور کرے
ارض گجرات سے غیروں کے قدم دور کرے

آفسر میرٹھی

وطن کا راگ

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہر رُت ہر موسم اس کا کیسا پیارا پیارا ہے

کیسا سُہانا کیسا سندر پیارا دیش ہمارا ہے — دکھ میں سکھ میں ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمارا ہے — پربت سب سے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے
بھارت کی رکشا کرتا ہے بھارت کا رکھوالا ہے — لاکھوں چشمے بہتے ہیں لاکھوں ندیوں والا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سناتی جاتی ہیں — صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں — کھیتوں کو ہریالی دیتی پھول کھلاتی جاتی ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

کرشن کی بنسی نے پھونکی ہے روح ہماری جانوں میں — گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتی نے جو دی تھی وہ اب تک ہے پیمانوں میں — نانک کی تعلیم ابھی تک گونج رہی ہے کانوں میں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں — ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم شیدائی ہیں — بھارت نام کے عاشق ہیں ہم بھارت کے شیدائی ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

اعظم حسین آعظم

ستیاگرہی خاتون کی تصویر دیکھکر

غم نہیں، غصہ نہیں، حسرت نہیں حرماں نہیں
اضطرابِ روح کا کوئی نیا عنواں نہیں
میں جہاں بیٹھا ہوں اپنا گھر ہے، کچھ زنداں نہیں
پھر یہ کیا ہے آج قابو میں دلِ نالاں نہیں

سچ ہے منظر ہے کچھ اس طرح کا پیشِ نگاہ
دیکھ کر بے ساختہ دل سے نکل جاتی ہے آہ

کس اسیرِ ظلم کی یہ سامنے تصویر ہے
کون سی یہ ماہ پارا بستۂ زنجیر ہے
ہاتھ میں کیوں ہتھکڑی ہے اسکی کیا تقصیر ہے
نازنینِ مہ جبیں بھی لائقِ تعزیر ہے

سخت غیرت کا مقام اے عشقِ غیرت دار ہے
سرفروشی کے لئے اب حسن خود تیار ہے

جان پر کھیلے ہوئے ہیں وہ جو ہیں جانِ جہاں
خود نشانہ بن رہے ہیں صاحبِ تیر و کماں
حسن کو امداد کی حاجت ہوئی ہے الاماں!
اس سے بڑھ کر اور اب کیا ہوگا وقتِ امتحاں

عشقِ وارفتہ کہاں اس وقت محوِ خواب ہے
سرخرو ہونے کا موقع کس قدر نایاب ہے

ہائے وہ نازک کلائی چوڑیاں تھیں جس کو بار
وہ صراحی دار گردن تھا گلوں کا جس میں ہار
لب پہ شکوے کے عوض گر ہے تبسم آشکار
دیکھنے والوں سے لیکن ہے اشارا بار بار

سلسلہ جنباں ہے وحشت اک نئی تدبیر سے
وہ طلائی طوق بدلا آہنی زنجیر سے

دھوم جس کے نور کی محلوں میں کاشانوں میں ہے
اب وہی شمع شبستاں تنگ زندانوں میں ہے
جس کا شیوہ تھا جلانا خود وہ پروانوں میں ہے
ہائے اب پردہ نشیں لیلیٰ بھی دیوانوں میں ہے
سوئے مقتل کھینچ کر قاتل کو ارماں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا

ساز کے ہر تار میں بے چین ہیں پُر جوش راگ
لب تو ہیں خاموش لیکن نغمہ زن ہے دل کی راگ
کس کو کہتے ہیں رنڈاپا اور کیا شے ہے سہاگ
آشیاں کیسا لگی ہے ہر طرف گلشن میں آگ
حُسن فانی چار دن کے بعد کیا رہ جائے گا
جاں نثارانِ وطن کا تذکرہ رہ جائے گا

دھوپ کی شدت سے چہرہ پھول سا کُھملا گیا
مثل شبنم روئے رنگیں پر پسینہ آ گیا
گرم جھونکوں سے ہوا کے رنگ تک سنولا گیا
دیکھنے والوں کا دل یہ دیکھ کر گھبرا گیا
اڑ رہے تھے دوش پر موئے پریشاں ہر طرف
کارفرما تھی نگاہِ فتنہ ساماں ہر طرف

وہ ترا بیباک جذبہ وہ ترا جوشِ عمل
تھی اسیری کی نہ کچھ پروا نہ کچھ خوفِ اجل
فکر تھی تو یہ ارادوں میں نہ آجائے خلل
ہوشمندانہ ہر اک تقریر دلکش بامحل
ڈال دی مردہ دلوں میں جان اس انداز سے
وہ تڑپ اُٹھا جسے دیکھا نگاہِ ناز سے

بے پروبالی میں بھی یوں مائلِ پرواز ہے
کہتے ہیں سب طائرِ آزاد کا انداز ہے
قمری پر بستہ یہ ہے یا کوئی شہباز ہے
قوتیں اب تک وہی بازو میں ہیں کیا راز ہے
ہو نہ ہو اس میں بھی کچھ منشائے قدرت ہے نہاں
ہونے والا ہے غلامی سے رہا ہندوستاں

احمق پھپھوندوی

حصول آزادی کی دقتیں

ہند کا آزاد ہو جانا کوئی آساں نہیں
دیکھنا تم کو ابھی کیا کیا دکھایا جائے گا

دیکھنا تم سے ابھی کتنے کئے جائیں گے کر
کس طرح تم کو ابھی چکر میں لایا جائے گا

تم میں ڈالا جائے گا اک سخت و نازک تفرقہ
تم کو شہ دے دے کے آپس میں لڑایا جائے گا

پیشوایان مذاہب کو ملیں گی رشوتیں
ڈھونگ تبلیغ اور شدھی کا رچایا جائے گا

دھرم رکشا کے لئے تم سے لئے جائیں گے عہد
تم کو مذہب اپنا خطرے میں دکھایا جائے گا

لیڈروں سے ہوں گے وعدے خلعت و انعام کے
قلت و کثرت کا ہنگامہ اُٹھایا جائے گا

تم کو پروانہ عطا ہوگا خطاب و جاہ کا
تم کو عہدے دے کے لالچ میں پھنسایا جائے گا

گر یہ تدبیریں مقدر سے نہ راس آئیں تو پھر
دوسری صورت سے تم کو ڈگمگایا جائے گا

انتہائی بربریت سے لیا جائے گا کام
بند کر کے تم کو جیلوں میں سڑایا جائے گا

دانہ پانی کر دیا جائے گا بالکل تم پہ بند
تم کو بھوکوں مار کر قبضے میں لایا جائے گا

گرم لوہے سے تمہارے جسم داغے جائیں گے
تم کو کوڑے مار کر اُلّو بنایا جائے گا

جائدادیں سب تمہاری ضبط کر لی جائیں گی
بال بچوں پر تمہارے ظلم ڈھایا جائے گا

باوجود اس کے بھی تم قائم رہے ضد پر اگر
بے تأمل تم کو پھانسی پر چڑھایا جائے گا

اس طرح بھی تم اگر لائے نہ ابرو پر شکن
سر تمہارے پاؤں پر آخر جھکایا جائے گا

احمق پھپھوندوی

پیامِ آزادی

مقام حق ہے بلاشک مقامِ آزادی
بلند عرش سے بھی کچھ ہے بامِ آزادی

نہ ہو سکے گا کبھی محترم جہاں میں تو
جو تیرے دل میں نہیں احترامِ آزادی

سُنا رہا ہے تجھے انقلاب دہر جو کچھ
سُن اور غور سے سُن وہ پیامِ آزادی

کہاں تلک یہ تباہی کی زندگی غافل
اُٹھ اور جلد بنا اک نظامِ آزادی

اُٹھ اور ہاتھ میں لے تیغ بے نیام عمل
کہ ہے وسیلۂ فوز مرامِ آزادی

یہ زندگی ہے تری موت سے سوا بدتر
خُدا کے واسطے کر اہتمامِ آزادی

غلط ہے یہ جو غلامانہ ذہنیت کے ساتھ
پکا رہا ہے تو سودائے خامِ آزادی

فروتنی و خوشامد سے مل نہیں سکتا
شرابِ خانۂ ہستی میں جامِ آزادی

پکاریوں تری ہرگز سُنی نہ جائے گی
زبانِ تیغ سے کر بس کلامِ آزادی

وطن سے لعنت سرمایہ کو فنا کر دے
جو چاہتا ہے بقائے دوامِ آزادی

ہٹا دے پردۂ تاریک جبر و استبداد
کہ نور بار ہو ماہِ تمامِ آزادی

جوشؔ ملیح آبادی

آثارِ انقلاب

قسم اس دل کی، چسکا ہے جسے صہبا پرستی کا
یہ دل، پہچانتا ہے جو مزاجِ اشیائے ہستی کا

قسم اِن تیز کانوں کی کہ ہنگامِ قدح نوشی
سُنا کرتے ہیں جو راتوں کو بحر و بر کی سرگوشی

قسم اس روح کی، خو ہے جسے فطرت پرستی کی
گِنا کرتی ہے راتوں کو جو ضربیں قلبِ ہستی کی

قسم اس ذوق کی حاوی ہے جو آثارِ قدرت پر
ضمیرِ کائنات، آئینہ ہے جس کی لطافت پر

قسم اس حس کی جو پہچان لے تیور ہواؤں کے
سُنائی ہے خبر طوفان کی، طوفان سے پہلے

قسم اس نور کی، کشتی جو ان آنکھوں کی کھیتا ہے
جو نقشِ پا کے اندر عزمِ رہرو دیکھ لیتا ہے

قسم اس فکر کی، سوگند اس تخئیلِ محکم کی
جو سُنتی ہے صدائیں جنبشِ مژگانِ عالم کی

قسم اس آنکھ کی جو درسِ بینش مجھکو دیتی ہے
زمیں کی بھاپ میں جو بجلیوں کو دیکھ لیتی ہے

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے

"اٹھو، وہ صبح کا غرفہ کھلا، زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ دیکھو پَو پھٹی، غنچے کھِلے، پہلی کرن پھوٹی!"

"اٹھو، چونکو، بڑھو، منہ ہات دھوؤ، آنکھ کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو"

جوشؔ ملیح آبادی

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اِک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اِک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

آزاد انصاری

پیغامِ وطن

اے معززِ طبقۂ حکام رس
اے گروہِ کامگار و کام رس

اے حکومت کی نظر میں لائقو
اے وفا کیشی میں سب پر فائقو

اے اصولِ زرکشی پر عاملو
اے حصولِ منفعت میں کاملو

اے خوشامد کے سُروں سے واقفو
اے غلامی کے گُروں سے واقفو

اے اجانب سے وفا پر مائلو
اے وطن کی مخلصی کے حائلو

اے خلاصی کی لگن کے دشمنو
اے خود اپنے ہی وطن کے دشمنو

اے بدیسی جال سے ناواقفو
اے خود اپنے حال سے ناواقفو

اے ہمارے دشمنوں کے دوستو
اے ہمارے گوشتو اے پوستو

○

میں نے یہ مانا کہ تم لائق بھی ہو
فرد بھی، ممتاز بھی فائق بھی ہو

تم خطابوں سے بھی سرافراز ہو
مقتدر عہدوں پہ بھی ممتاز ہو

تم کسی سے مال میں بھی کم نہیں
اوج یا اقبال میں بھی کم نہیں

ملک کے صاحب وقاروں میں بھی ہو
سلطنت کے دوست داروں میں بھی ہو

موردِ الطافِ سرکاری بھی ہو
آلۂ کارِ ستم گاری بھی ہو

اختیاراتِ ستم رانی بھی ہیں
فوجداری بھی ہیں دیوانی بھی ہیں

اس طرف تقدیرِ سیم و زرفشاں
اُس طرف صاحب بہادر مہرباں

ٹھیک ہیں جو جو اُمنگیں دل میں ہیں
خوبیٔ قسمت سے پانچوں گھی میں ہیں

لیکن اِک تشویش اِک اُلجھن میں ہوں — کیا اجازت ہے کہ اتنا پوچھ لوں

تم میں سَو گُن تم میں لاکھوں رکھ رکھاؤ — تم سبھی کچھ ہو مگر یہ تو بتاؤ

لب پہ آہِ سرد بھی ہے یا نہیں — دل میں قومی درد بھی ہے یا نہیں

قوم مدت سے ذلیل و خوار ہے — ملک مُدّت سے مصائب زار ہے

ابتلا پر ابتلا ہے اور ملک — ازدحامِ صد بلا ہے اور ملک

آفتیں ہیں اور دُنیائے وطن — شامتیں ہیں اور ابنائے وطن

جس کو دیکھو بند آفت کا اسیر — جس کو پوچھو بے نوا مفلس، فقیر

کوئی بے کاری کے غم سے جاں بلب — کوئی ناداری کے سم سے جاں بلب

ملک کا ملک آفتوں سے ادھ موا — قوم کی قوم اور غلامی کا جوا

دوستو وہ پاسِ عزت کیا ہوا — وہ پرِ احساسِ عزت کیا ہوا

یوں نہ بے شرمی کی ٹھانی چاہیے — اب تمھیں بھی غیرت آنی چاہیے

شرم کھو کر وقت ٹالا بھی تو کیا — پیٹ ڈبو کر پیٹ پالا بھی تو کیا

زیست کا لطف آبرو کے ساتھ ہے — اور اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے

خودکشی کرنے سے کچھ حاصل نہیں — جیتے جی مرنے سے کچھ حاصل نہیں

جورِ باطل سے نہ ڈرنا چاہیے — حق پہ جینا حق پہ مرنا چاہیے

قوم کے یارو مدد کا وقت ہے — ملک کے پیارو مدد کا وقت ہے

آؤ کارِ نیک میں سبقت کریں — آؤ ملکی مشکلیں آساں کریں

آؤ ہر بندِ فلاکت کاٹ دیں — آؤ ہر غارِ ہلاکت پاٹ دیں

آؤ پھر تا منزلِ مقصد بڑھیں — آؤ پھر تا بامِ آزادی چڑھیں

آؤ پھر مِل جُل کے جانیں آڑ دیں — آؤ پھر عزت کے جھنڈے گاڑ دیں

آؤ قومی غم کی شب، دن کر دکھائیں — آؤ ناممکن کو ممکن کر دکھائیں

دوستو آزاد نے بالکل کھلا — تم کو پیغامِ وطن پہنچا دیا

اب قبول و رد کے تم مختار ہو
اپنے نیک و بد کے تم مختار ہو

تعلیم بیداری

کیا کہیں کیوں، یوں رو بقضا ہیں   کیا کہیں کیوں غیروں سے خفا ہیں
کیا کہیں کیوں بیزار وفا ہیں   ڈیڑھ صدی سے صرفِ جفا ہیں
آخر جبر گوارا کب تک
آخر صبر کا یارا کب تک

غفلت کر کے جی نہیں سکتے   فاقے بھر کے جی نہیں سکتے
بھوکوں مر کے جی نہیں سکتے   جی سے گزر کے جی نہیں سکتے
اب دل مرنے سے نہیں ڈرتا ہے
آخر مرتا کیا نہیں کرتا

یارو حالِ ملک تو دیکھو   رنگ و بالِ ملک تو دیکھو
فرطِ زوالِ ملک تو دیکھو   قحطِ رجالِ ملک تو دیکھو
آنکھ ہے اور غم خیز مناظر
بالکل یاس انگیز مناظر

کوئی مائل کارِ غلامی ؛   کوئی حاملِ بارِ غلامی
جس کو دیکھو یارِ غلامی ؛   تیس کرور اور غارِ غلامی
کیا کہیں کیا کہنے کی جگہ ہے
ڈوب کے مر رہنے کی جگہ ہے

اٹھو ملک کے لالو اٹھو　　اٹھو ہمت والو اٹھو
اٹھو کام سنبھالو اٹھو　　اٹھو وقت نہ ٹالو اٹھو

فتح کی حکمی شان دکھاؤ
شان دکھاؤ آن دکھاؤ

فکر عبث ہے جان نہ جائے　　جان کا کیا غم، آن نہ جائے
ملکی قومی شان نہ جائے　　مرد بنو میدان نہ جائے

توپوں تیغ کے وار نہ مانو
جانیں دے دو ہار نہ مانو

بڈھو، جوانو، عورتوں، مردو　　کردو، ترک غلامی کردو
گھر دو، در دو، زر دو، سر دو　　بھردو ملک کو دھن سے بھردو

گھر گھر شمعیں روشن کردو
چپہ چپہ گلشن کردو

Scanned by CamScanner

نوائے جرس

بڑھے چلو، بڑھے چلو، بڑھے چلو، بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، غرورِ کارواں ہو تم　　جہانِ پیر کے لئے شبابِ جاوداں ہو تم
تمہارے حوصلے جواں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو
اُٹھائے سر بڑھے چلو، تنے ہوئے غرور سے　　تمہارے قافلے کی شان دیکھتی ہیں دور سے
ہمالیہ کی چوٹیاں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو
سلام موجِ گنگ لو، مجاہدانِ حرّیت　　ہیں گلفشاں بہشت سے پیمبرانِ حرّیت
کھلا ہے عرصۂ جہاں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو
خرابِ بادۂ خودی، مئے عمل پئے ہوئے　　علم بدوش وصف بہ صف کلاہ کج کئے ہوئے
مثالِ بحرِ بیکراں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو
بڑھے ہوئے ہوں حوصلے، چڑھی ہوئی ہو آستیں　　بدل دو صورتِ جہاں اُلٹ دو صفحۂ زمیں
پلٹ دو دورِ آسماں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

قسم تمہارے عزم کی، فدا تمہاری شان کے　　بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے
جھکا دو شاخِ کہکشاں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

بنائے کہنہ توڑ دو، بناؤ اک جہانِ نو　　جہانِ نو، جہانِ نو پہ سقفِ آسمانِ نو
نئے مکیں نئے مکاں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

نہ ہو سوالِ این و آں، نہ ہو تمیزِ بحر و بر　　عبث ہے خوفِ تیرگی، ستارے چھپ گئے اگر
چمک رہی ہیں بجلیاں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

بجھے نہ شمعِ دل کہیں، ہوا ہے تیز باغ کی　　اگر اندھیری رات ہے، بڑھا دو لَو چراغ کی
گرج رہی ہیں آندھیاں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

رُکے نہ پائے جستجو، بچھے ہیں خار راہ میں　　جھکے نہ پرچم و علم، کھڑے ہیں دار راہ میں
مثالِ گردِ کارواں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

جنابِ خضر پیر ہیں، لکیر کے فقیر ہیں　　کماں کے ساتھ کیوں رہیں وہ حوصلے جو تیر ہیں
چو تیر جستہ از کماں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

جو عقل راہ روک دے تو اس کا ساتھ چھوڑ دو　　جو مذہب آ کے ٹوک دے تو اس کی قید توڑ دو
ہوا کی طرح سرگراں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

کھلے ہیں پھول زخم کے، اجل گلے کا ہار ہے　　لہو سے سُرخ ہیں کفن یہ مژدۂ بہار ہے
نثارِ تیغِ خوں فشاں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

درائے کارواں ہوں میں، درائے کارواں سنو　　مخدّراتِ فاقہ کش کی دُکھ بھری فغاں سنو
سنو پیامِ بیکساں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

غریب لال قوم کے، بلک رہے ہیں بھوک سے　　خدا کا عرش ہل رہا ہے، ماستا کی ہوک سے
گرے نہ سر پہ آسماں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں　بڑھے چلو بڑھے چلو

سروں سے باندھ کے کفن، بڑھے چلو بڑھے چلو　　امیدِ مادرِ وطن، بڑھے چلو بڑھے چلو
دعائیں دے رہی ہے ماں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں　بڑھے چلو بڑھے چلو

جو راہ میں ٹھہر گئے، نہیں مقام پیش و پس　　جو ہم سفر بچھڑ گئے تو چھیڑو نالۂ جرس
سُنو جمیں کی فغاں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

جوش ملیح آبادی

نعرۂ شباب

ہوشیار! اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار! — اے خلش نا آشنا پیری و شیبِ ہرزہ کار!
اُڑ گیا روئے زمین و آسماں سے رنگِ خواب — جھلملاتی شمع رخصت ہو کہ اُبھرا آفتاب
ہٹ کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں — خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں، چھا جاتا ہوں میں
اے قدامت! یہ کھلی ہے سامنے راہِ فرار! — بھاگ وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار
کام ہے "میرا تغیّر" نام ہے میرا شباب — میرا نعرہ "انقلاب و انقلاب و انقلاب"
کوئی قوت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں — کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں
رنگ سورج کا اُڑاتا ہے مرے سینے کا داغ — بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رُخ میرا چراغ
سنگ و آہن میں مری نظروں سے چھِد جاتی ہے پھانس — آندھیوں کی میرے میداں میں اُکھڑ جاتی ہے سانس
دیکھ کر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے — موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے

الاماں کبر و ریا آلودہ پیری الاماں! — اب کڑکتی ہے ترے سر پر جوانی کی کماں
ہاں تو ہی ہے وہ، جنوں نے جس کے ٹکڑے کر دیا — سبحہ و زنار کی اُلجھن میں رشتہ قوم کا
ہو جو غیرت ڈوب مر، یہ عمر، یہ دورِ جنوں — دشمنوں کی خواہشِ تقسیم کے صیدِ زبوں
یہ ستم کیا اے کنیزِ کفر و ایماں کر دیا — بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا
کر دیا طولِ غلامی نے تجھے کوتہ خیال — چھُریاں ہیں یہ ترے مُنہ پر کہ غدّاری کا جال
دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو اے دھندلی نگاہ — سر بھڑک اُٹھتا ہے لیکن ہے ابھی تک دل سیاہ
پیٹ کے بل ناسزا! پنجاب میں رینگی تھی تو — تیری اس بے غیرتی پر گرم ہے اب تک لہو

ابن آدم اور رینگے خاک پر! اللہ رے قہر! — سانپ کا اس رینگنے سے آگیا ہے مجھ میں زہر!
پوپلے منہ ختم کر یہ عاقبت بینی کا شور — دیکھ اب بزدل مرے ناعاقبت بینی کا زور
چہرۂ امروز ہے میرے لئے ماہِ تمام — خوفِ فردا ہے مری رنگیں شریعت میں حرام
تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر — خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر
اور تمنائیں ہیں تیری سسکیاں بھرتی ہوئی — اونگھتی، کڑھتی، بلکتی، کانپتی، ڈرتی ہوئی
تیری باتوں سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش — "کفر و ایماں"، "کفر و ایماں" تا کجا، خاموش باش!
حبِ انساں، ذوقِ حق، خوفِ خدا کچھ بھی نہیں — تیرا ایماں چند وہموں کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرے جھوٹے کفر و ایماں کو مٹا ڈالوں گا میں — ہڈیاں اس کفر و ایماں کی چبا ڈالوں گا میں!
ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے — فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے
ڈال دوں گا طرحِ نو "اجمیر" اور "پریاگ" میں — جھونک دوں گا "کفر و ایماں" کو دہکتی آگ میں
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زر فشاں — ثبت ہو گا جس کی زریں جلد پر "ہندوستاں"
اس نئے مذہب پہ سارے تفرقے واروں گا میں — تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں
پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا — گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا
ولولوں سے برق کے مانند لہرایا ہوا — موت کے سائے میں رہ کر، موت پر چھایا ہوا
خون میں لتھڑی بساطِ کفر و دیں الٹے ہوئے — فخر سے سینے کو تانے، آستیں الٹے ہوئے

کوثر و گنگا کو اِک مرکز پہ لاؤں تو سہی
اِک نیا سنگم زمانے میں بناؤں تو سہی

آنند نرائن مُلّا

محبّانِ وطن کا نعرہ

شہیدِ جورِ گلچیں ہیں اسیرِ خستہ تن ہم ہیں
ہمارا جرم اتنا ہے ہوا خواہِ چمن ہم ہیں

ستانے کو ستا لے آج ظالم جتنا جی چاہے
مگر اتنا کہے دیتے ہیں فدائے وطن ہم ہیں

ہمارے ہی لہو کی بو صبا لے جائے گی کنعاں
ملے گا جس سے یوسف کا پتہ وہ پیرہن ہم ہیں

ہمیں یہ فخر حاصل ہے پیامِ نور لائے ہیں
زمیں پہلے پہل چومی ہے جس نے وہ کرن ہم ہیں

سُلا لے گی ہمیں خاکِ وطن آغوش میں اپنی
نہ فکرِ گور ہے ہم کو نہ محتاجِ کفن ہم ہیں

بنا لیں گے ترے زنداں کو بھی ہم غیرتِ محفل
لئے اپنی نگاہوں میں جمالِ انجمن ہم ہیں

نہیں تیشہ تو سر ٹکرا کے جوئے شیر لائیں گے
بیابانِ جنوں میں جانشینِ کوہکن ہم ہیں

زمانہ کر رہا ہے کوششیں ہم کو مٹانے کی
بلا پاتا نہیں جس کو وہ بنیادِ کہن ہم ہیں

نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ عہدہ ہے، نہ طاقت ہے،
مگر کچھ بات ہے، ہم ہیں کہ جانِ انجمن ہم ہیں

ترے خنجر سے اپنے دل کی طاقت آزمانا ہے
محبت ایک اپنی ہے ترا سارا زمانہ ہے

فدائے ملک ہونا حاصلِ قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر جان دینے ہی کو ہم جنت سمجھتے ہیں

کچھ ایسے آ گئے ہیں تنگ ہم کُنجِ اسیری سے
کہ اب اس سے تو بہتر گوشۂ تربت سمجھتے ہیں

ہمارے شوق کی وارفتگی ہے دید کے قابل
پہنچتی ہے اگر ایذا اسے راحت سمجھتے ہیں

نگاہِ قہر کی مشتاق ہیں دل کی تمنائیں
خطِ چینِ جبیں ہی کو خطِ قسمت سمجھتے ہیں

وطن کا ذرّہ ذرّہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہے
نہ ہم مذہب سمجھتے ہیں نہ ہم ملت سمجھتے ہیں

حیاتِ عارضی صدقے حیاتِ جاودانی پر
فنا ہونا ہی اب اک زیست کی صورت سمجھتے ہیں

ہمیں معلوم ہے اچھی طرح تابِ خفا تیری
مگر اس سے سوا اپنی حدِ الفت سمجھتے ہیں

غم و غصہ دکھانا اک دلیلِ ناتوانی ہے
جو ہنس کر چوٹ کھاتی ہے اسے طاقت سمجھتے ہیں

غلامی اور آزادی بس اتنا جانتے ہیں ہم
نہ ہم دوزخ سمجھتے ہیں نہ ہم جنت سمجھتے ہیں

دکھانا ہے کہ لڑتے ہیں جہاں میں باوفا کیونکر
نکلتی ہے زباں سے زخم کھا کر مرحبا کیونکر

ساغر نظامی

ترانۂ شباب

اے نوجوانو، نوجوانو توڑ دو بندِ زارِ غلامی
خوش جمالو، نونہالو پھینک دو سر سے بارِ غلامی
اے حسین و علی کے سپوتو اے محمد کے شہ زور بیٹو
نسل سے بادشاہوں کی تم ہو
پھر بھی ہو یادگارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو
ابھمینو کی اولاد تھے تم عہدِ ماضی کی روداد تھے تم
یاد ہے پہلے آزاد تھے تم
اب ہو اک یادگارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو
یہ تمہاری چھلکتی جوانی اور یہ لعنتِ جاودانی
یہ سراسیمگی سرگرانی
یہ دلِ داغدارِ غلامی!!

اے جوانو، نوجوانو

اِس غلام آسماں کو اُلٹ دو   ارضِ ہندوستاں کو اُلٹ دو
ہو سکے تو جہاں کو اُلٹ دو
کیوں ہے باقی دیارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو
ختم ہو دَورِ بربادیوں کا   وقت ہے عالمِ ایجادیوں کا
کردو اعلان آزادیوں کا
ہو چکا اشتہارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو
اپنی عزت کی بنسی بجاؤ   اپنی عظمت کی بھیری بجاؤ
آتش افشاں نفیری بجاؤ
پھونک دو نغمہ زارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو
یہ وطن ساری قوموں کا ملجا   یہ وطن مسکن اہلِ وفا کا
یہ وطن ساری دُنیا کا کعبا
اور یوں شرمسارِ غلامی!

اے جوانو، نوجوانو
آن ظاہر ہو اہل وغا کی   شان ظاہر ہو دستِ خدا کی
ہے جہاں قبر اہلِ وفا کی
اب وہاں ہو مزارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو
نغمے نغمے سے بیراگ برسے   ہر طرف آتشیں راگ برسے
ہر طرف سے نئی آگ برسے
جل اُٹھے کاروبارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو

ساغر نظامی

عہد

جب طلائی رنگ سکّوں کو نچایا جائے گا جب مری غیرت کو دولت سے لڑایا جائے گا
جب رگِ افلاس کو میری دبایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
اور اپنے پاؤں سے انبارِ زر ٹھکراؤں گا
جب مجھے بیڑوں سے عریاں کر کے باندھا جائیگا گرم آہن سے مرے ہونٹوں کو داغا جائے گا
جب دہکتی آگ پر مجھ کو لٹایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا
اے وطن جب تجھ پہ دشمن گولیاں برسائیں گے سُرخ بادل جب فصیلوں پر تری چھا جائیں گے
جب سمندر آگ کے برجوں سے ٹکر کھائیں گے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیغ کی جھنکار بن کر مثلِ طوفاں آؤں گا
گولیاں چاروں طرف سے گھیر لیں گی جب مجھے اور تنہا چھوڑ جائے گا مرا مرکب مجھے
اور سنگینوں پہ چاہیں گے اُٹھانا سب مجھے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
مرتے مرتے اک تماشائے وفا بن جاؤں گا

خون سے رنگین ہو جائے گی جب تیری بہار　　سامنے ہوں گی مرے جب سرد لاشیں بے شمار
جب مرے بازو پہ سر آ کر گریں گے بار بار
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
اور دشمن کی صفوں پر بجلیاں برساؤں گا

جب درِ زنداں کھلے گا برملا میرے لئے　　انتہائی جب سزا ہوگی روا میرے لئے
ہر نفس جب ہوگا پیغامِ قضا میرے لئے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
بادہ کش ہوں زہر کی تلخی سے کیوں گھبراؤں گا

حکمِ آخر قتل گہ میں جب سُنایا جائے گا　　جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے گا
جب ہٹا یک تختۂ خونی ہٹایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

عرشؔ ملسیانی

ہمارا وطن

پھلوں سے لدے جس کے اشجار ہیں　　　مہکتے ہوئے جس کے گل زار ہیں
نرالی ہے جس کے گلوں کی پھبن　　　ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

گلاب اور جوہی کی جس میں بہار　　　سمن ہے جہاں پر چمن کا سنگار
کھلے ہیں جہاں نرگس و نسترن　　　ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

ہے پورب سے پچھم نرالا جہاں　　　ہے اتر کا دولھا ہمالہ جہاں
کماری جہاں ہے عروسِ دکن　　　ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

کہیں گومتی، بیاس، گوداوری　　　کہیں گھاگرا، نربدا، تاپتی
کہیں جس میں بہتے ہیں گنگ و جمن　　　ہمارا وطن ہے ہمارا وطن
ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

ہر اک پھل، ہر اک پھول، ہر رُت جہاں　　ہواؤں میں جس کی ہے عنبر نہاں
فضائیں ہیں جس کی چمن در چمن　　ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

پپیہا الاپے جہاں پی کہاں　　سُنائیں عنادل ترانے جہاں
ہے آموں پہ کوئل جہاں نغمہ زن　　ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

اناج اور میووں کی کثرت جہاں　　ہے پانی میں بھی اک حلاوت جہاں
جو ہم کو بناتا ہے شیریں سخن　　ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

کیا جس کی مٹّی نے پیدا ہمیں　　نہ کیوں فخر سے اس کا ہم نام لیں
کہیں مل کے سب شیخ اور برہمن　　ہمارا وطن ہے ہمارا وطن

ہمارا وطن سب سے پیارا وطن

انور صابری

آزادی کے دیوانے

ہم آزادی کے دیوانے یہ دنیا فرزانوں کی
اس پاپی سنسار میں بابا کون سُنے دیوانوں کی
مسجد - مندر - سب کے اندر راج غلامی کرتی ہے
دولت لے کر نام خدا کا گھر گھر دھرنا دھرتی ہے
کوٹھی - بنگلے - گورے سانپوں کی اک ایسی بستی ہے
جو بھارت کے بھولے بھالے انسانوں کو ڈستی ہے
ان سے بچ کر چلنا بابا یہ قاتل زہریلے ہیں
صورت کے موہن ہیں بھیترسے سب نیلے پیلے ہیں
شیدا ہوں آزادی کا آزاد نگر میں ڈیرا ہے
کیا بتلاؤں میرے بھیا کون جہاں میں میرا ہے
وہ میرا جو آزادی کی زلفوں کا دیوانہ ہے
وہ میرا، جو شمع وطن کا شیدائی پروانہ ہے
وہ میرا، موت کے آگے بے جگری سے تنتا ہے
وہ میرا، جو آپ نہ ہو کچھ جس کی سب کچھ جنتا ہے
وہ میرا جو ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ جاتا ہے
وہ میرا، جو موت سے بھی دو چار قدم بڑھ جاتا ہے
آزادی کے طالب سُن لے موت ہی میری منزل ہے
تو دنیا کا بن سکتا ہے میرا بننا مشکل ہے

علی جواد زیدی

حیات

غنودگی ہے قضا کی نگاہِ دنیا میں — جھلک حیات کی شہروں میں ہے نہ صحرا میں
نسیمِ صبح کی رفتار میں گرانی ہے — دلوں کا درد بھرا ہے خروشِ دریا میں
فضائے کعبہ و مسجد خزاں سے بوجھل ہے — سکوتِ مرگ ہے بت خانہ و کلیسا میں
اِدھر ہے موت کی ظلمت اُدھر مسافر نے — کیا ہے عزمِ سفر زیست کی تمنا میں

حیاتِ گم شدہ! آخر ترا مکاں ہے کہاں؟
ترا مکاں ہے جہاں وہ حسیں جہاں ہے کہاں؟

جو تو نہیں ہے تو ہر سمت اک اداسی ہے — ہے دل میں شوق کا طوفاں نگاہ پیاسی ہے
تلاشِ زیست میں سر مارتے ہیں دیوانے — ہر ایک سمت عجب خوف و بدحواسی ہے
بہت عظیم بنایا فلک کو مذہب نے — مگر وہاں بھی تو کچھ ایسی ہی فضا سی ہے
غرض ہواؤں میں سنتا ہوں بس یہی ہر دم — کہ زندگی ہی کا مسئلہ یہاں اساسی ہے

سنا ہے عرش بھی ہے محوِ گفتگوئے حیات
ملائکہ بھی ہیں مصروفِ جستجوئے حیات

یہ وحی اُتری ہے مُلّا کے پاک سینے پر — "سکوں حرام ہے لعنت ہے ایسے جینے پر"
یہ کون حضرتِ مُلّا، وہی جو کہتے تھے — "رکھو نہ پاؤں کبھی زندگی کے زینے پر"
کہ زیست بندۂ مسلم کو غرق کرتی ہے — "بٹھا کے بھوک کے حرص آخریں سفینے پر"

نظرِ برہمن و راہب کی کل تھی طالبِ روح　　　جمی ہے آج مگر جسم کے پسینے پر

حیات تیری بزرگی کا بول بالا ہے
مرے مکاں کے سوا ہر طرف اُجالا ہے

یہاں تو کہتی ہوئی آ کہیں "اُمنگ میں ہوں"　　　ذرا یہ گیت کبھی گا دے کہ "شوق جنگ میں ہوں"
یہ کہدے کان میں سوئی ہوئی تمنا کے　　　کہ "ہوشیار ہو میں آج پھر ترنگ میں ہوں"
سُنا دے ظلم و تعدّی کے کوہساروں کو　　　کہ "میں شرارِ نہفتہ دماغِ سنگ میں ہوں"
ذرا وسیع بنا دے کہ دم اُلجھتا ہے　　　کئی صدی سے گرفتارِ صحنِ تنگ میں ہوں

نظامِ نو سے بدل کر نظامِ دیرینہ
مٹا دے صفحۂ دل سے پیامِ دیرینہ

طلوع ہو کہ اندھیرا ہے میری منزل میں　　　تجھی ہو گا ہر اک شمع میری محفل میں
جو تو ملے تو بدل دوں ہوا زمانے کی　　　کئی برس سے ہے یہ آرزو مرے دل میں
چمک میں جس کی تڑپتی ہو عشرتِ جاوید　　　تجھے بناؤں میں وہ شمشیر دستِ قاتل میں
بھنور میں ڈوبنے والوں کو بھی سہارا دوں　　　تجھے اُمید بنا کر کنارِ ساحل میں

کبھی مری رگِ جاں میں نظر سے فصد تو کر
کبھی ذرا مری بزمِ عمل کا قصد تو کر

نقاب رخ سے اُلٹ دے دکھا دے حُسنِ کمال　　　ترا عروج ہو سطحی رقابتوں کا زوال
ترے نظام میں دیر و حرم کی قید کہاں؟　　　یہ ساری جنگ حرام اور ایک جنگ حلال
یہ جنگ وہ ہے کہ انسان سر اُٹھائے گا　　　حیات و موت کی دو طاقتوں میں ہو گی جدال
عروسِ زیست کے ہجراں نصیب عاشق کو　　　زمانہ دے گا نویدِ خوشی، پیامِ وصال

بہت ہی جلد وہ ساعت بھی آنے والی ہے
کہ تیرے رخ پہ نمو کی حسین لالی ہے

احسان بن دانش

ناقوس بیداری

ہوشیار اے ہند اے غفلت شعاروں کے دیار
نالہ برلب ہیں ترے اُلجھے ہوئے لیل و نہار

اب ترے سر میں ترقی کا جنوں باقی نہیں
اب ترے انصاف کی نبضوں میں خوں باقی نہیں

سایہ ہے ابر تعطّل کا تری تنظیم پر
چل گیا تخریب کا افسوں تری تعلیم پر

پیستے ہیں دانت سناٹے ترانوں پر ترے
خارزاروں کی نظر ہے گلستانوں پر ترے

شاہراہوں میں بھیانک خامشی چھانے کو ہے
خون ہر ذرّے کی آنکھوں میں اُبل آنے کو ہے

آگیا خورشید سر پر کھول آنکھیں بے خبر
اپنی غفلت غیر کی بیداریوں پر کر نظر

ناخدا تیرے نہنگانِ اجل ہیں سر بسر
اپنی غرقابی سے پہلے انکے بیڑے غرق کر

جس قدر ہیں پیشوایانِ تمدّن فتنہ خو
تیرے درماں کے لئے اکسیر ہے ان کا لہو

جن کی خواہش ہے کہ بجھ جائے اخوت کا چراغ
پیس دے گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے انکے دماغ

دل کا کینہ رات بھر بیتاب رکھتا ہے انھیں
دیدۂ دولت طلب بیتاب رکھتا ہے انھیں

شوق سلطانی بنا دیتا ہے اُن کو ہرزہ کار
ان کے مذہب کا نہ اُن کی دوستی کا اعتبار

بیکسی مزدور کی جرأت دلاتی ہے انھیں!
آنسوؤں کی شبنمی میں نیند آتی ہے انھیں

یہ وہ محسن ہیں جو کر دیتے ہیں قوموں کو ہلاک
اُن کے دم سے ہر شرافت کا گریباں چاک چاک

مورچے یہ کبر و نخوت کے اُڑا کر پھینک دے
دمدمے ان کی سیاست کے اُڑا کر پھینک دے

اردو میں

قومی شاعری

کے

سو سال

سنہ ۱۸۳۵ء سے سنہ ۱۹۴۱ء تک

جعفر علی خاں اثر

زمزمۂ آزادی

صبح کے شہپرِ رنگیں پہ آتے پھرتے ہیں
فکر کیا تاک میں صیاد پڑے پھرتے ہیں
زمزمے طائروں کے وادی و گلشن کی طرف
بلبلیاں رشک سے تکتی ہیں نشیمن کی طرف

○

بلبلِ رشتہ بپا سنتے ہی پیغامِ سحر
گو نہیں ولولہ انگیز فضا یا منظر
گیت گاتی ہے طرب خیز پئے عشرتِ غیر
دل میں کینہ ہے کسی سے نہ عداوت ہے نہ بیر

○

شبنمِ گل بھی نہیں جس سے زباں تر کر لے
آہ اتنا بھی نہیں سانس جو ٹھنڈی بھر لے
یا مصیبت میں شریکِ غمِ پنہاں ہو کوئی
حالتِ زار کا یا لطف سے پرساں ہو کوئی

○

آنکھ نمناک نہ دل کوئی محبت والا
ہے بہت ایسے میں اتنا بھی سہارا پانا
یہی کیا کم ہے سحر شکل دکھا جاتی ہے
روشنی ٹوٹی ہوئی آس بندھا جاتی ہے

○

ہمنوا اس کے ہیں آزاد غنیمت ہے یہی
وہ اگر خوش ہیں تو یہ شاد محبت ہے یہی
اس تصور سے اسیری کی تعب گھٹتی ہے
دن گزرتا ہے یونہیں رات یونہیں کٹتی ہے

اور وہ قید جو ہو جنگ میں آزادی کی　　خوابِ غفلت کی ٹھٹھر دور کرے جس کی صدا
روح دوڑا دے دلِ سنگ میں آزادی کی　　شیر دل سحر بیاں اپنے وطن کا شیدا

○

کیوں نہ ہو قہقہہ زن قیدیٔ زنداں ہو کر　　کیا الم ہے وہ اگر طوق و سلاسل میں ہے
ظلمتیں دور ہوئیں خواب پریشاں ہو کر　　میر منزل نہ سہی قافلہ منزل میں ہے

○

دیکھنا صبح ہوئی پنجۂ شب سے آزاد　　کس حشم سے وہ دمکتا ہوا سورج نکلا
دیس کا دیس ہوا رنج و تعب سے آزاد　　وہ مساوات کا ہر سمت اُجالا پھیلا

○

چیخ اُٹھا دیو غلامی کا چھپا کر منھ کو　　کھو گیا صبح کی تنویر میں سایہ بن کر
دیکھو، دیکھو وہ اُڑا صبح کا پرچم دیکھو!　　آفریں آفریں اس عزم پر اس ہمت پر! !

○

صبح کے شہپر رنگیں پہ اُڑے پھرتے ہیں
زمزمے طائروں کے وادیٔ گلشن کی طرف
فکر کیا تاک میں صیاد پڑے پھرتے ہیں
بجلیاں رشک سے تکتی ہیں نشیمن کی طرف

ے جو ابر لال جی کی اسیری کی طرف اشارہ ہے۔

ظفر علی خاں

نویدِ آزادیٔ ہند

وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستاں ہو گا
مبارک باد اُس کو دے رہا سارا جہاں ہو گا

علم لہرا رہا ہو گا ہمارا رائے سینا پر
اور اونچا سب نشانوں سے ہمارا یہ نشاں ہو گا

زمیں والوں کے سر خم اس کے آگے ہو رہے ہونگے
سلامی دے رہا جھک جھک کے اُس کو آسماں ہو گا

برہمن مندروں میں اپنی پوجا کر رہے ہوں گے
مسلماں دے رہا اپنی مساجد میں اذاں ہو گا

جنھیں دو وقت کی روٹی میسر اب نہیں ہوتی
بچھا اُن کے لئے دنیا کی ہر نعمت کا خواں ہو گا

من و تو کے یہ جتنے خرخشے ہیں مٹ چکے ہوں گے
نصیب اُس وقت ہندو اور مسلماں کا جواں ہو گا

توانا جب خدا کے فضل سے ہم ناتواں ہو نگے
غرور اُس وقت انگریزی حکومت کا کہاں ہو گا

ء ۱۹۳۶ء میں رنگون کے ٹاؤن ہال میں کانگریس کا پرچم لہرائے جانے کی تقریب پر پڑھی گئی۔

شعاعِ اُمید

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام

مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایام

نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

○

آفاق کے ہر گوشے سے اُٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیاہ پوش

مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

○

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اُٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ جس کا ہے خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

آئین جدید[1]

ہند کے سر پر مسلط ہو گیا آئینِ نو
مکر و استبداد کی چوٹی سے فرما کر نزول

مغربی کاغذ تراشوں نے کم و بیش اک صدی
صرف کی ہے تب بنا پایا ہے یہ خوشرنگ پھول

یہ وہ نسخہ ہے جو "بیمارِ توانا" کے لئے
رہنمائی کر سکے گا تا بہ سرحدِ "زبول"

یہ وہ چشمہ ہے کہ جس کے سامنے آبِ فرات
اپنی خستت اہلِ حق کے واسطے جائیگا بھول

جان بُل صاحب ہیں کتنے شکریے کے مستحق
دیدیا ہندوستانی وحشیوں کو ہوم رول

اُن کا فرمانا اگر سچ ہے تو سچ کہتے ہیں وہ
یہ وہ نعمت ہے بہت دشوار تھا جس کا حصول

ہے حکومت کی یہ فیاضی بہت ہی شاندار
اس رعایا پروری پر دنگ ہے عقلِ مغول

○

اُن کو حیرت ہے کہ اتنی خوبیوں کے باوجود
ملک والے کس لئے ہیں اسکے اجراء سے ملول

کس لئے دھرتے ہیں اسکے نام سے کانوں پہ ہاتھ
کیوں نہیں کرتے بلا چون و چرا اسکو قبول

خیر مقدم ہے کہیں اس کا سیہ پرچم کے ساتھ
ہے کہیں ہڑتال کی صورت میں اظہارِ عدول

ہے کہیں جلسوں میں پاس اسکے لئے لعنت کا ووٹ
ہے جلوسوں میں کسی جا اس کے سر پر خاک دھول

کوئی دیتا ہے اسے تشبیہ خارستان سے
کوئی کہتا ہے اسے باغِ سیاست کا ببول

○

میں یہ کہتا ہوں یہ سب ہنگامۂ بحث و نزاع
دیکھئے چشمِ حقیقت سے تو ہے بالکل فضول

ملک والوں سے حکومت کی ہے یہ اک دل لگی
آج اس کو حق بھی ہے اسکا کہ ہے اپریل فول[2]

---

[1] گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء۔ [2] یہ ایکٹ یکم اپریل کو نافذ ہوا۔

آرزو لکھنوی

قومی گیت

اے ماں اے ماں تجھ کو سلام، بھارت ماتا کو پرنام

تو تو کیسی پیاری ماں ہے　　سب ماؤں سے اچھی ماں ہے
لاڈ اُٹھانے والی ماں ہے　　اپنی ماں ہے اپنی ماں ہے

ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

تیری مانگ میں گنگا جل ہے　　بھرا پرُا تیرا آنچل ہے
ہریالی ہے پھول ہے پھل ہے　　تیری گودی سُکھ منڈل ہے

ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

سب سے اونچے پربت والی　　سب سے بڑھ کر شوکت والی
سب سے بھاری دولت والی　　عزت والی عظمت والی

ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

تیری چھاتی دھرم سمندر　　جس کی موجیں مسجد مندر
دونوں کی ہے گونج برابر　　اللہ اللہ، ایشور ایشور

ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

ہندو مسلم گورے کالے　　پریم کی دارو کے متوالے
سب ہیں تیری گود کے پالے　　سب ہیں بات پہ مرنے والے

ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

تیرے دودھ کی سب میں طاقت　　اُلفت، عزت، ہمت، جرأت
تیری دعائیں فتح و نصرت　　تیرے پاؤں کے نیچے جنت
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

اب تو لیٹرے تجھ کو لوٹیں　　بے بھگتے بھگتان نہ چھوٹیں
ہاتھ میں دھن ہو بازو ٹوٹیں　　گھور کے دیکھیں آنکھیں پھوٹیں
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام

تجھ سے آشیرباد جو پائیں　　آرزوایسے بھی تن جائیں
بجلی بن کر آفت ڈھائیں　　دور ہوں پھر تو ساری بلائیں
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام
اے ماں اے ماں تجھ کو سلام، بھارت ماتا کو پرنام

جمیل مظہری

بھارت ماتا

ماتا، ماتا، پیاری ماتا
بچے تجھ پر واری ماتا

او ماتا! او بھارت ماتا — تجھ پہ خدا کی رحمت ماتا
سندری تو ہریالی تو ہے — دھانی آنچل والی تو ہے
پھول کھلائیں تیری ہوائیں — دھن برسائیں تیری گھٹائیں
شہد کی نہریں دودھ کی دھاریں — گودی میں جنت کی بہاریں
میٹھے میٹھے پھل دیتی ہے — اَن دیتی ہے جل دیتی ہے
کنگن اور چوڑی کی جھنا جھن — شاعر کے دل کی ہر دھڑکن
نام ترا جپتی ہے ماتا — تو کتنی پیاری ہے ماتا
چاندنی راتوں کے جلوے میں — بندرابن کے سناٹے میں
جب تاروں کی سبھا سجتی ہے — ہردے کی بنسی بجتی ہے
آدھی رات کو کالی کوئل — موسم کی متوالی کوئل
پھیلتی ہے جب آم کی خوشبو — گیت ترا گاتی ہے کو کو
جگ دیتا ہے تجھ کو دعائیں — ہم تیرا گن کس طرح نہ گائیں

ماتا تو ہے ہماری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

ہے مشہور تری مہمانی پورب پچھم تیری کہانی
تبریزی، طوسی، شیرازی مصری، رومی اور حجازی
ارمینی، چینی، جاپانی پی کر تیرا میٹھا پانی
ہو گئے سو جی جان سے تیرے ڈال دئے گنگا پر ڈیرے
گھر کو چھوڑا در کو چھوڑا تجھ سے اپنا ناتہ جوڑا
تو نے انھیں گودی میں اٹھایا پالا اور پروان چڑھایا
تیرا گھر ہے سب کو پیارا سر او نچا کیوں ہو نہ ہمارا
سب کی ماتا ہماری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا
جگ ماتا بھارت مہرانی ستونتی، دھنونتی، گیانی
تجھ پہ سلام اے سوہنی ماتا جگ ماتا، جگ موہنی ماتا
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی تیری گود میں بھائی بھائی
جھنڈوں میں تیرے بادل کے سایہ میں تیرے آنچل کے
مسجد، گرجا اور شوالہ لنکا سے تا کوہ ہمالہ
گنگا اور جمنا کی روانی کہتی ہے ماتا تیری کہانی
امریکہ کے ایوانوں میں افریقہ کے میدانوں میں
مصر و عجم کے بازاروں میں یورپ کے دولت زاروں میں
ملک عرب کی پاک فضا میں مکے کے تپتے صحرا میں
تیری بیلیں جاری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا
او دیالو ماں، او داتی ماں ستونتی ماں، کلیانی ماں
آنچل میں تیرے دھن برسیں اور ترے بچے اُن کو ترسیں
من کے روگی پیٹ کے مارے جیتے ہیں غیروں کے سہارے
ذلت، رسوائی، بدنامی سنو دھتکاریں ایک غلامی

کیسی ہوا پچھم سے آئی — جل گئی تیری کھیتی مائی
ویرانی ہر سمت برستی — اُجڑی نگری سونی بستی
کیا ہوئیں وہ معمور فضائیں — دولت کی بہتی گنگائیں
نورتنی دربار کہاں ہے — پرتابی تلوار کہاں ہے
ماں تیری تقدیر ہے کیسی — ہاتھوں میں زنجیر ہے کیسی
ہاتھ بندھے ہیں بال کھلا ہے — مانگ اُجڑی ہے سر ننگا ہے
وہ تیموری تاج کہاں ہے — چندر بنسی راج کہاں ہے
مکھڑا کیوں میلا میلا ہے — کاجل کیوں پھیلا پھیلا ہے

آنسو کیوں ہیں جاری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

آ، ہم تیرے بال سنواریں — تجھ پر اپنی جانیں واریں
سیس ترے چرنوں پہ نوائیں — پیت کے میٹھے منتر گائیں
قومیت کی کڑیاں جوڑیں — لعنت کی زنجیریں توڑیں
نام ترا لے لے کے پکاریں — سوتی غیرت کو للکاریں
پیاری ماں من کیوں میلا کر — سر اونچا کر اور اونچا کر
دیکھ اپنے بچوں کا لشکر — ٹھاٹھیں لے جس طرح سمندر
دیکھ کھڑے ہیں تیرے سپاہی — رُخ پہ جلالِ شاہنشاہی
جنتا اُن کو کیوں نہ دعا دے — چتون سے ظاہر ہیں ارادے
لہراتا ہے ہاتھ میں جم جم — ماں تیرے اقبال کا پرچم
جب کہتے ہیں جے ماتا کی — دُنیا گونج اُٹھتی ہے خدا کی
ماتا تیرے دودھ کی دھاریں — کیوں نہ رگوں میں موجیں ماریں
گھر کو تجے تن من کو تیاگے — نعرے ہیں آکاش سے آگے
جیوٹ ہیں یہ جیالے ہیں یہ — تیری گود کے پالے ہیں یہ
تیرے لئے جانوں پر کھیلے — لے لے ان کی بلائیں لے لے

یہ تجھ کو آزاد کریں گے　　گھر تیرا آباد کریں گے

مت رو اے دکھیاری ماتا

پیاری ماتا پیاری ماتا

یاد ہے ماں وہ تیرا زمانہ　　تختِ شہانہ، تاجِ شہانہ

گرد ترے بھگتوں کی قطاریں　　ہاتھوں میں ننگی تلواریں

کیا ہوئے ماں وہ تیرے جیالے　　ٹیڑھی ترچھی پگڑی والے

کاندھے جن کے تخت کے پائے　　پرجا پر بھگوان کے سائے

طوفانوں کو جھیلنے والے　　موت سے اپنی کھیلنے والے

نظریں اس منظر کی پیاسی　　آنکھوں میں ہے جنگِ پلاسی

یاد ہیں وہ چلتی تلواریں　　وہ جھنکاریں وہ للکاریں

سینے تانے تیرے پیارے　　جی کو توڑے جان کو ہارے

گونجے، گرجے، برسے، کڑکے　　مر گئے تیرے نام پہ لڑ کے

گونگی دنیا بول رہی ہے　　دھرتی اب تک ڈول رہی ہے

للکاریں اس گونجتے رن کی　　موہن لال اور میر مدن کی

ہیں اب تک بےچین فضا میں　　بھٹکی پھرتی ہیں صحرا میں

ٹکراتی رہتی ہیں دلوں سے　　جیسے ہوا اٹھتے پودوں سے

ماں وہ تیرے کوکھ کے بچے　　دھن کے پکے قول کے سچے

ہو گئے تیری لاج پہ قرباں　　تیرے مقدس تاج پہ قرباں

اب ہے ہماری باری ماتا

ماتا، ماتا، پیاری ماتا

او ماتا، گوتم کی ماتا　　ارجن اور بھیشم کی ماتا

ٹیپو کی ماں، اکبر کی ماں　　ستونتی ماں، بلونتی ماں

شکتی تجھ سے ست تجھ سے ہے　　مت تجھ سے ہمت تجھ سے ہے

شورش دے، سودا دے، سر دے　　دل کا دیا پھر روشن کر دے

دار و رسن کا کھیل سکھا دے — نام پہ اپنے بھینٹ چڑھا دے
ٹیپو اور پورس پیدا کر — ایک اُٹھے تو دس پیدا کر
دیس کا ہر سیوک ہو آندھی — ہر بچہ آزاد اور گاندھی
ہر پُتری ہو سروجنی مائی — ہر مائی ہو لکشمی بائی
ہر دل میں اک طوفاں کر دے — شعلہ بھر دے، بجلی بھر دے
جی میں اپنے لگن پیدا کر — مَن اُجلا کر، تن اُجلا کر
جیون دے، جیون کا پھل دے — شکتی دے، ہمت دے، بل دے

زنجیریں ہیں بھاری ماتا
پیاری ماتا پیاری ماتا

ماتا، ماتا، پیاری ماتا — بچے تجھ پر واری ماتا

جوش ملیح آبادی

وفاداران ازلی کا پیغام
شہنشاہ ہندستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ

اے گدا پیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار

اے ہمارے عالموں کے "حامئ دینِ مبین"
دورِ سیّد* کے "اولی الامر" و "امیرالمومنین"

اے رئیسِ پاک دل اے شہریارِ نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجے سلام

راس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو
یوں ہی رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو

دل کے دریا نطق کی وادی میں بہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھُل کے کہہ سکتے نہیں

لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور
ہند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضور

آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں
تن پہ اک دھجّی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں

تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں
شکر یہ ان روٹیوں کا اے شہِ گردوں نشاں

روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خدّام نے
آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے

آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا
کھا بھی لیں گے آج اگر ڈٹ کر تو کل کھائیں گے کیا

---

* سر سیّد احمد خاں مرحوم

صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام ——— کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام؟
آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قوم نامراد ——— کھائے جاتا ہے اسے خدّامِ عالی کا عناد
معدہ محرومِ غذا ہے کیسہ ہے محرومِ زر ——— آپ کے عمّال نے لوٹا ہے ہم کو اس قدر
آپ کے فرقِ مبارک کو دیا ہے جس نے تاج ——— آج اس بھارت کا سر ہے اور تیغِ احتیاج
ہر جبیں پر ہے شکن، اس کج کلاہی کی قسم ——— ہر مکاں اک مقبرہ ہے قصرِ شاہی کی قسم
آپ کے سر پر ہے تاج اے فاتحِ روئے زمیں ——— اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں

ہم وفا کیش آپ کی نظروں سے کبھی گر جائیں گے
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائیں گے

ہم سے باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات ——— صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات
ہم تو موسیٰ بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے ——— پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں ——— ذرّے ذرّے سے عیاں آثارِ حرب و جنگ ہیں
کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب ——— کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب
گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ ——— آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ
ہم وفادارانِ پیشیں، ہم غلامانِ کہن ——— قبر جن کی کھد چکی تیار ہے جن کا کفن
تند رو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں ——— نوجوانوں کی اُمنگوں کو دبا سکتے نہیں
مدح اب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی ——— جیسے کوئی دھار چھوتا ہے اُبی تلوار کی
آپ سے کیونکر کہیں ہندوستاں پُر ہول ہے ——— آپ کا نام آگ ہے اور کانگریس پٹرول ہے
وہ سرنگیں کھد رہی ہیں الحفیظ و الاماں ——— صرف انگلستان کیا یورپ سما جائے جہاں
نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی ——— صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی
آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عود کی ——— ہندیوں کی سانس سے آتی ہے بو بارود کی
غور سے سُن لیجئے اے خواجۂ عالی نژاد ——— آپ کو دھوکے میں رکھ سکتے نہیں ہم خانہ زاد
کیجئے درماں میں عجلت ورنہ دل ڈر جائیں گے ——— حاکم اپنے گھر چلے جائیں گے ہم مر جائیں گے

چونکئے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرّہ ذرّہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

اقبال احمد سہیل

زمیندار اور کسان

زیارت کل ابھی مشکل تھی جن کے آستانوں کی
وہی اب جا کے چوکھٹ چومتے ہیں قلبہ رانوں کی

جو اپنے ظلم کی فریاد کل ہم سے نہ سنتے تھے
وہی اب ہم کو مظلومی سناتے ہیں کسانوں کی

فضا معمور ہے جن کے ستم کی داستانوں سے
بھلا کیا داد دے سکتے ہیں بے کس بے زبانوں کی

اگر راجے مہاراجے بھی حامی ہیں رعایا کے
تو بے شک بجلیاں بھی پاسباں ہیں آشیانوں کی

مہاجن دوستی کا وہ ہمیں الزام دیتے ہیں
کوئی دیکھے تو یہ ابلہ فریبی ان سیانوں کی

زمینیں جن کی تھیں پہلے زمیندار اب کہاں وہ ہیں
ہوئی نذر مہاجن جائداد اگلے گھرانوں کی

بہت وہ ہیں جنھوں نے ملک سے غداریاں کی ہیں
زمینیں لیں مٹا کر آبروئیں خاندانوں کی

خدا کی شان آج انصاف کے طالب ہیں وہ ہم سے
سیاہی تک ابھی سوکھی نہیں جن کے فسانوں کی

جماعت جن کی برٹش پہلے ہے اور انڈین پیچھے
وہ اٹھے ہیں حمایت کو وطن کے ناتوانوں کی

یہ برٹش انڈین کی دو رخی ترکیب کیا کہنا
وطن سے لاگ بھی ہے اور لگن بھی حکمرانوں کی

رعایا کو تو سائے کے لئے چھپر نہیں ملتا
منقش پر اُدھر چھت بن رہی ہے فیل خانوں کی

اِدھر گھر میں کفن تک کے لئے پیسہ نہیں ملتا
اُدھر تحصیل جاری ہو رہی ہے موٹرانوں کی

انھیں کی ہم نوا ہے وہ جماعت بھی خدا رکھے
فلاحِ ملک و ملت رٹ ہے جن کے خوش بیانوں کی

ادھر رونا کہ آزوقہ ہمارا ہے زمینداری
ادھر شکوہ کہ حسرت اب بھی باقی ہے کسانوں کی

سہ پہلی کانگریسی وزارت نے اصلاح مزارعین کے لئے کئی قوانین مرتب کئے۔ سہیل نے اس موضوع پر ایک منظوم تقریر کی تھی جس کا کچھ حصہ یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

اِدھر فتویٰ کہ ناجائز محاصل کاشتکاری کے
اُدھر تحدیثِ شرعی کے لئے ضد نکتہ دانوں کی

زمین اللہ کی پیدا ہوئی جمہور کی خاطر
مگر دعویٰ کہ ملکیت یہ ہے خلد آشیانوں کی

چھپائے سے یہ دورنگی ادائیں چھپ نہیں سکتیں
دلوں کی آرزو کچھ ہے صدا کچھ خوش بیانوں کی

رہے انصاف پرور نیک دل اربابِ آراضی
انھیں حاجت نہیں کچھ اب بھی قانونی بہانوں کی

بلا سے کچھ کمی آجائے گی ان کے محاصل میں
مصیبت کچھ تو کم ہو جائے گی آشفتہ جانوں کی

زمیندار اپنے صوبے میں زراعت پیشہ ہیں لاکھوں
وہی ان کی بھی صورت ہے جو حالت ہے کسانوں کی

حمایت ان کی فرضِ اولیں خود کانگریس کا ہے
انھیں پروا نہیں ہے آپ جیسے مہربانوں کی

فریب آرائیوں کا داؤں ان پر چل نہیں سکتا
حقیقت ان کو سب معلوم ہے رنگیں ترانوں کی

بھلا اس شور اور ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
ہواؤں سے کہیں ہلتی ہیں بنیادیں چٹانوں کی

وہ راجاؤں کی دھمکی میں بھلا کب آنے والے ہیں
جنھیں مرعوب کر سکتی نہیں نوکیں سنانوں کی

نہیں اچھی یہ مشقِ خشت باری سخت جانوں پر
خبر لیجے کہ خیریت نہیں آئینہ خانوں کی

پیامِ انقلابِ نو زمانہ دینے والا ہے
بدل دے گی زمیں کا رنگ گردش آسمانوں کی

حصولِ حق کی خاطر لشکرِ جمہور اُٹھا ہے
جلو میں لے کے ہیبت ناکیاں آتش فشانوں کی

بھلا نواب و راجہ کیا مقابل اس کے آئیں گے
شہنشاہی مٹا کر رکھ دی جس نے قہرمانوں کی

قدم لے گی زراعت پروری خود سرنگوں ہو کر
صفیں آگے بڑھیں گی جب وطن کے نوجوانوں کی

لوری

کبھی تو رحم پر آمادہ بے رحم آسماں ہوگا کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہوگا
کبھی تو سر پہ ابرِ رحمتِ حق گل فشاں ہوگا
مسرت کا سماں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

کسی دن تو بھلا ہوگا غریبوں کی دعاؤں کا اثر خالی نہ جائے گا غم آلود التجاؤں کا
نتیجہ کچھ تو نکلے گا فقیرانہ دعاؤں کا
خدا گر مہرباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

خدا رکھے جواں ہوگا تو ایسا نوجواں ہوگا حسین و کارداں ہوگا دلیر و تیغ راں ہوگا
بہت شیریں زباں ہوگا بہت شیریں بیاں ہوگا
یہ محبوبِ جہاں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن اور قوم کی سو جان سے خدمت کریگا یہ خدا کی اور خدا کے حکم کی عزت کرے گا یہ
ہر اپنے اور پرائے سے صدا الفت کرے گا یہ
ہر اک پر مہرباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

مرا ننھا بہادر ایک دن ہتھیار اُٹھائے گا　　　سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہِ رزم جائے گا
وطن کے دشمنوں کے خون کی نہریں بہائے گا
اور آخر کامراں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کی جنگ آزادی میں جس نے سر کٹایا ہے　　　یہ اس شیدائے ملت باپ کا پُرجوش بیٹا ہے
ابھی سے عالم طفلی کا ہر انداز کہتا ہے
وطن کا پاسباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا　　　ہے رستہ دیکھتی کب سے فضائے کارزار اس کا
ہمیشہ حافظ و ناصر رہے پروردگار اس کا
بہادر پہلواں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن کے نام پر ایک روز یہ تلوار اُٹھائے گا　　　وطن کے دشمنوں کو کنجِ تربت میں سلائے گا
غرورِ خانداں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

سرِ میدان جس دم دشمن اس کو گھیرتے ہونگے　　　بجائے خوں رگوں میں اس کے شعلے تیرتے ہونگے
سب اس کے حملۂ شیرانہ سے منہ پھیرتے ہونگے
تہ و بالا جہاں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

احتشام حسین

نظامِ کہنہ

ہم نشیں کھٹکی تو ہو گی تجھکو بھی یہ ایک بات
اس شبِ تاریک کی آغوش میں ہے وہ جہاں
روپئے سے رات دن چلتا ہے جس کا کاروبار
دام لگتے ہیں زبانی جس جگہ اعمال کے
جس جگہ مفلس کھڑے ہیں کارواں در کارواں
جس جگہ انسانیت کا حال ہے زار و زبوں
جس جگہ قانون کے ڈر سے زباں ہلتی نہیں
جس جگہ بیکار امیروں کی چمکتی ہے جبیں
جس جگہ آگے نکلتا ہے دلیل گم رہی
فطرتِ انسان جس جا روشنی پاتی نہیں
نوجوانوں کو جہاں ملتی نہیں بڑھنے کی راہ
جس جگہ ہر لمحہ پابندی ہے اہلِ ہوش پر
ہے جہانگیری جہاں جمہوریت کے بھیس میں

کب سے گھیرے ہے نظامِ کہنہ کی تاریک رات
جس جگہ اڑتی ہیں عدل و حریت کی دھجیاں
سیم و زر سے جس جگہ ہوتے ہیں رشتے استوار
جس جگہ چلتے ہیں سکے تک ضعیف اقوال کے
حکمراں ہیں جس جگہ زردار کی عیاریاں
چوستا ہے جس جگہ انسان خود انساں کا خوں
جس جگہ بیمار مفلس کو دوا ملتی نہیں
جس جگہ محنت کا پھل مزدور کو ملتا نہیں
جس جگہ تاریخ دہراتی ہے افسانہ وہی
جس جگہ علم و ادب میں تازگی آتی نہیں
جس جگہ ترکِ مراسم کو سمجھتے ہیں گناہ
میت تہذیب ہے خود غرضیوں کے دوش پر
جنگ اپنے واسطے ہے دوسروں کے دیس میں

آ گیا وہ وقت خود ہو اپنی ہستی سے خجل
یہ نظامِ کہنہ بنیادیں ہیں جس کی مضمحل

اس کی بنیادوں پہ تیشہ مارنے کی دیر ہے
نوجواں تیار ہیں للکارنے کی دیر ہے

ملک پر غیروں کا ڈیرا ختم ہوتا ہی نہیں
کیا قیامت ہے اندھیرا ختم ہوتا ہی نہیں

طاقتِ پرواز ہے اور آشیاں پر قید ہے
حوصلے بیدار ہیں لیکن زباں پر قید ہے

وقت کی آواز ہے ہم کو ابھرنا چاہیئے
اس تضادِ زندگی کو ختم کرنا چاہیئے

جس نے روکا ہے ترقی سے یہی زنجیر ہے
اس نظامِ کہنہ کی تخریب بھی تعمیر ہے

آنند نرائن مُلّا

زمینِ وطن

زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

ازل میں جہاں سب سے پہلے حیات
لئے اپنی آغوش میں کائنات
جلاتی ہوئی شمعِ ذات و صفات
حجابِ عدم سے ہوئی جلوہ زن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں ابنِ آدم پلا گود یوں
جہاں نسلِ انساں چلی گھٹنیوں
جہاں چشمِ حیرت کے کیا اور کیوں
لبِ طفل تک آئے بن کر سخن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں بسترِ برف سے مستِ خواب
اُٹھا آنکھ ملتا ہوا آفتاب
لٹاتی ہوئی جلوۂ بے نقاب
جہاں آئی پہلی سنہری کرن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں خیر و شر میں ہوا امتیاز
بنی زیست مجموعۂ سوز و ساز
کھُلا رازِ ایماں سے ہستی کا راز
تراشے گئے ایزد و اہرمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں پہلے تخلیقِ انساں ہوئی
تری رحمت اس کی نگہباں ہوئی
خرد اس کی گہوارہ جنباں ہوئی
بشر نے تمدّن کے سیکھے چلن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

وہ انساں کا بڑھتا ہوا اعتقاد
بنے دیوتا آتش و آب و باد
پرستش پہ دارو مدارِ مراد
وہ ویدوں کے میٹھے سریلے بھجن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں اک کنول پر بہ صد دل بری
اُٹھی دودھ کے کنڈ سے لکشمی
قدم شِو کے شانوں پہ دھرتی ہوئی
اُتر آئی گنگا جہاں خندہ زن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

جہاں تیرے جلوے ہویدا ہوئے
جہاں اہلِ دل ان پہ شیدا ہوئے
جہاں گوتم اور کرشن پیدا ہوئے
جہاں سازِ فطرت ہوا نغمہ زن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

گئے چھوڑ کر اپنے نشاں
ہوئے باری باری جہاں کامراں
جہاں آکے اترا ہر اک کارواں
مغل، آریہ، ترک، تاتار، ہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

لئے غیر ملکوں نے تجھ سے سبق
تری داستاں کے اُڑائے ورق
ترے خوشہ چیں از شفق تا شفق
عرب، مصر، یونان، چین و ختن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

شبستانِ ایراں کا سامان و ساز
ترقیِ بازارِ وینس کا راز
وہ خود اہلِ روما کو تھا جن پہ ناز
ترے دستکار اور ترے اہلِ فن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

کہاں ہیں ترے سورما صف شکن؟
ترے اہلِ دانش ترے اہلِ فن؟
کہاں ہے ترا اقتدارِ کہن؟
ترے رام، لچھمن، بھرت، شترگھن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

کسے آئے گا آج اس کا یقیں
اشوک اور اکبر کی اے سرزمیں
ترے در پہ گھستی تھی دنیا جبیں
کبھی تو ہی تھی سجدہ گاہِ زمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشکِ خلدِ بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں
کہ جیسے سنواری گئی ہو دلہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

نہیں کوئی تیرے لئے پرخروش
تری راہ میں عازم و سخت کوش
نہ نادر کا جذبہ نہ غزنی کا جوش
نہ وہ بندۂ زر، نہ وہ بت شکن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

کوئی اب تری سمت آتا نہیں
نظر تیری جانب اُٹھاتا نہیں
تجھے اپنا کوئی بناتا نہیں
کہ جیسے کوئی لاش ہو بے کفن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

مٹا کر تری گرم بازاریاں
بنیں اہلِ یورپ کی زرداریاں
ترے خوں کی سینچی ہوئی کیاریاں
یہ مغرب کے سب لہلہاتے چمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

نہیں کون آلودۂ خون و خاک
ہوا ہو نہ جو اس فضا میں ہلاک
جسے کہہ سکیں ہم غلامی سے پاک
نہ سنگ ہمالہ نہ آبِ جمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

ترے دورِ ماضی کے آئینہ دار
تری شانِ اسلاف کی یادگار
کہیں کچھ کھنڈر ہیں کہیں کچھ مزار
نہ وہ اہلِ محفل نہ وہ انجمن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

یہ دہلی کے نقش و نگارِ خموش
یہ چتوڑ کی خاک لالہ فروش
یہ کیلاش کی چوٹیاں برف پوش
تجھے ڈھونڈتی ہیں عروجِ کہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

یہ معصوم بچے ترے شیر خوار
اُمیدیں لئے شوق سے ہم کنار
گلے ان کے ہوں اور غلامی کے ہار
اور آئے نہ تیری جبیں پر شکن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

یہ دوشیزگانِ وطن سبز نام
رہیں یوں کنیزیں جئیں یوں غلام
تری تیغِ غیرت نہ ہو بے نیام
ہوا ہے سفید آہ خونِ وطن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

تجھے صولتِ بابری کی قسم
تجھے عصمتِ پدمنی کی قسم
تجھے خاکِ پانی پتی کی قسم
پھر اک بار دکھلا جلالِ کہن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

بدلنے کو ہے موسمِ روزگار
ہواؤں میں ہے ایک کیفِ خمار
تری سمت پھر آرہی ہے بہار
لئے پھر گل و لالہ و نسترن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

پھر آنے کو ہیں سوئے گلشن اسیر
برسنے کو ہے پھر گھٹاؤں سے نیر
چٹانوں میں ہے مضطرب جوئے شیر
کہاں ہے کہاں تیشۂ کوہکن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

اُخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے
مساواتِ انساں کا پھر نام لے
روایاتِ ماضی سے پھر کام لے
وطن کو بنا درحقیقت وطن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!!

ساغر نظامی

ترانہ

اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

ذرّے ذرّے میں محفل سجا دیں گے ہم — تیرے دیوار و در جگمگا دیں گے ہم
تجھ کو ہستی کا گلشن بنا دیں گے ہم — آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دیں گے ہم
بن کے دشمن ترا جو اُٹھے گا یہاں
اس کو تحت الثریٰ میں گرا دیں گے ہم
اور تحت الثریٰ کو فنا کے سمندر میں ارتھی بنا کر بہا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن

سن لیں یہ انس و جان و زمین و زمن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

سونے والوں کو اک دن جگا دیں گے ہم — رسم و راہِ غلامی مٹا دیں گے ہم
بربریت کے ٹکڑے اڑا دیں گے ہم — آسمان و زمیں کو ہلا دیں گے ہم
کون کہتا ہے کمزور، بزدل ہے تو
ہر طرف خوں کے دریا بہا دیں گے ہم
جس طرف سے پکاریگی روحِ وطن، اس طرف ہی وفا کی صدا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن

سر سے باندھے ہوئے ہیں کفن ہی کفن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

تیری ہستی ہمالہ کی چوٹی بنی
ماہ و خورشید کی اس پہ بندی لگی
روشنی شرق سے غرب تک ہوگئی
سجدے میں جھک گئی عظمتِ زندگی

عظمتِ زندگی کی قسم ہے ہمیں
تیری عزت پہ سر تک کٹا دیں گے ہم
وقت آنے دے اے ماں! ترے نام پر اپنی ہستی و مستی مٹا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن

خون سے اپنے بھر دیں گے گنگ و جمن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

مست و خوشبو ہواؤں سے شیتل ہے تو
مادھری ہے منوہر ہے کومل ہے تو
پریم مندرا کی لبریز چھاگل ہے تو
سر پہ دنیا کے رحمت کا بادل ہے تو

آنکھ اٹھا کے جو دیکھا کسی نے تجھے
چھاؤنی اپنی لاشوں کی چھا دیں گے ہم
تیرے پاکیزہ پیکر کو روحوں کی باریک چادر کے نیچے چھپا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن

تجھ پہ قرباں زر و مال اور جان و تن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

تیری ندیاں رسیلی مدھر نغمہ خواں
تیرے پربت تری عظمتوں کے نشاں
تیرے جنگل بھی ہنستے ہوئے گلستاں
تیرے گلشن بھی رشکِ بہارِ جناں

تیری مٹی میں خوشبو کی فردوس ہے
تیرے ذرّوں کو سورج بنا دیں گے ہم
جو بھی پوچھے گا جنّت کا ہم سے پتہ راہِ کشمیر اس کو بتا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن

تو چمن در چمن ہے عدن در عدن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

گلشنِ عیش و آرام و راحت ہے تو — بے کسی میں کنارِ محبّت ہے تو
بے بسوں اور غلاموں کی دولت ہے تو — زندگی کے جہنّم میں جنّت ہے تو
سینچ کر خونِ دل سے تری کیاریاں
اور بھی تجھ کو جنّت بنا دیں گے ہم
ذرّے ذرّے میں تیری نئی آرزوؤں کے جاوید گلشن کھلا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن

ہم ترے پھول ہیں تو ہمارا چمن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تو — جس کے دانے میں بجلی وہ خرمن ہے تو
جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تو — جس سے جنّت ہے دنیا وہ گلشن ہے تو
دیویوں، دیوتاؤں کا مسکن ہے تو
تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دیں گے ہم
تیری پاکیزہ دھرتی کو امن و محبت کا آکاش متدر بنا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن
ہر ستارے سے پھوٹے گی تیری کرن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

یہ ستارے یہ نکھرا ہوا آسماں آسماں سے ہمالہ کی سرگوشیاں

یہ تری عظمتوں کا اٹل رازداں مستقل، معتبر، محتشم، جاوداں

اس کی چوٹی سے مظلوم دُنیا کو پھر

ہم پیامِ حیات و وفا دیں گے ہم

ہم محبت کا نغمہ سنا دیں گے ہم، ہم زمانے کو جینا سکھا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن

ہم بجھا دیں گے شمعِ نظامِ کہن

اے وطن اے وطن اے وطن

جانِ من جانِ من جانِ من

صُبحِ نَو

بزمِ تاریکِ وطن کو روشنی درکار ہے
شمع کے مانند جلنے کا زمانہ آگیا

موتیوں کی طرح عیشِ قعرِ دریا کب تلک
مضطرب موجوں میں پلنے کا زمانہ آگیا

راہِ آزادی میں کیا اندیشۂ سود و زیاں
ٹھوکریں کھا لو، سنبھلنے کا زمانہ آگیا

رَہرُوں نے ترک کر دی ہمرکابی موت کی
زندگی کے ساتھ چلنے کا زمانہ آگیا

کر رہا ہے وقت خود تکذیبِ اوہامِ کہن
ہر تصوّر کے بدلنے کا زمانہ آگیا

خلعتِ تہذیب ناقص ہو رہا ہے تار تار
اک نئے سانچے میں ڈھلنے کا زمانہ آگیا

ہو گیا ہے آگ تپ تپ کر غلاموں کا لہو
اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانہ آگیا

اہلِ زنداں کو مبارک ہو فروغِ صبحِ نو
قیدِ ذلت سے نکلنے کا زمانہ آگیا

آمین سلونوی

قوم سے خطاب

کیا ہوا اے قوم تجھ کو تیری ہمت کیا ہوئی　　تیری ہمت کیا ہوئی تیری شجاعت کیا ہوئی
تیری عزت کیا ہوئی وہ تیری رفعت کیا ہوئی　　تیری صنعت، تیری حرفت، تیری طاقت کیا ہوئی

سچ بتانا آج کیوں غمگین و افسردہ ہے تو
رُخ ہیں کملائے ہوئے سے اور پژمردہ ہے تو

بے حسی، افلاس اور بغض و عداوت تجھ میں ہے　　رنجشِ بیجا ہے، کینہ اور نفرت تجھ میں ہے
غیر سے ہے ربط اپنوں سے کدورت تجھ میں ہے　　کیا بتائیں تجھ کو جو لے بے مروت تجھ میں ہے

تیرے جو اعمال ہیں وہ ہیں ریا کے واسطے
با خدا تجھ میں نہیں کوئی خدا کے واسطے

مثل قاروں کے نہ شوقِ مال و دولت چاہیئے　　مثل شاہوں کے نہ فکرِ جاہ و حشمت چاہیئے
آسماں کی سی نہ تجھ کو حرصِ رفعت چاہیئے　　ہاں یہ سب بیکار ہیں تھوڑی سی ہمت چاہیئے

اپنی ملت، اپنا ملک، اپنا وطن آزاد کر
جس قدر بربادیاں ہیں اُٹھ اُنھیں برباد کر

روشن صدیقی

بیداریٔ مشرق

انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب
وقت آیا ہے کہ اُٹھے روئے گیتی سے نقاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

اے جمالِ شمعِ آزادی کے پروانو! اُٹھو
سو چکے اے قصرِ ملّت کے نگہبانو! اُٹھو
بادۂ بیداریٔ مشرق کے مستانو! اُٹھو
اب جگا بھی دو بہت کچھ سو چکا ہے آفتاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

نوجوانو! اب نشاطِ کُنجِ تنہائی کہاں؟
اے مُشجاعو! تم کہاں یہ عیش پیمائی کہاں؟
پھونک دو محفل کو وقتِ محفل آرائی کہاں؟
دور پھینکو ساغر و پیمانۂ و چنگ و رباب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

زندگی — تابندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندگی — پایندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندگی ہی زندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ

زندہ رہنا ہے تو آزادی سے کیسا اجتناب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

اب بھی آنکھوں میں تمہاری رنگِ غفلت دیدہ ہے!
خوابِ مستقبل کی ہر تعبیر ناپوشیدہ ہے!
انتظارِ صبح کیسا! صبح خود خوابیدہ ہے!

تم ہی خود بڑھ کر الٹ دو مہرِ زریں کا نقاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

برق ہو آنکھوں میں، دل میں آتشِ پروانہ ہو
ہوش بھی آئے تو لب پر نعرۂ مستانہ ہو
خامشی میں جرأتِ بیدار کا افسانہ ہو

زندگی کب تک اسیرِ اعتکاف و احتساب!
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

زیست کی قیمت ہی کیا ہے پیشِ مردانِ وفا
کوئی پوچھے کربلا سے — رازِ پیمانِ وفا
ہاں دکھادو اے شجاعو! جوشِ ارمانِ وفا

بے حدود و بے کنار و بے شمار و بے حساب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

دردِ ملت لے کے اے ملت کے غمخوارو چلو!
اے جوانو! اے دلیرو، اے رضاکارو، چلو!
منتظر ہے رحمتِ یزداں — وفادارو چلو!

یونہی کھل جاتے ہیں اکثر قصرِ آزادی کے باب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

سرخیٔ خونِ وفا سے زندگی گل ریز ہے
غیرتِ مزدور — برقِ خرمنِ پرویز ہے
جس کا تیشہ آج شعلہ بار و آتش خیز ہے

ہاں وہی ہے کامران و کامگار و کامیاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

شرم آئے اپنی ناکامی پہ استبداد کو!
اب نہ صیادی کی جرأت ہو کسی صیاد کو!
تیز کر دو شعلہ ہائے فطرتِ آزاد کو!
بجلیوں سے سیکھ لو رازِ سکون و اضطراب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

آسمانِ سرفروشی کے ستاروں کی قسم!
پاک بازوں کی قسم، شب زندہ داروں کی قسم!
تم کو ناموسِ وطن کے جاں نثاروں کی قسم!
جاگ اٹھو، دیکھو گے کب تک یونہی اُمیدوں کے خواب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

جاں نثارانِ وطن ہیں وارثِ دارالسلام
ہے بہت اونچا وطن پر مرنے والوں کا مقام
لیکن اس منزل میں اقدامِ تشدد ہے حرام
تیغِ اخلاص و صداقت ہی ہے تیغِ کامیاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

ہوشیار! اے غافلانِ حالِ بربادِ وطن!
ڈھونڈتی پھرتی ہے تم کو روحِ ناشادِ وطن!
گر ہوا اب بھی نہ تم کو پاسِ فریادِ وطن!
آہ کیا دو گے وطن کے ذرّے ذرّے کو جواب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

احسان دانش

مذہب اور سیاست

اللہ ان افراد سیاست سے بچائے
سمجھیں نہ منافع کو، نہ نقصان کو جانیں

اغراض پہ ہے خامہ و تقریر کی بنیاد
یہ وید کے قائل ہیں نہ قرآن کو مانیں

اس پینٹھ میں سوداگر مذہب بھی ہزاروں
کھولے ہوئے بیٹھے ہیں عقائد کی دکانیں

اندھیری رات کا مُسافر

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نورِ ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے، اہرمن محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

غم و حرماں کی یورش ہے مصائب کی گھٹائیں ہیں
جنوں کی فتنہ خیزی حُسن کی خونیں ادائیں ہیں
بڑی پُرزور آندھی ہے، بڑی کافر بلائیں ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہَوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

زمیں چیں بر جبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے، کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں، چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر زندگی کے لشکرِ ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

چراغِ دیر، فانوسِ حرم، قندیلِ رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نورِ عرفانی
نہ ناقوسِ برہمن ہے، نہ آہنگِ حدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

تلاطم خیز دریا، آگ کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں، بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں شعلہ افشاں دیو استبداد کا خنجر
سیاست کی سنانیں اہلِ زر کے خونچکاں تیور
فریبِ بے خودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

بدی پر بارشِ لطف و کرم، نیکی پہ تعزیریں
جوانی کے حسیں خوابوں کی ہیبت ناک تعبیریں
نکیلی تیز سنگینیں ہیں، خون آشام شمشیریں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظاہر جنگ کے پرہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ، بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فنا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ ہے
دھوئیں کی بدلیاں ہیں گو یونہی سنسناہٹ ہے
اجل کے قہقہے ہیں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ایک جلاوطن کی واپسی

پھر خبر گرم ہے وہ جانِ وطن آتا ہے
پھر وہ زندانیٔ زندانِ وطن آتا ہے
وہ خرابِ گل و ریحانِ وطن آتا ہے
مصر سے یوسفِ کنعانِ وطن آتا ہے

"کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے"

رندِ بےکیف کو تھی بادہ و ساغر کی تلاش
ناظرِ منظرِ فطرت کو تھی منظر کی تلاش
ایک بھونرے کو خزاں میں تھی گلِ تر کی تلاش
خود صنم خانۂ آذر کو تھی آذر کی تلاش

مژدہ اے دوست کہ وہ جانِ بہار آپہنچا
اپنے دامن میں لئے برق و شرار آپہنچا

اپنا پرچم کچھ اس انداز سے لہراتا ہے
رنگ اغیار کے چہروں سے اڑا جاتا ہے
کوئی شاداں، کوئی حیراں، کوئی شرماتا ہے
کون یہ ساحلِ مشرق پہ نظر آتا ہے

اپنے میخانے کا اک میکشِ بےحال ہے یہ
ہاں وہی مردِ جواں بخت و جواں سال ہے یہ

مردِ سرکش تجھے آدم کی کہانی کی قسم
روحِ انساں کے تقاضائے نہانی کی قسم
جذبۂ عشق کی ہر شورشِ فانی کی قسم
تجھ کو اپنی اُسی بدمست جوانی کی قسم

آکہ اک بار گلے سے تو لگالیں تجھ کو
اپنے آغوشِ محبت میں اُٹھالیں تجھ کو

نطق تو اب بھی ہے پر شعلہ فشاں ہے کہ نہیں
سوزِ پنہاں سے تری روح تپاں ہے کہ نہیں
تجھ پہ یہ بارِ غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں

اور اگر ہے تو پھر آ، تیرے پرستار ہیں ہم
جنسِ آزادئ انساں کے خریدار ہیں ہم

ساقی و رند ترے ہیں مئے گلفام تری
اُٹھ کہ آسودہ ہے پھر حسرت ناکام تری
برہمن تیرے ہیں کل ملتِ اسلام تری
صبحِ کاشی تری سنگم کی حسیں شام تری

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ لے جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں، وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائل جنگ نظر آتا ہے ہر مردِ جواں

سرفروشانِ بلاکش کا سہارا بن جا
اٹھ اور افلاکِ بغاوت کا ستارا بن جا

آل احمد سرور

ٹیپو کی آواز

گو رات کی جبیں سے سیاہی نہ دُھل سکی
لیکن مرا چراغ برابر جلا کیا
جس سے دلوں میں اب بھی حرارت کی ہے نمود
برسوں مری لحد سے وہ شعلہ اُٹھا کیا
پھیکا ہے جس کے سامنے عکسِ جمالِ یار
عزمِ جواں کو میں نے وہ غازہ عطا کیا
میرے لہو کی بوند میں رقصاں تھیں بجلیاں
خاکِ دکن کو میں نے شرر آشنا کیا
جس کو بھلا سکیں نہ کبھی شیخ و برہمن
ہندوستان کو وہ فسانہ عطا کیا

ساحل کی آنکھ میں نگر آئی نہ کچھ نمی
دریا میں لاکھ تلاطم ہوا کیا
خوابِ گراں سے غنچوں کی آنکھیں نہ کھل سکیں
اک شاخِ گل سے نغمہ برابر اُٹھا کیا
یہ بزم ایسی سوئی کہ جاگی نہ آج تک
فطرت کا کارواں ہے کہ آگے بڑھا کیا

مارا ہوا ہوں گو خلشِ انتظار کا   مشتاق آج بھی ہوں پیامِ بہار کا

اجتبیٰ رضوی

ٹیپو سلطان

نظر سے آج جو گذری ہیں چند تصویریں
وہ دل پہ نقش ہیں جیسے لہو کی تحریریں

بسی ہے جنگ سرنگاپٹام آنکھوں میں
کسی شہید پہ سایہ کیے ہیں شمشیریں

غلام قوم تجھے کچھ حیا بھی آتی ہے
ہیں تیرے چاند پہ خاک افگنی کی تدبیریں

ترا چراغ سرِ شام بجھ گیا لیکن
سحر کے بھیس میں پھیلیں گی اس کی تنویریں

مرے شہید ترے نام پاک سے قومیں
کریں گی آیۂ حبِ وطن کی تفسیریں

پیامِ سعی سرافرازیٔ وطن ہے تو
شہید و غازی و جرار و صف شکن ہے تو

سیاستِ وطنی کی فضا تھی زہر آلود
ہوائے غرب تھی ناسازگار و نامسعود

صباحِ دولتِ تیموریہ کی آئی تھی شام
پڑا تھا نیرِ اقبالِ ہند سربسجود

گلوں کو لوریاں دیتا تھا اعتبارِ بہار
چمن میں سبزۂ بیگانہ پا رہا تھا نمود

ہے تیرے بعد تری یاد افتخارِ وطن
ترا مزار ہے شمعِ سرِ مزارِ وطن

پکارتی ہیں سرنگاپٹم کی دیواریں
کہ ہم کو یاد ہیں وہ گولیوں کی بوچھاریں

دہن کشادہ ہیں چوٹوں کے گھاؤ کیا معلوم
یہ کب حمیتِ حبِ وطن کو للکاریں

شہید زندۂ جاوید ہیں وہی سادات
جو نام پاکِ وطن پر لڑیں مریں ماریں

اس ایک جانِ گرامی پہ لاکھ جاں صدقے
اس ایک موت پہ سو عمرِ جاوداں صدقے

آزادیٔ وطن

کہو ہندوستاں کی جے

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے

قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو دھو نہیں سکتی
وطن کی شمعِ آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی
وطن کے پاسباں وہ تیغ جوہردارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے

وہ شمع زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ براندام رہتی ہے
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

مشرق

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں
زندگانی، حوصلہ، عقل و فراست کا مسان

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

کٹ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
رک رہی ہے سانس سینے میں مریضِ دِق کو دیکھ

ایک ننگی لاش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

ایک قبرستان جس میں نوحہ خواں کوئی نہیں
اِک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اِک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

فیض احمد فیض

تسلّی

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں تڑپ لیں رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

معین احسن جذبی

اے کاش

شغل مے کرتا، پر اے کاش نہ ہوتا محسوس
تلخیٔ زہر بھی تلخیٔ مئے ناب میں ہے

چھیڑتا ساز پر آگاہ نہ ہوتا اے کاش
اک شرارہ سا بھی ہر جنبشِ مضراب میں ہے

کاش دریا کی خموشی سے نہ آتی آواز
اک تلاطم سا بھی ہر موج تہِ آب میں ہے

ابرِ نیساں کا برا ہو نہ بتاتا اے کاش
آبرو نام کی، ہر گوہرِ نایاب میں ہے

چاندنی راتوں میں یہ علم نہ ہوتا اے کاش
داغ دریوزہ گری سینۂ مہتاب میں ہے

محفلِ عیش میں اے کاش نہ ہوتا واقف
کس قدر رنگِ وفا فطرتِ احباب میں ہے

کاش کہتی نہ یہ مزدور کی گلرنگ نظر
حسرتِ خواب ابھی دیدۂ بیخواب میں ہے

کاش مفلس کے تبسم سے نہ چلتا یہ پتہ
کتنے فاقوں کی سکت غیرتِ بیتاب میں ہے

کاش توپوں کی گرج میں نہ سنائی دیتا
جذبۂ غیرتِ مظلوم ابھی خواب میں ہے

کاش امڈے ہوئے اشکوں سے نہ ہوتا ظاہر
اِک قیامت سی دلِ شاعرِ بیتاب میں ہے

علی سردار جعفری

اُٹھو

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو
اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
کسانو اُٹھو، کامگارو اٹھو
نئی زندگی کے شرارو اٹھو
اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے
اٹھو خاکِ بنگال و کشمیر سے
اٹھو وادی و دشت و کہسار سے
اٹھو سندھ و پنجاب و ملبار سے
اٹھو مالوے اور میوات سے
مہاراشٹر اور گجرات سے
اودھ کے چمن سے چہکتے اٹھو
گلوں کی طرح سے مہکتے اٹھو
اٹھو کھل گیا پرچمِ انقلاب
نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب
اٹھو جیسے دریا میں اُٹھتی ہے موج
اٹھو جیسے آندھی کی بڑھتی ہے فوج
اٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے
کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے

غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

علی سردار جعفری

آزادی

پوچھتا ہے تو کہ کب اور کس طرح آتی ہوں میں
گود میں ناکامیوں کے پرورش پاتی ہوں میں
صرف وہ مخصوص سینے ہیں مری آرام گاہ
آرزو کی طرح رہ جاتی ہے جن میں گھٹ کے آہ
اہلِ غم کے ساتھ ان کا درد و غم سہتی ہوں میں
کانپتے ہونٹوں پہ بن کر بددعا رہتی ہوں میں
رقص کرتی ہیں اشاروں پر مرے موت و حیات
دیکھتی رہتی ہوں میں ہر وقت نبضِ کائنات
خود فریبی بڑھ کے جب بنتی ہے احساس شعور
جب جواں ہوتا ہے اہلِ زر کے تیور میں غرور
مفلسی سے کرتے ہیں جب آدمیت کو جدا
جب لہو پیتے ہیں تہذیب و تمدن کے خدا
بھوت بن کر ناچتا ہے سر پہ جب قومی وقار
لے کے مذہب کی سپر آتا ہے جب سرمایہ دار
راستے جب بند ہوتے ہیں دعاؤں کے لئے
آدمی لڑتا ہے جب جھوٹے خداؤں کے لئے

زندگی انساں کی کر دیتا ہے جب انساں حرام
جب اسے قانونِ فطرت کا عطا ہوتا ہے نام
اہرمن پھرتا ہے جب اپنا دہن کھولے ہوئے
آسماں سے موت جب آتی ہے پَر تولے ہوئے
جب کسانوں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے ہراس
پھوٹنے لگتی ہے جب مزدور کے زخموں سے یاس
صبرِ ایوبی کا جب لبریز ہوتا ہے سبو
سوزِ غم سے کھولتا ہے جب غلاموں کا لہو
غاصبوں سے بڑھ کے جب کرتا ہے حق اپنا سوال
جب نظر آتا ہے مظلوموں کے چہروں پر جلال

تفرقہ پڑتا ہے جب دنیا میں نسل و رنگ کا
لے کے میں آتی ہوں پرچم انقلاب و جنگ کا

ہاں مگر جب ٹوٹ جاتی ہے حوادث کی کمند
جب کچل دیتا ہے ہر شے کو بغاوت کا سمند
جب نگل لیتا ہے طوفاں بڑھ کے کشتی نوح کی
گھٹ کے جب انسان میں رہ جاتی ہے عظمت روح کی
دور ہو جاتی ہے جب مزدوروں کے دل کی جلن
جب تبسم بن کے ہونٹوں پر سمٹتی ہے تھکن
جب ابھرتا ہے افق سے زندگی کا آفتاب
جب نکھرتا ہے لہو کی آگ میں تپ کر شباب
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
روند چکتی ہے جب ان سب کو جوانی کی امنگ

صبح کے زرّیں تبسم میں عیاں ہوتی ہوں میں
رفعتِ عرشِ بریں سے پرفشاں ہوتی ہوں میں

الطاف مشہدی

وطن آزاد کرنے کے لئے

ہند کا اجڑا چمن آباد کرنے کے لئے
درد کے مارے ہوؤں کو شاد کرنے کے لئے
اک نیا عہدِ جہاں آباد کرنے کے لئے
قصرِ استبداد کو برباد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

صفحۂ ہستی سے باطل کو مٹانے کے لئے
خرمنِ اعدا پہ اب بجلی گرانے کے لئے
اہلِ زر کی بےکسی پر مسکرانے کے لئے
یعنی ارواحِ سلف کو شاد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

پھر سے بھڑکاؤ دلوں میں غیرتوں کی آگ کو
رزم کی جانب بڑھاؤ جرأتوں کی باگ کو
پاؤں کے نیچے کچل دو سیم و زر کے ناگ کو
زندگانی کو سراپا شاد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

مستیٔ صہبائے آزادی سے لہراتے چلو
ابر کی صورت بلند و پست پر چھاتے چلو
قہقہوں سے لیلیٔ مغرب کو شرماتے چلو
پھر دیارِ ہند کو آباد کرنے کے لئے
جھوم کر اٹھو وطن آزاد کرنے کے لئے

سید مطلبی فرید آبادی

جد وجہد آزادی

پہلا دَور ۱۹۱۹ء ـ ۱۹۲۱ء

اک دو کیسے لاکھ ہزار کون کرے ان کا شمار
اُبل پڑے سگرے نر نار ایکا ہے ان کا ہتھیار
گھبرائی گوری سرکار بھارت جاگا، مچی پکار

○

ہندو مسلم اور عیسائی سب کہویں ہم بھائی بھائی
جو توڑے اپنی اکتائی اس کو سمجھو نپٹ قصائی
کہتا ہے اسے دو دُھتکار بھارت جاگا، مچی پکار

○

محمد علی کے نعرے ہیں گاندھی کے جیکارے ہیں
پریم کے اُبلے دھارے ہیں جھنجھلائے ہتیارے ہیں
لے کر جھپٹے چھری کٹار بھارت جاگا، مچی پکار

○

دیش لہو سے ہوتی ہولی شہر شہر میں چلتی گولی
بیتی لہو دھرتی ہے بولی بھارت ماں کی بھر دی جھولی
گاؤں بیچے نہ ہاٹ بزار بھارت جاگا، مچی پکار

پھر پہنائے جھاجھن کالے تھک پر دشمن ہتیارے
ٹوٹن لاگے بندھن سارے نئے چاند کے گردش پیارے
گونجن لاگے من کے تار بھارت جاگا، مچی پکار

○

گھبرائی گوری سرکار کہتا ہے اسے دو دُھتکار
لے کر جھپٹے چھری کٹار گاؤں بیچے نہ ہاٹ بزار
گونجن لاگے من کے تار بھارت جاگا، مچی پکار

بھارت جاگا، مچی پکار

دوسرا دَور ۱۹۳۰ء

ہزار اُلجھنیں سہی ہزار کاوشیں سہی
ہزار دشت خار دار فلک کی گردشیں سہی
ہے وقت کی یہی صدا اُٹھو، بڑھو، چلو، چلو

○

یہ باہمی عداوتیں نہیں نہیں رقابتیں
یہ کشمکش ہے زندگی نہ سمجھو ان کو آفتیں
کہو نہ کچھ بُرا بھلا اُٹھو، بڑھو، چلو، چلو

اُٹھا نہیں خمیر ابھی　　بنا نہیں ضمیر ابھی
رگوں کا خون سست سا　　تپا نہیں سریر ابھی
بڑھو تو طے ہو مرحلہ　　اُٹھو، بڑھو، چلو، چلو

نظر میں کل جہان ہے　　اور عزم نوجوان ہے
عجب ہے اپنی عاشقی　　کہ ہند اپنی جان ہے
عزیز ہیں عرب عجم　　اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

○

ہچر مچر ہے موت اب　　ٹھٹک ٹھٹک ہی موت اب
پلٹنا پیچھے دیکھنا　　ہر اک اٹک ہی موت اب
کٹھن ہو لاکھ راستہ　　اُٹھو، بڑھو، چلو، چلو

صحیح اگر شعور ہو　　تو غیب بھی حضور ہو
یہ وقت کی پکار ہے　　ہر اختلاف دور ہو
یہ ہند پھر سے لے جنم　　اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

○

قدم کو ہے قرار، موت　　وفا سے ہے فرار، موت
سکون اب فریب ہے　　ہے اس کا لالہ زار موت
نہ دیکھو اپنے نقش پا　　اُٹھو، بڑھو، چلو، چلو

تمام جال توڑ کر　　حماقتوں کو چھوڑ کر
حریفِ نابکار کی　　کلائیاں مروڑ کر
بلند اپنے ہوں عَلم　　اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

تیسرا دور

ہزار لاکھ ہوں ستم　　جھکیں گے کس طرح سے ہم
وہاں سے یاں تک آ گئے　　سفر ہو لاکھ بیش و کم
رکیں گے کس طرح سے ہم　　اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

ہزار لاکھ ہوں ستم　　رکیں گے کس طرح سے ہم
عزیز ہیں عرب عجم　　یہ ہند پھر سے لے جنم
بلند اپنے ہوں عَلم　　اُٹھے قدم، بڑھے قدم
اُٹھے قدم، بڑھے قدم

علی جواد زیدی

سیاسی[1] قیدی کی رہائی

مبارکباد تم کو آج میں کیا دوں رہائی پر
"رہائی" لفظ بے معنی ہے دنیائے غلامی میں
ہر اک گوشے پہ قید و بند کے قانون حادی ہیں
گر آوازیں اُٹھائیں بھی کبھی سرکش جوانوں نے
کوئی بھی اِن کے چنگل سے نکل کر جا نہیں سکتا
پنپنے ہی نہیں دیتے یہاں نخلِ جوانی کو
تمناؤں پہ سنگینوں کی خونخواری کے پہرے ہیں
دبی ہے ظلم کے پہیے کے نیچے روحِ آزادی
رُکا ہے سارا ہندستاں مگر قانون[2] جاری ہے
رہا ہو کر اسی قانون کی گودی میں جانا ہے
دلِ صیاد کو ہر دم خیالِ صید رہتا ہے

نکل پڑتے ہیں آنسو ملک کی بے دست و پائی پر
بسر ہوتی ہے ساری زندگی قیدِ دوامی میں
یہاں نوعیتیں آزاد و قیدی کی مساوی ہیں
سزائے قید دی امن داماں کے پاسبانوں نے
کہیں بھی ہو اماں اِن رہزنوں سے پا نہیں سکتا
جکڑ رکھا ہے زنجیروں میں ساری زندگانی کو
وفورِ شوق کے دل پر ستم کے زخم گہرے ہیں
بھنور میں پھنس گئی ہے سارے ہندستاں کی آبادی
اسی کا دور دورہ ہے، اسی کی روبکاری ہے
تمہیں پھر گھوم پھر کر محفلِ زنداں میں آنا ہے
رہائی میں بھی صد پیغامِ بند و قید رہتا ہے

ہمارا ملک اک زندانِ بے دیوار ہے ہمدم!
یہاں ہر اک قدم پر امتحانِ دار ہے ہمدم!

---

[1] قاضی جلیل عباسی جو زیدی ہی کے ساتھ قید تھے مگر اُن سے کچھ دنوں پہلے رہا ہوئے۔
[2] ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ۔

ساقی

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج مے خانہ کا دروازہ
ہر اک مے کش یکایک بے پیئے برہم اُٹھا ساقی
یہ کیسا مے کے بدلے خون جھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز سے اک نالۂ ماتم اُٹھا ساقی

ہوائے زہر آگیں چل اُٹھی شاید گلستاں میں
یہ پیمانے اُلٹ ساقی، یہ جامِ جم اُٹھا ساقی
اگر ممکن ہو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اُٹھا ساقی

مسعود اختر جمال

نئی دنیا

جذبات نے کروٹ بدلی ہے، احساس نے انگڑائی لی ہے
آزاد روی سے انساں نے تعمیر نئی دنیا کی ہے
فطرت کے حسیں میخانے سے، بیداری کی صہبا پی ہے

اُس دنیا کے انسانوں کی، ہر بات پیامِ دل ہوگی
ہر سانس میں اک نغمہ ہوگا، ہر گام پہ اک منزل ہوگی
ساحل کیسا، طوفاں کیسا، ہر موج وہاں ساحل ہوگی

مغموم کسانوں کے چہرے، شاداب وہاں ہوجائیں گے
راحت کی فضا میں، غربت کے طوفان وہاں ہوجائیں گے
شورش بھی وہاں مٹ جائے گی، فتنے بھی وہاں سوجائیں گے

اب شیخ و برہمن میں کوئی، تفریق نہ ہونے پائے گی
اب حور و پری کے قصوں کی تصدیق نہ ہونے پائے گی
اوہام پرستی کی دنیا، تخلیق نہ ہونے پائے گی

قسمت کی حدیں مٹ جائیں گی، بے آب ستارے ٹوٹیں گے
اب علم و یقیں کے سرچشمے، آغوشِ زمیں سے پھوٹیں گے
پابندِ سلاسل انساں اب، زندانِ بلا سے چھوٹیں گے

اب تک تو جہالت میں اپنی، دکھ درد بہت جھیلے ہم نے
مذہب کی تماشا گاہوں میں، دیکھے ہیں بہت میلے ہم نے
عقبیٰ کی ہوس میں خونریزی کے کھیل بہت کھیلے ہم نے

دیکھی ہیں بہت دن تک ہم نے پیرانِ کلیسا کی گھاتیں
حیوان صفت، سُن سُن کے ہوئے، ہم شیخ و برہمن کی باتیں
گزری ہیں انھیں کے جھگڑوں میں، بے کیف جوانی کی راتیں

لیکن وہ زمانہ ختم ہوا، اب اور زمانہ ہے ساقی
مفلس کی نگاہوں میں پنہاں، اب کیفِ شبانہ ہے ساقی
مزدور کے ہونٹوں پر رقصاں، عشرت کا فسانہ ہے ساقی

دشمن کی ہراساں فوجوں میں، تنظیم نہیں ہو سکتی اب
یہ دنیا حرص کے بندوں میں، تقسیم نہیں ہو سکتی اب
انسانوں میں خونریزی کی، تعلیم نہیں ہو سکتی اب

وہ عہدِ کہن اب ختم ہوا، وہ بات گئی وہ دَور گیا
اسرارِ مذاہب فاش ہوئے، آزار دہی کا طور گیا
وہ اہلِ تصوّف اب نہ رہے، وہ فکر گئی وہ غور گیا

شمشیرِ حکومت کند ہوئی، دامانِ توہم چھوٹ گیا
مشرق کا طلسمی رنگ اُڑا، مغرب کا فسوں بھی ٹوٹ گیا
تہذیب ہوس کے نشتر سے ناسورِ تمدّن پھوٹ گیا

رفتارِ زمانہ تیز ہوئی، اب رنگ بدلنے والا ہے
خود ظلم اب اپنے پنجے میں، ظالم کو مسلنے والا ہے
اک مار سیہ، "فرعون ادا شاہیں" کو نگلنے والا ہے

انگشت بدنداں ہے دنیا، مٹتی ہی نہیں ہے حیرانی
اس قوم کو شاید راس آئی، انساں کے لہو کی ارزانی
تدبیر ہے جس کی شیطانی، جذبات ہیں جس کے حیوانی

غرقاب زرہ میں یورپ ہے، اربابِ خرد کی سازش سے
تاریک فضائے عالم ہے، اصحابِ دوَل کی کاوش سے
شمشیرِ ہوس میں تیزی ہے، تسخیرِ جہاں کی خواہش سے

لیکن یہ دگرگوں حالت بھی، ہے رازِ نہاں مستقبل کا
پردے میں انھیں طوفاں کے، جلوہ ہے عیاں مستقبل کا
روشن ہے اسی تاریکی میں، خورشید رواں مستقبل کا

یہ موج حوادث کے ریلے، یہ بحرِ سیاست کے نشتر
ڈوبے ہیں نوائے طوفاں میں بکھرے ہیں فرازِ ساحل پر
غرقاب جو موجیں ہیں تہ میں، دیتے ہیں انھیں پیغامِ سفر

جاگو کہ نسیم عطر فشاں، لائی ہے نویدِ صبحِ طرب
اُٹھو کہ شفق کی رعنائی، دیتی ہے پیامِ حُسنِ طلب
دیکھو کہ فضائے امن واماں ہے رقص بجاں آہنگ بہ لب

منزل وہ قریب آ پہونچی ہے، بڑھتے ہی رہو، بڑھتے ہی رہو
ہر کوہ ودمن کے سینے پر، دریا کی طرح چڑھتے ہی رہو
موجوں سے لڑو، طوفاں سے، آئینِ عمل پڑھتے ہی رہو

مدت سے جو سوچا کرتے تھے، اب وہ بھی زمانہ آئے گا
ہر مشکل اب آساں ہو گی، ہر نقش کہن مٹ جائے گا
اب کوئی نیا فتنہ ہرگز، تصنیف نہ ہونے پائے گا

قطروں میں رواں ہیں جو لہریں اب ان کی تڑپ دریا ہو گی
ذرّوں میں فضا جو پنہاں ہے، وسعت میں وہی صحرا ہو گی
افلاس زدہ مزدوروں کی، آباد نئی دنیا ہو گی

آپس میں یہ خوں آشامی کیا، یہ وقت نہیں جلاّدی کا
تخریب نما مذہب کیسا، لمحہ یہ نہیں بربادی کا
توڑو بھی قفس کی زنجیریں، موقع ہے یہی آزادی کا

شمیم کرھانی

جگاوا

جاگ مرے نو عمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال

جشن بپا ہے موت کے بن میں
حشر عیاں ہے صحنِ چمن میں
آگ لگی ہے باغِ وطن میں

امن کی راہ نکال
جاگ مرے نو عمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال

ٹوٹ پڑا ہے ظلم کا لشکر
گرم ہے قتل و غارت گھر گھر
کیسے بچے گی عصمتِ مادر

کھلتے ہیں سر کے بال
جاگ مرے نو عمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال

ظلم کی آندھی ، غم کا اندھیرا
بحر پہ ہے طوفان کا ڈیرا
موت کا منہ ہر موج کا گھیرا

قوم کی ناؤ سنبھال
جاگ مرے نو عمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال

دھوپ میں مزدوروں کے دَل ہیں
چین میں کیسے اہلِ دول ہیں
عرش سے اونچے شیش محل ہیں
ہاتھ میں تول کدال
جاگ مرے نوعمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال

لڑکے مَرے ہیں ایسے بھی گلرو
موجِ ہوا میں جن کی ہے خوشبو
سونگھ رہی ہوں نکہتِ گیسو
عطر میں آب کو ڈھال
جاگ مرے نوعمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال

قوم کا دم بھرنا ہی دوا ہے
فرض ادا کرنا ہی وفا ہے
دیس جئے مرنا ہی بقا ہے
میان سے تیغ نکال
جاگ مرے نوعمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال

ہاں تو نہیں اس جنگ کی حامی
قتل ہوں جس میں ہند کے نامی
پر نہیں اٹھتا بارِ غلامی
گرتی ہوں اُٹھ کے سنبھال
جاگ مرے نوعمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال

شمیم کرہانی

قومی گیت

ہم کام کے نغمے گاتے ہیں، بیکار ترانہ کیا جانیں
جو صرف عمل کے بندے ہیں، وہ بات بنانا کیا جانیں

رگ رگ میں لہو کو گرماتے، جاتے ہیں "وطن کی جے" گاتے
ہم عہد جوانی کے ماتے، بوڑھوں کا زمانہ کیا جانیں

طوفان میں کشتی کھیتے ہیں، کہسار سے ٹکر لیتے ہیں
ہم جنگ میں سر دیدیتے ہیں، ہم پاؤں ہٹانا کیا جانیں

بگڑوں کو بنانے آئے ہیں، غربت کو مٹانے آئے ہیں
ہم آگ بجھانے آئے ہیں، ہم آگ لگانا کیا جانیں

دیوار وہ کالے زنداں کی، تصویر وہ ظلم انساں کی
شاہد ہے ہمارے ارماں کی، ہم جان چرانا کیا جانیں

وہ حُسن و جوانی کی راتیں، وہ کیف و ترنم کی باتیں
وہ لعل و گُہر کی برساتیں، ہم لوگ منانا کیا جانیں

افلاس کے مارے بندوں کے، کس طرح بلکتے ہیں بچے
جو دیکھ رہے ہیں آنکھوں سے، وہ جشن منانا کیا جانیں

وہ اور ہیں جو کرتے ہیں ستم، خود شاد ہیں دُنیا محوِ الم
ہم زخم پہ رکھتے ہیں مرہم، ہم زخم لگانا کیا جانیں

بے خوف چلے سنگینوں پر، اور روک لی گولی سینوں پر
لکھا ہے ہماری جبینوں پر، ہم سر کا جھکانا کیا جانیں

یحییٰ اعظمی

وطن کے نوجوانوں سے خطاب

جوانو! از سرِ نو برسرِ پیکار ہو جاؤ
جہادِ سرفروشی کے لئے تیار ہو جاؤ

اگر ہے زندگی کی آرزو اس دارِ فانی میں
تو سب سے پہلے مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ

تمہاری کوششیں دیکھو تو کیا کیا رنگ لاتی ہیں
ذرا ہمت سے سرگرمِ عمل اک بار ہو جاؤ

غلام آباد میں اس طرح کے جینے سے کیا حاصل
جو غیرت ہو تو اس جینے سے اب بیزار ہو جاؤ

چلیں گر گولیاں بھی عرصۂ پیکار میں تم پر
تو سینہ تان کر اک آہنی دیوار ہو جاؤ

بڑھو ہاتھوں میں لے کر جنگِ آزادی کے پرچم کو
جوانانِ وطن کے قافلہ سالار ہو جاؤ

سات رنگ

تصویر وہ بناؤں کہ مسحور ہو سکوں
ایسے خطوط کھینچوں کہ مغرور ہو سکوں

○

اک نوجواں کو شہر میں تشویشِ روزگار
اور دور — ایک گاؤں میں برسات کی بہار
ہاتھوں میں اک حسینہ کے ٹوٹا ہوا ستار

○

دریا سے ہٹ کے، سامنے چھوٹا سا ایک گاؤں
پگڈنڈیوں سے دور — وہاں پیپلوں کی چھاؤں
وہ دھندلی دھندلی صورتیں، وہ میلے میلے پاؤں

○

موجوں کے رخ پہ چھوٹی سی کشتی رواں دواں
دریا کے اس بہاؤ سے ملاح بدگماں
ساحل کے ایک جھونپڑے میں موت کا سماں

○

کچھ لوگ محوِ سیرِ چمن رازِ شالی مار
ہنستا ہے سامراج پہ الفت کا شاہکار
پھاٹک سے پہ ہٹ کے، میلے فقیروں کی اک قطار

○

سونے کا ماہتاب مناروں کے درمیاں
چاندی کا آفتاب چناروں کے درمیاں
اور اک "خدا" فضائی نظاروں کے درمیاں

○

زنداں کی ایک شمع پہ پروانے مضطرب
اور اپنی اپنی فکر میں دیوانے مضطرب
باہر حیاتِ تازہ کے افسانے مضطرب

○

سڑکوں پہ انقلاب کی گونجی ہوئی صدا
کالج کے ایک "ہال" میں دنیا پہ تبصرہ
اِک نوجواں کے ہاتھ میں اخبار آج کا

○

موضوع اتنے جیسے کہ گھبرا رہا ہوں میں
شاید کہ اپنے فکر پہ خود چھا رہا ہوں میں

یشیشور پرشاد منوّر لکھنوی –

وطن پرستی

یہی سرمایہ اپنا ہے یہی ہے کائنات اپنی
اسی پر منحصر دنیا میں ہے ہر ایک بات اپنی
یہ آئینہ دکھاتا ہے ہمیں امید کا جلوہ
وطن کی فارغ البالی میں پنہاں ہے نجات اپنی
اسی کے نذر ہے ایک ایک لمحہ زندگانی کا
نہ کوئی دن ہے دن اپنا نہ کوئی رات رات اپنی
پسند آئے نہ کیوں ہم کو پرستارِ وطن ہونا
اسی کے دم سے وابستہ ہے موت اپنی حیات اپنی

- غلام احمد فرقت

نعرۂ آزادی

انقلاب انگیز نغموں کے ترنم کی قسم
آسمانِ حرّیت کے ماہ و انجم کی قسم
دار پر اشفاق[1] کے رنگیں تبسّم کی قسم
اور عدالت میں بھگت سنگھ[2] کے تکلّم کی قسم

میرے ہندستاں! یہ زنجیرِ غلامی توڑ دے

اُس مجاہد کی قسم جو پھول سمجھے خار کو
اپنے دل کا درد جانے قوم کے آزار کو!
ارتقا کا زینۂ اوّل جو سمجھے دار کو
بڑھ کے میدانِ عمل میں چوم لے تلوار کو!

میرے ہندستاں! یہ زنجیرِ غلامی توڑ دے

---

[1] اشفاق اللہ مشہور انقلابی جنھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔
[2] ہندوستانی انقلابیوں کے روحِ رواں جنھیں جرم وطن پروری میں تختۂ دار پر لٹکایا گیا۔

پھونک دیں جو قصر و ایواں اُن شراروں کی قسم
جو دیے دل میں جلا دیں اُن اشاروں کی قسم
حُرّیت کے باغ کی تازہ بہاروں کی قسم
خون سے دشمن کے رنگیں لالہ زاروں کی قسم

میرے ہندستاں! یہ زنجیر غلامی توڑ دے

عہد ماضی کی مبارک داستانوں کی قسم
بسملؔ و آزادؔ کے زندہ فسانوں کی قسم
دیس پر مر مٹنے والے نوجوانوں کی قسم
تجھ کو اپنے شاعروں، شیوا بیانوں کی قسم

میرے ہندستاں! یہ زنجیر غلامی توڑ دے

اردو میں

قومی شاعری

کے

سَو سال

سنہ ۱۹۴۲ء سے سنہ ۱۹۴۶ء تک

جوش ملیح آبادی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟ — "دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو"

"جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا — بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا"

"باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں — آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں"

"ہات ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر — تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر"

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر — نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے — نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟

ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی — سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے — کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے

لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں — سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں

دستکاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم — سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی — موت بھی کیسی تمہارے ہات کی لائی ہوئی

اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج — میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟ — یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟ — شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے — کس کے تم لائے تھے سر شاہِ ظفر کے سامنے

یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں — اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؛
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلم بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمھیں جلیانوالا باغ بھی

پوچھ لو اس سے تمھارا نام کیوں تابندہ ہے
"ڈائرِ گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے

وہ بھگت سنگھ اب بھی جسکے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے

اہل آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے

اب بھی ہے محفوظ جس پر طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جن میں کوڑوں کی صدا

آج کشتی امن کے امواج پر کھیتے ہو کیوں
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟

اہل قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
"بینگی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم

اہلِ حق روشن نظر ہیں اہل باطن کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال اُن قوموں کے جو کمزور ہیں

آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جسکی لاٹھی اُسکی بھینس اب کس لیئے کہتے نہیں

کیا کہا "انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں"
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں

گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپ تازی کیا شفاخانے میں ہے؟

آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟

سانس کیا اُکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے

ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسینؓ

خیر اے سوداگر اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

سکندر علی وجد

بشارت

چہرے پہ بکھر جائیں گے انوارِ تبسّم / پیشانیٔ گیتی کی شکن کل نہ رہے گی
اُٹھتی ہے نقابِ رُخِ لیلائے حقیقت / تاریکیٔ اوہامِ کہن کل نہ رہے گی
پائے گی دل آویزیٔ ملبوسِ عروسی / بے نورِ سحر مثلِ کفن کل نہ رہے گی
کھل جائے گا سب پر درِ میخانۂ عشرت / افراطِ غم و رنج و محن کل نہ رہے گی
ہو جائے گی انسان کی فطرت متوازن / بیگانگیٔ روح و بدن کل نہ رہے گی
آزادیٔ افکار کے گُل دل میں کھلیں گے / یہ خارِ غلامی کی چُبھن کل نہ رہے گی
گانے کے لئے قمری و بلبل کو چمن میں / منت کشیٔ زاغ و زغن کل نہ رہے گی
شمشاد صفت بستۂ آئینِ گلستاں / بوئے گُل و نسرین و سمن کل نہ رہے گی
افسردہ شگوفوں کے جنازوں میں پریشاں / مانندِ صبا روحِ چمن کل نہ رہے گی
یہ دشمنِ انصاف و کرم ظلم کی دیوی / بیکس کا لہو پی کے مگن کل نہ رہے گی
اربابِ ہمم شاد و سرافراز رہیں گے / یہ سرکشیٔ دار و رسن کل نہ رہے گی
فریاد کناں سینۂ خاور میں مقید / آزادیٔ مشرق کی کرن کل نہ رہے گی

پرہول فضا حسرتِ صد شامِ غریباں
یہ کیفیتِ صبحِ وطن کل نہ رہے گی

منزلیں

ہزاروں منزلیں ایسی ملیں گی
جہاں ہر گام پر کلیاں کھلیں گی
جہاں ہوں گی محبت کی بہاریں
جہاں ہوں گی مسرت کی پھواریں
جہاں دل لوٹنے والی ادائیں
دکھائیں گی، سکھائیں گی، وفائیں
جہاں بل کھانے والی چال ہوگی
نظر موجوں کا رنگیں جال ہوگی
جہاں دکھلا کے دل آویز راہیں
تجھے بہکائیں گی تیری نگاہیں
جہاں ناچیں گے جلوے ہر نظر میں
جہاں اٹھیں گی لہریں ہر جگر میں
جہاں اُلفت کے کچھ رنگیں نظارے
کریں گے تجھ کو پردوں سے اشارے

مگر تو اِن کے دھوکے میں نہ آنا
مسافر راستے میں رُک نہ جانا

ملیں گے تجھ کو کچھ ایسے محل بھی
جہاں جلتے ہیں عشرت کے کنول بھی
جہاں ہر شاخ اک محراب سی ہے
جہاں ٹھنڈی ہوا پُر خواب سی ہے
جہاں شیشوں میں بہتی آگ بھی ہے
جہاں للچانے والا راگ بھی ہے
جہاں آرام کا سایہ ملے گا
جہاں راحت کا سرمایہ ملے گا
جہاں منہ مانگی دولت بھی ملے گی
جہاں شاید حکومت بھی ملے گی
ترے سر پر خدائی ہاتھ ہوگا
ہر اک قانون تیرے ساتھ ہوگا
قدم چومے گی تیرا دھن کی دیوی
ہنسے کھیلے گی تیرے من کی دیوی

نہ بن جانا کہیں اِن کا نشانا
مسافر راستے میں رُک نہ جانا

کچھ ایسی وادیاں تجھ کو ملیں گی — جہاں بربادیاں تجھ کو ملیں گی
جہاں اُجڑے ہوئے گھر روتے ہونگے — جہاں ٹوٹے ہوئے در سوتے ہونگے
جہاں بے چین ہوگی نوجوانی — جہاں پُر درد ہوگی ہر کہانی
دھواں اُٹھے گا رنگیں مسکنوں سے — لپٹ جائیں گے شعلے دامنوں سے
جہاں چھوڑیں گے تجھ کو ساتھ والے — جہاں ٹوٹیں گے تیرے دل کے چھالے
جہاں آفت تعاقب میں رہے گی — مصیبت آگ بن بن کر رہے گی
جہاں دار و رسن کے جال ہونگے — جہاں دل قید میں پامال ہونگے

کہیں گھبرا کے یاں ٹھوکر نہ کھانا
مسافر! راستے میں رُک نہ جانا

تری منزل ہے آزادی کی منزل — تمنّاؤں کی آبادی کی منزل
تجھے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنا ہیں — غلامی کی سلاخیں توڑنا ہیں
لگے بڑھنے وہ تاریکی کے سائے — بڑھے جانا قدم رُکنے نہ پائے
فضا تاریک ہے مشعل جلا دے — اندھیرے راستوں کو جگمگا دے
وطن تیرا مصیبت میں ہے ہمدم! — نجات اب تیری ہمت میں ہے ہمدم
وطن ہی کیا زمانہ ہے اندھیرا — مگر ہونے ہی والا ہے سویرا
نئی تعمیر تیرے ہاتھ میں ہے — تری تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے

بڑھے جانا نہ ہرگز ہچکچانا
مسافر! راستے میں رُک نہ جانا

شمیم کرہانی

کچھ دیر ذرا سو لینے دو٭

کچھ دیر ذرا سو لینے دو
تم جیل جسے لے جاتے ہو وہ درد کا مارا ہے دیکھو
مظلوم، اہنسا کا حامی، بے بس دُکھیارا ہے دیکھو
بے چین سا اُس کی آنکھوں میں پچھلے کا ستارا ہے دیکھو
کچھ دیر ذرا سو لینے دو

آیا ہے عمل کی وادی سے دن بھر کا تھکا ماندا ہارا
افکار کے کانٹوں کا چھیڑا، آلام کی آندھی کا مارا
وہ جلتی ریگ بنی صحرا کی، لیٹا ہے ابھی دُکھیارا
کچھ دیر ذرا سو لینے دو

کچھ خاک پڑی ہے ماتھے پر، کچھ گرد جمی ہے بالوں میں
تشویش کی نیلی شکنیں ہیں، سنولائے ہوئے سے گالوں میں
ٹھنڈک بھی نہیں آنے پائی، تلوؤں کے تپکتے چھالوں میں
کچھ دیر ذرا سو لینے دو

افلاس کے رُخ پر آب کہاں، غربت کی نظر میں تاب کہاں
پلکوں میں جو بھر دے مست کرن آکاش پہ وہ مہتاب کہاں
مانا کہ غلام آنکھوں کے لئے، آزاد خوشی کا خواب کہاں
کچھ دیر ذرا سو لینے دو

٭ ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری سوتی رات کو عمل میں آئی تھی۔

زنداں کی بھیانک راتوں میں، جو ظلم پڑے سہنا ہوگا
طوفان ستم میں، ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح بہنا ہوگا
آزاد گھڑی کی حسرت میں، بے خواب سدا رہنا ہوگا

کچھ دیر ذرا سو لینے دو

ہم اُس کے عزیز سپاہی وہ سردار ہمارا ہے سُن لو
کُل ہند فدا ہے اُس پر وہ کُل ہند کا پیارا ہے سُن لو
جس موج کو چھیڑ رہے ہو تم وہ آگ کا دھارا ہے سُن لو

کچھ دیر ذرا سو لینے دو

ہم تم کو بتائے دیتے ہیں ایک روز بہت پچھتاؤ گے
مظلوم کے ہونٹوں پر جس دم بندش کی مُہر لگاؤ گے
وہ شور اُٹھے گا ہر دل سے اُس شور میں گم ہو جاؤ گے

کچھ دیر ذرا سو لینے دو

علی جواد زیدی

قیدی کی لاش

(مہادیو دسائی کی موت سے متاثر ہوکر)

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

ابھی نمودِ زندگی بسی نہ تھی نگاہ میں
ابھی دریچۂ سحر کھلا نہ تھا
ابھی فسونِ تیرگی مٹا نہ تھا
سکوت میں زمانہ تھا
ابھی گزر رہے تھے ہم جوارِ رزمگاہ میں

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

یہ خوفِ اشک و آہ تھا
یہ شامِ غم کا عکس تھا، یہ ایک انتباہ تھا
ستم گروں کے ترکشوں کا تیر تھا
مگر براہِ مصلحت

ابھی یہ سخت چنگیوں کے بیچ میں اسیر تھا
کہ اب گذر رہے تھے ہم نمائشِ سپاہ میں
ہجومِ اشک و آہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
ہمیں اِسے کچل نہ دیں ابھی یہیں
یہ روندنے کی چیز کیوں بنے امانتِ زمیں
نہیں! نہیں!
بڑھے چلو، بڑھے چلو، کچل بھی دو
خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش، ہاں اِسے مسل بھی دو
مگر یہ کس کی لاش تھی کہ بیڑیاں
پڑی ہیں اب بھی پاؤں میں
یہ کس نے لاش پھینک دی ہے اجنبی سے گاؤں میں
ستم کی دھوپ چھاؤں میں
بڑھے چلو، بڑھے چلو، کچل بھی دو
خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش، ہاں اِسے مَسل بھی دو
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
یہ موت کا مجسمہ ڈرا رہا ہے دیر سے
لہو میں تر بتر ہے سر سے پاؤں تک
جمے ہوئے لہو میں ہے مرے ہی خون کی مہک
کوئی عزیز تو نہیں
مگر کٹے ہوئے سروں میں کچھ کمی تو نہیں
کوئی بھی ہو عزیز ہے
کہ اس جری نے جان دی ہے جشنِ رزم گاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

یہ ڈورا اپنے آشرم کو چھوڑ کر
یہ اپنے ٹوٹے جھونپڑے سے اپنے منھ کو موڑ کر
یہ ظلم و جور کی بھری کلائیاں مروڑ کر
نکل پڑا۔
اندھیری رات تھی مگر یہ چل پڑا۔
کوئی بھی ہو عزیز ہے۔
کہ اس جری نے جان دی ہے جشن رزم گاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں۔

علی جواد زیدی

ہولی

پہلے زمانہ اور تھا، مے اور تھی، دَور اور تھا
وہ بولیاں ہی اور تھیں
وہ ٹھولیاں ہی اور تھیں
وہ ہولیاں ہی اور تھیں
لیکن، مرے پیرِ مغاں!
کل تو نیا انداز تھا،
اک دور کا تھا خاتمہ اک دَور کا آغاز تھا۔
تیرے وفاداروں نے جب کھیلیں گلابی ہولیاں!
نکلے بنا کر ٹولیاں،
ہنستے چلے، گاتے چلے
اپنے گلابی رنگ سے دنیا کو نہلاتے چلے۔
مسجد سے منھ موڑے ہوئے
مندر کا سنگِ آستاں چھوڑے ہوئے،
گرجا سے کترائے ہوئے،
جیسے کہ ہوں رہبانیت کی زندگانی ہی سے گھبرائے ہوئے۔
دَورِ وفاداری کا یہ انجام تھا،

فکرِ گنہگاری کا تازہ دلربا پیغام تھا
تیرے ہی کوچہ میں یہ سب عہدِ وفا توڑے گئے
رشتے نئے جوڑے گئے
اور پھر گنہگاروں نے کیا رندانہ ہنگامے کئے
اس وقت ان کو یاد تھا، بس ایک ترسانا ترا
مفلس وفاداروں کو للچانا ترا
جب میکدے کی گود میں۔
تیری جفا، تیری سزا کے نام پر ساغر چلے
سوکھے ہوئے کاسے لبالب بھر چلے
سب اپنے لب تر کر چلے
پھر توڑ دیں وہ پیالیاں جن میں سدا پی آئے تھے
شیشے چھنا چھن، چھن، چھنا چھن ٹوٹتے،
اور رند لذت لوٹتے
ٹوٹے ہوئے شیشوں کا اک انبار تھا۔
شیشوں ہی کے انبار میں اک وہ بھی کہنہ جام ہے
جس کو سکندر کے قوی ہیکل جواں،

بھاگ گئے تھے پورس کی زمیں پر چھوڑ کر۔
ان میں وہ کاسے بھی تو ہیں جنکو عرب لے آئے تھے،
اپنی عبا سے ڈھانک کر،
پینے سے پہلے دیکھتے تھے محتسب کو جھانک کر
لیکن، کبھی،
پینے سے باز آتے نہ تھے، فاتح جو تھے!
ان میں ہیں ایسے جام بھی
جن پر پٹھانوں کے قوی ہاتھوں کے دھندلے سے نشاں
کچھ آج بھی موجود ہیں
اور ان نشانوں میں ہے خون مفتوح ہندوستان کا!
اور ان میں ہیں وہ جام بھی جنکو مغل لے آئے تھے
شیراز سے، قندھار سے، کابل سے، رکنا باد سے
مفتوح ہندوستان میں،
جن کو وہ اپنے قصر عالیشان میں چھلکاتے رہے
تیغوں سے کھنکاتے رہے!
اور وہ حسیں، نازک، سُبک، ہلکی صراحی کس کی ہے۔
پیرس کے میخانوں میں یہ مشہور تھی
لایا تھا اک تاجر اُسے جو بعد میں فاتح بنا!
یہ ہلکے شیشوں کے گلاس اور یہ نئے ہلکے سے "پگ"
جن پر لکھا ہے یہ بنے تھے ملکِ انگلستان میں
اور حال کی صدیوں میں یہ چلتے رہے،
پینے کو مل جاتی تھی پی لیتے تھے ہم
لیکن تہی دستی کا یہ عالم تھا دل جلتے رہے
اور آج گھبرا ہی گئے

اور ان سبھی شیشوں کو چکنا چور کر ڈالا وفور جوش میں،
چھن چھن چھنا چھن توڑ کر!
جیسے کہ بربادی کی دیوی چھم چھما چھم ناچتی
ہولی منانے کے لئے میخانے میں آ ہی گئی
ٹوٹے ہوئے شیشوں کے اِس انبار پر
ہم نے جلائی آگ یوں
زردشت کا پاکیزہ دل سچائیوں پر ہنس دیا
جیسے کہ یہ کہنے لگا،
"جلنے دو جلنے دو یونہی شیشے پگھلنے دو یونہی"
تیرے وفاداروں نے یوں پیرِ مغاں!
شب بھر جلائیں ہولیاں
نعرے وہ مستانہ لگے اُس جوش میں
دل گر پڑے احساس کی آغوش میں
اور بول اُٹھے تسلیم اے پیرِ مغاں! جاتے ہیں ہم
" کل پھر پلٹ کر آئیں گے
" اُس وقت اِس میخانے میں سامان ہونگے دوسرے
" تیرے پُرانے ذہن کے معیار توڑے جائیں گے۔
" تعمیرِ نَو کی جائے گی۔
" لیکن ہمارے سالخوردہ مہرباں، پیرِ مغاں!!
" تجھ کو بُرا لگتا ہے کیوں؟
" غیروں کا کیا تیرا بھی کیا؟
" یہ میکدہ ہم سب کا ہے پنچائتی
" تو کیا ہے، تیرا خوف کیا؟
" کہہ تو دیا پیرِ مغاں! کل پھر پلٹ کر آئیں گے

ہرگز نہ ہم باز آئیں گے
" کس کو ڈراتا ہے کہ تم اسکی سزا پاؤ گے
" گاتے تھے ہم، گاتے ہیں ہم، گائیں گے ہم
" ہرگز نہ باز آئیں گے ہم
" جو عمر بھر پیتے تھے، پیتے جائیں گے
" جھیلیں گے، جیتے جائیں گے
" پیروں میں ہے زنجیر لیکن ٹوٹ بھی سکتی ہے یہ
" ہاں آج ہستی قید ہے کل چھوٹ بھی سکتی ہے یہ!
" گانے دے گانے دے ہمیں!
" دھومیں مچانے دے ہمیں
" شیشے کو شیشے سے لڑانے دے ہمیں
" چھن چھن چھنا چھن کی صدا
" بڑھنے دے بڑھنے دے ابھی
" ہم مست و بیخود ناچتے، گاتے، جلاتے، توڑتے
" ہنستے رہیں چلتے رہیں
" اور تو بھی خود پیر مغاں!
" ہولی کے نغمے سن ذرا اور دیکھ اپنی آنکھ سے،
" تیرے وفاداروں نے کیا کھیلیں گلابی ہولیاں!!
منہ میکدے سے موڑ کر ہولی کی یہ ٹولی چلی
گلزار میں
سبزے، لچکتی ڈالیاں، گنجان سندر جھاڑیاں
پانی کی سینچی کیاریاں، کانٹوں میں چھبتی پتیاں
یہ سب سہی لیکن یہاں وہ شے کہاں؟
جس کے لئے مشہور ہے بیت شراب

سرچشمۂ انگور ناب!
ہاں کیا کہا پیر مغاں؟
تلوؤں کے نیچے پھول ہیں
خالی ہیں گلدستے مرے ان میں سے دو اک چن بھی لوں!
تجھ کو نہیں معلوم ابھی
خالی یہ گلدستے ترے، خالی ہی رہ جائیں گے اب
اور تیرے کمروں میں نہ وہ آئیں گے اب
منہ بند کلیاں اب کہاں ؟
جو اپنی سندر موہنی مسکاں کر دیں رائگاں!
اور اپنا گلشن چھوڑ دیں سینے میں خوشبوئیں لئے
اور اجنبی ماحول میں
طاق نظر کی کانپتی زینت نہیں
خوشبوئیں پھیلانے لگیں۔
کلیوں کے منہ اب کھل چکے، منہ بند کلیاں اب کہاں؟
کلیاں کہاں یہ پھول ہیں،
خاک چمن کی گود میں آرام جاں یہ پھول ہیں
آتش زباں یہ پھول ہیں
اور دیکھ تو یہ پھول کتنے شوخ ہیں
جو ٹوٹ کر شاخوں سے گر جاتے ہیں تیری راہ میں
اے دل شکن پیر مغاں!
اور دیکھ اُن کی ہمتیں
یہ چاہتے ہیں روک دیں گلزار میں راہیں تری
تیرے لئے چارہ ہی اب کیا رہ گیا
ان بے حیا پھولوں کی آنکھوں کا تو پانی بہ گیا

اب ہیں یہ اُن کی جرأتیں ۔ روکیں گے تیرے راستے

تو بھی خُدا کے واسطے

ان کو کچل دے پیس دے، ورنہ خدا ناخواستہ

یہ روک ہی لیں راستہ

کلیاں نہیں کانٹے ہیں یہ

کانٹوں سے بھی بدتر ہیں یہ نشتر ہیں، خنجر ہیں

گلزار میں تیرے قدم کچھ آج تو آئے نہیں

تو نے انہیں سبزوں پہ کی ہے مَے کشی

گلزار پر حق ہے ترا

توڑ گیا اے دل شکن پیرِ مغاں!

کتنا بھیانک خواب تھا

تعبیر کچھ بھی ہو مگر

تیرے وفاداروں نے کل

کس آن سے، کس بان سے، کس شان سے

کھیلیں گلابی ہولیاں

شمیم کرہانی

روشن اندھیرا

بن گئی تھی سرزمینِ ہند میدانِ قتال
زندگی نے زندہ رہنے کا اٹھایا تھا سوال

تھا زبانوں پر یہ نعرہ آشیاں کو چھوڑ دو
چھوڑ دو اے غاصبو ہندوستاں کو چھوڑ دو

اس صدا نے چوٹ پہنچائی ستم کے ناز پر
چھا گئیں توپیں گرج کر درد کی آواز پر

موت کا پرچم فضا کے دوش پر لہرا گیا
زندگی کے صحن میں غم کا اندھیرا چھا گیا

اس اندھیرے میں گھروں کی روشنی لوٹی گئی
موت نے خوشیاں منائیں زندگی لوٹی گئی

چھاؤنی ظالم لٹیروں کی پڑی تھی سامنے
لاج سیتا کی جھکائے سر کھڑی تھی سامنے

بے ردا تھی عزتِ مسلم ہجومِ عام میں
سر برہنہ کارواں جیسے دیارِ شام میں

آبرو کا چاند جب آشوب کے ہالوں میں تھا
اپنا بھائی بھی تماشا دیکھنے والوں میں تھا

تھا وطن آفت میں یارانِ وطن دیکھا کیے
آشیاں لٹتا رہا اہلِ چمن دیکھا کیے

بے خبر کہتے تھے غم کی تاب کیا لاؤ گے تم
آگ وہ دہکی ہے جل کر خاک ہو جاؤ گے تم

ان سے کہہ دو بات وہ جن کی ہوا میں کھو گئی
تپ کے سونا بن گئے ہم آگ ٹھنڈی ہو گئی

○

سچ کی دنیا جھوٹ کی ظلمت سے کالی تھی ضرور
موت نے ہستی پہ وقتی فتح پائی تھی ضرور

پا بجولاں عشق تھا، اہلِ وفا جیلوں میں تھے
ہم تھے بے منزل ہمارے رہنما جیلوں میں تھے

ہم بھٹکتے پھر رہے تھے اپنی منزل کے لئے
ناؤ چکر کاٹتی پھرتی تھی ساحل کے لئے

ہم نے کی تھی جنگ امن و آشتی کے واسطے
موت سے لی تھی لڑائی زندگی کے واسطے

شورشیں کرتے تھے برما چین لینے کے لئے
بن گئے تھے ہم فسادی امن دینے کے لئے

اس خطۂ پرظلم سے احکام بربادی ملے
کیوں کہا ہم نے کہ انسانوں کو آزادی ملے

ہاں عمل کی راہ میں کب مانتے تھے ہار تم
تھے وطن کے جاں نثار و عزم کی تلوار تم

تم نے کی پیکار آفت سے تباہی سے لڑے
حق کی تابانی تھے باطل کی سیاہی سے لڑے

گولیاں کیں رد اہنسا کی ملائم دھات سے
دھاریں تلواروں کی موڑیں تم نے خالی ہات سے

وہ اٹھے طوفان، بیڑے دب گئے، پل بہہ گئے
ہو گئے تم پار اور دشمن تمھارے رہ گئے

تم چلے اور زندگی کا رنگ برساتے چلے
ظالموں کو خون کی گنگا میں نہلاتے چلے

چھاتیوں کے پار ہوتیں سنسناتی گولیاں
ہولیاں خوں کی مناتیں منچلوں کی ٹولیاں

کمسنی بڑھتی جو آگے بن کے مستی موج کی
شرم سے گردن جھکا لیتی جوانی فوج کی

ٹوٹتا کوئی کنول جب زندگی کے جھاڑ سے
ماں کے آنسو مسکراتے، چلمنوں کے آڑ سے

شمیم کرہانی

پاکستان چاہنے والوں سے

ہم کو بتلاؤ تو کیا مطلب ہے پاکستان کا
جس جگہ اس وقت ہیں مسلم نجس ہے کیا وہ جا؟

وہ ہمارے پیشوا جو فردِ تھے ایمان میں
ان کے مدفن بن گئے کیا غیر پاکستان میں؟

نیشِ تہمت سے ترے چشتی کا سینہ چاک ہے
جلد بتلا کیا زمیں اجمیر کی ناپاک ہے؟

کفر کی وادی میں ایماں کا نگینہ کھو گیا
ہائے کیا خاکِ نجس میں شاہ مینا سو گیا؟

گلشنِ گردوں رہے جس سبز پھلواری کی دھاک
کیا نجس ہے اس کی خاکِ پاک تیرے منہ میں خاک

دین کا مخدوم جو کلیر کی آبادی میں ہے
آہ اس کا آستانہ کیا نجس وادی میں ہے؟

ہیں اماموں کے جو روضے لکھنؤ کی خاک پر
بن گئے کیا توبہ توبہ خطۂ ناپاک پر؟

بات یہ کیسی کہی تو نے کہ دل نے آہ کی
کیا زمیں طاہر نہیں درگاہ نور اللہ کی؟

واعظ اپنے منبر مسجد پہ جو گل بیز تھے
آہ کیا وہ دامن آلودہ تھے کفر آمیز تھے؟

آہ اس پاکیزہ گنگا کو نجس کہتا ہے تو
جس کے پانی سے کیا مسلم شہیدوں نے وضو

نام پاکستاں نہ لے گر تجھکو پاسِ دین ہے
یہ گزشتہ نسل مسلم کی بڑی توہین ہے

ٹکڑے ٹکڑے کر نہیں سکتے وطن کو اہلِ دل
کس طرح تاراج دیکھیں گے چمن کو اہلِ دل

گر وطن میں چھوٹی چھوٹی سی ریاست بن گئی
پھر تو یہ سمجھو کہ انگریزی حکومت بن گئی

پارہ پارہ ہو کے یورپ آ گیا ہے زیرِ دام
ہر ریاست ہے عرب کی شاہ لندن کی غلام

کیا یہ مطلب ہے کہ ہم محرومِ آزادی رہیں
منقسم ہو کر عرب کی طرح فریادی رہیں

دس کروڑ اسلام کے لخت جگر در در پھریں
کوچۂ انگریز میں کھاتے ہوئے ٹھوکر پھریں

خم کریں حاکم کی چوکھٹ پر وہ عزت کی جبیں
جو سوائے سجدۂ خالق کہیں جھکتی نہیں

پائے باطل آہ کھیلے اس کلاہِ ناز سے
جس کو احمد نے پہنایا تھا عجب انداز سے

سرورِ کونین جس کو درجۂ ممتاز دے
لے کے وہ کاسہ دیارِ غیر میں آواز دے

جس کو سینچے خوں نبی کے لاڈلے گلفام کا
باغباں انگریز ہو اس گلشنِ اسلام کا

سربلندی پائے جو کارِ گرامی کے لئے
سرنگوں ہو جائے وہ امت غلامی کے لئے

ٹکڑے ٹکڑے ہو کے مسلم خستہ دل ہو جائے گا
نخلِ جمعیت سراسر مضمحل ہو جائے گا

تلوک چند محروم

آزاد ہند فوج

اے جیشِ سرفروش جوانانِ خوش نہاد سینے پہ تیرے کند ہوئی تیغِ استبداد
غربت میں دی ہے تو نے شجاعت کی خوب داد اقوامِ دہر کرتی ہیں جرأت پہ تیری صاد
تو کامگار ہو، ترے دشمن ہوں نامراد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد!"

دریا و دشت و کوہ میں تیرا بگل بجے جس کی صدا سے گنبدِ گردوں بھی گونج اٹھے
میداں میں موت بھی ہو مجسم جو سامنے تیرے دلاوروں کے نہ ہوں پست حوصلے
ہو بلکہ ان کا جوشِ عمل اور بھی زیاد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد!"

پردیس میں جو کھیت رہے ہیں جواں ترے ہیں دفن زیرِ خاک خزانے وہاں ترے!
برما کے جنگلوں میں لہو کے نشاں ترے نقشِ دوام ہیں وہ تہِ آسماں ترے!
تا روزِ حشر اہلِ وطن کو رہیں گے یاد!
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

غالب تھا بسکہ ساحرِ افرنگ کا فسوں دو سو برس سے تھا علمِ ہند سرنگوں
تو نے دیارِ غیر میں دکھلا دیا کہ یوں مردانِ کار کرتے ہیں باطل کو غرقِ خوں
باطل ہو خواہ کوہِ گراں خواہ گرد باد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

سبھاش چندر بوس

بہادر شاہ ظفر کے مزار پر

السلام اے عظمت ہندوستاں کی یادگار
آج پہلی بار تیری قبر پہ آیا ہوں میں
گردشِ تقدیر کے ہاتھوں وطن سے دُور ہوں
شوقِ آزادی کا مجھ کو کھینچ لایا ہے یہاں
میں بھی ہوں اپنے وطن سے دور تو بھی دور ہے

اے شہنشاہِ دیارِ دل! فقیرِ بے دیار
بے نوا ہوں نذر کو بے لوث دل لایا ہوں میں
ایک بلبل ہوں مگر صحنِ چمن سے دُور ہوں
آج دشمن ہے زمیں میری عدو ہے آسماں
ہاں رضائے پاکِ یزداں کو یہی منظور ہے

میرا دامن بھی یہاں کی خاک سے آلودہ ہے
فرق صرف اتنا ہے میں آوارہ تو آسودہ ہے

اے شہِ خوابیدہ! اے تقدیرِ بیدارِ وطن
میرے دل کو یاد ہے اب تک وہ ستاون کی جنگ
میری نظروں میں ہے میرٹھ اور دہلی کا زوال
میں نہیں بھولا ابھی انجامِ نانا فرنویس

آئینہ میری نگاہوں پر ہے ادبارِ وطن
جس کے بعد اس سرزمیں پہ چھا گئے اہلِ فرنگ
جانتا ہوں میں جو تھا جھانسی کی رانی کا مآل
ہے نظر میں کوششِ ناکامِ نانا فرنویس

داستاں جیسے بھی ہو گزری وہ سب معلوم ہے
تیرے دلبندوں پہ جو گزری وہ سب معلوم ہے

یہ وطن روندا ہے جس کو مدتوں اغیار نے
جس پہ ڈھائے ظلم لاکھوں چرخِ ناہنجار نے

جس کو رکھا مدتوں قسمت نے ذلت آشنا
جس نے ہر پہلو میں دیکھی پستیوں کی انتہا

آج پھر اس ملک میں اک زندگی کی لہر ہے
خاک سے افلاک تک تابندگی کی لہر ہے

آج پھر اس ملک کے لاکھوں جواں بیدار ہیں
حریت کی راہ میں مٹنے کو جو تیار ہیں

آج پھر بے نیام اس ملک کی تلوار دیکھ
سونے والے جاگ اپنے خواب کی تعبیر دیکھ

اس طرح لرزے میں ہے بنیادِ ایوانِ فرنگ
کھا چکے ہیں مات گویا شیشہ بازانِ فرنگ

حبِ قومی کے ترانوں سے ہوا لبریز ہے
اور توپوں کی دنادن سے فضا لبریز ہے

شورِ گیر و دار کا ہے پھر فضاؤں میں بلند
آج پھر ہمت نے پھینکی ہے ستاروں پر کمند

پھر امنگیں آرزوئیں ہیں دلوں میں بے قرار
قوم کو یاد آ گیا ہے اپنا گم گشتہ وقار

نوجوانوں کے دلوں میں سرفروشی کی امنگ
عشق بازی لے گیا ہے عقل بیچاری ہے دنگ

آج پھر اس دیس میں جھنکار تلواروں کی ہے
کچھ نرالی کیفیت پھر دیس کے پیاروں کی ہے

جو توانائی ارادوں میں ہے کہساروں کی ہے
ذرے ذرے میں نہاں تابندگی تاروں کی ہے

یہ نظارہ آہ لفظوں میں سما سکتا نہیں
"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں"

فتح و نصرت کی دعاؤں سے ہوا معمور ہے
نعرۂ "جے ہند" سے ساری فضا معمور ہے

مجھ کو اے شاہِ وطن! اپنے ارادوں کی قسم
جن کے سر کاٹے گئے ان شاہزادوں کی قسم

تیرے مرقد کی مقدس خاک کی مجھ کو قسم
میں جہاں ہوں اُس فضائے پاک کی مجھ کو قسم!

اپنے بھوکے جاں بلب بنگال کی مجھ کو قسم
حاکموں کے دست پرورکال کی مجھ کو قسم

لال قلعے کی، زوالِ شہرِ دہلی کی قسم
محسنِ دہلی! مآلِ شہرِ دہلی کی قسم

میں تری کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لاؤں گا
اور ترے مرقد پہ نصرت یاب ہو کر آؤں گا

تیغِ ہندی جس کا لوہا مانتا ہے اک جہاں　　جس کی تیزی کی گواہی دے رہا ہے آسماں
تیغِ ہندی جس کو میں نے کر دیا ہے بے نیام　　جس کا شیوہ حرّیت کیشی، جہانگیری ہے کام
جس نے پوری منصفی کی آج تک دنیا کے ساتھ　　ظلم کی دشمن ہے جو اک ظلم بے پروا کے ساتھ
ہر قدم پر جس نے باطل کو ملایا خاک میں　　جس کے ساکھوں کی ابھی تک گونج ہے افلاک میں؟
آج پھر اپنی نظر جس کی چمک سے خیرہ ہے　　جس کی تابانی سے روشن اک جہاں، تیرہ ہے

اک جزیرے کے حسیں ساحل سے جب ٹکرائے گی
چین سے مجھ کو بھڑکتی آگ میں نیند آئے گی

جگر مرادآبادی

قحطِ بنگال

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

بچوں کا تڑپنا وہ بلکنا وہ سسکنا
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انساں کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں
ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

خاموش نگاہوں میں امڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں

بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیٔ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

اک تیغ کی جنبش سی نظر آتی ہے مجھ کو
اک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینکدو اس کا جسم خالی

یہ سیمگوں نرم نرم کرنیں
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیلگوں آسماں کی دنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حُسنِ بے نام کے اشارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے

جوان، دلکش، حسین چہرے سے چھین لی غم نے تابناکی!

کھلی ہوئی بدنصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے
اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے
بہیمیت کو جگا دیا ہے

لذیذ انبار نعمتوں سے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
اور آخرش راندۂ جہاں سے زمیں کی آغوش نے وفا کی
اسی لئے کیا اُگا کریں گے
یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں
کہ ان کو ایک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سلا دیں

فراق گورکھپوری

آزادی

مری صدا ہے گلِ شمعِ شامِ آزادی
سنا رہا ہوں دلوں کو پیامِ آزادی

لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے
اُچھل رہا ہے زمانہ میں نامِ آزادی

مجھے بقا کی ضرورت نہیں کہ فانی ہوں
مری فنا سے ہے پیدا دوامِ آزادی

جو راج کرتے ہیں جمہوریت کے پردے میں
انھیں بھی ہے سر و سودائے خامِ آزادی

بنائیں گے نئی دنیا کسان اور مزدور
یہی سجائیں گے دیوانِ عامِ آزادی

فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اٹھتا ہے
ارے یہ صبحِ غلامی! یہ شامِ آزادی

یہ مہر و ماہ یہ تارے یہ بامِ ہفت افلاک
بہت بلند ہے ان سے مقامِ آزادی

فضائے شام و سحر میں شفق جھلکتی ہے
کہ جام میں ہے مئے لالہ فامِ آزادی

سیاہ خانۂ دنیا کی ظلمتیں ہیں دو رنگ
نہاں ہے صبحِ اسیری میں شامِ آزادی

سکوں کا نام نہ لے، ہے وہ قیدِ بے میعاد
ہے پے بہ پے حرکت میں قیامِ آزادی

یہ کاروان ہیں پسماندگانِ 'منزل کے'
کہ رہروؤں میں یہی ہیں اِمامِ آزادی

دلوں میں اہلِ زمیں کے ہے نیو اس کی مگر
قصورِ خلد سے اونچا ہے بامِ آزادی

وہاں بھی خاک نشینوں نے جھنڈے گاڑ دیے
ملا نہ اہلِ دول کو مقامِ آزادی

ہمارے زور سے زنجیرِ تیرگی ٹوٹی
ہمارا سوز ہے ماہِ تمامِ آزادی

ترنمِ سحری دے رہا ہے جو چھپ کر
حریفِ صبحِ وطن ہے یہ شامِ آزادی

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراق
ہماری سانس سے روشن ہے نامِ آزادی

عرشؔ ملسیانی

اِنقلاب

آستانِ دیوِ استبداد پر ۔۔۔ جھک نہیں سکتی جبینِ انقلاب
آسمان کے جور سے جو تنگ ہوں ۔۔۔ ان کا مامن ہے زمینِ انقلاب
ہے شہیدانِ وطن کی یاد میں ۔۔۔ خون سے تر آستینِ انقلاب
صاحبِ خرمن ہیں دنیا میں وہی ۔۔۔ جو رہے ہیں خوشہ چینِ انقلاب
جامِ زہرابِ قدامت چھوڑ کر ۔۔۔ ہم پئیں گے انگبینِ انقلاب
ہے غلاموں کا خدا عزمِ بلند ۔۔۔ دینِ مظلوموں کا دینِ انقلاب

اے قدامت کیش تو بھی تو بدل
ہے اگر تجھ کو یقینِ انقلاب

ابھی نہیں

بہار ہے تو کیا حرام ہے نشاطِ گلستاں
ابھی تو خود ہی سینۂ چمن میں آگ ہے نہاں

یہ جشنِ گل ابھی نہیں! یہ رنگ و بو ابھی نہیں!

ابھی تو پرفشاں دلِ بشر میں غم کی آگ ہے
ابھی تو وقت کے لبوں پہ شعلہ بار راگ ہے

نوائے سازِ مطربانِ خوش گلو ابھی نہیں!

ابھی تو چرخِ زندگی پہ ظلمتوں کا دود ہے
ابھی تو بجلیوں کی زد پہ خرمنِ وجود ہے

نظارہ سوز مہ وشوں کی آرزو ابھی نہیں!

ابھی تلاطمِ حیات ہے کمالِ اوج پر
ابھی سفینۂ بشر ہے ظلمتوں کی موج پر

چراغِ ماہتاب و سیرِ آب جُو ابھی نہیں!

ابھی تو غیر معتبر ہے شرح کائنات کی
ابھی تو بحث گرم ہے مسائلِ حیات کی

نیاز و ناز کی لطیف گفتگو ابھی نہیں !

ابھی تو دورِ نو ہے غرقِ شورِ ناوک و کمند
ابھی تو جامِ ارض سے ہے ایک موج خوں بلند

مئے کہن ابھی نہیں، خم و سبو ابھی نہیں !

جھکا وہ فرقِ آسماں اُٹھی وہ تیغ بے نیام
ہم اپنے ملک و قوم کو رکھیں گے کیا سدا غلام

جوانیوں کا سرد اس قدر لہو ابھی نہیں !

مسعود اختر جمال

کسانوں کا گیت

یہ دھرتی، یہ جیون ساگر، یہ سنسار ہمارا ہے

امرت بادل بن کے اُٹھے ہیں، پربت سے ٹکرائیں گے
کھیتوں کی ہریالی بن کر، چھب اپنی دکھلائیں گے
دنیا کا دُکھ سُکھ اپنا کر، دنیا پر چھا جائیں گے

ذرّہ ذرّہ اس دنیا کا آج گگن کا تارا ہے
یہ دھرتی، یہ جیون ساگر، یہ سنسار ہمارا ہے

دُکھ بندھن کٹ جائیں گے، سُکھ کا سندیسہ آئے گا
مٹی اب سونا اُگلے گی، بادل ہُن برسائے گا
محنت پر ہے جس کا بھروسہ، محنت کا پھل پائے گا

اپنے ہی کس بل کا سمندر وقت کا بہتا دھارا ہے
یہ دھرتی، یہ جیون ساگر، یہ سنسار ہمارا ہے

سپنوں کے سندر آنچل سے آشا روپ دکھاتی ہے
اپنی ہی آواز کی لَے پر، ساری دنیا گاتی ہے
آج ترنگے کی لہروں میں، بجلی سی لہراتی ہے

ایک ہی وار میں اب لے ساتھی دشمن سے چھٹکارا ہے
یہ دھرتی، یہ جیون ساگر، یہ سنسار ہمارا ہے

زنداں

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

گولی کے یہ چلنے کی سَن سَن پھیلا ہوا اگنی کا دامن
کس جرم کی ہیں یہ یاد نہیں کیوں لوٹتی پھرتی ہیں لاشیں
اس ظلم کی کوئی حد بھی ہے آخر کوئی اس کا رد بھی ہے

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

بہتی ہے یہاں اُلٹی گنگا نوکر چنگا مالک ننگا
کھانے کو لوہے کی تھالی گندی گندی کالی کالی
خونخوار نگاہوں کی سازش پیٹھوں پر کوڑوں کی بارش
ہاتھوں میں چکّی کے چھالے ہر سانس پہ جینے کے لالے
قدغن ہے لبوں کے ہلنے پر پابندیاں آنکھیں ملنے پر

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

چھپ چھپ کے یہ ملنا آپس میں	پھنکتے ہوئے دل کس کے بس میں
خاموشی نظر کے جیکارے	یہ جیکارے یہ انگارے
اک روز قیامت ڈھائیں گے	بے نام و نشاں کر جائیں گے

یہ اونچی اونچی دیواریں
یہ زنجیروں کی جھنکاریں

کیفی اعظمی

آخرِ مرحلہ

حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اُٹھائے ہوئے

بڑھے ہیں جھیلے ہوئے قید و بند کے آزار
اُٹھے ہیں جنگ خلافت کے آزمائے ہوئے

شجاع حیدر و ٹیپو کی گود کے پالے
دلیر نانک و رنجیت کے سکھائے ہوئے

خمار بادۂ اقبال کا نگاہوں میں
لبوں پہ نغمہ ٹیگور مسکرائے ہوئے

نفس میں آنچ گرجتی ہوئی مشینوں کی
قدم پہ آتش و آہن کا سر جھکائے ہوئے

جبیں پہ دھان کے کھیتوں کی نرم ہریالی
نظر میں قحط کی پرچھائیاں چھپائے ہوئے

بھڑک کے دوشِ ہوا پر بچھا رہے ہیں کمند
شرر جو سرد کتابوں میں تھے دبائے ہوئے

فضا میں سُرخ پھریرا لٹا رہا ہے حیات
ہوا کی زد پہ چراغِ عمل جلائے ہوئے

تڑپ کے گرنے ہی والی ہے برق زنداں پر
کھڑے ہیں در پہ اسیر آسرا لگائے ہوئے

○

ابھی کھلیں گے نہ پرچم ابھی پڑے گا نہ رن
کہ مشتعل ہے مگر متحد نہیں ہے وطن

پکارتا ہے افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن

یہ انتشار، یہ ہلچل، یہ مورچوں میں شگاف
مذاق اُڑاتے ہیں عزمِ جہاد کا دشمن

نکل کے صف سے کھڑے ہوگئے ہیں کچھ ساونت
بڑھا کے ہاتھ محبت سے تھام لو دامن

پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلا دو تشکک کے خرمن

یہ یاس کیوں ؟ یہ تمنائے خودکشی کیسی ؟
نوید فتح ہے قلب عوام کی دھڑکن

مٹا دو مل کے مٹا دو نشان غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

گوپی ناتھ آمن

نوائے آزادی

عجیب لوگ ہیں یہ حریت کے دیوانے
جو قید خانے کو سمجھے مکانِ آزادی
اندھیری رہتی ہے دائم غلام کی دنیا
تجلیات سے پُر ہے جہانِ آزادی
جو سو رہے تھے وہ سب جاگ اُٹھے، اُچٹ گئی نیند
جو ہم سُنانے لگے داستانِ آزادی
بہ یک نگاہ بہ یک لفظ کردہ اعجازے
غلام ہمت آں پاسبانِ آزادی

اُردو میں

قومی شاعری

کے

سَو سال

سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۵۷ء تک

جعفر علی خاں اثر

اہنسا کی پہلی سنہری کرن

خراماں خراماں چلی آ رہی ہے — نگاہوں پہ اک حُسن سے چھا رہی ہے
ہر اک گام پہ نور بکھرا رہی ہے — افق پر دہ پرچم کو لہرا رہی ہے

اہنسا کی پہلی سنہری کرن

ملی کیمیا گر کو آخر وہ بوٹی — کہ جس سے علائق کی زنجیر ٹوٹی
شبِ تار میں جیسے مہتاب چھوٹی — تجلی کے پردے سے پھوٹی وہ پھوٹی

اہنسا کی پہلی سنہری کرن

نیا روپ ہستی نے پیدا کیا ہے — ہر اک دل میں اک ولولہ بھر رہا ہے
سعیبت کا احساس ہمّت فزا ہے — کہ اربابِ بینش کی اب رہنما ہے

اہنسا کی پہلی سنہری کرن

زمین و زماں ہمنوا ہو رہے ہیں — کہ دل والے تخمِ وفا بو رہے ہیں
وہی پا رہے ہیں جو کچھ کھو رہے ہیں — جگائے گی ان کو بھی جو سو رہے ہیں

اہنسا کی پہلی سنہری کرن

آ ہی گیا

حکمِ معزولی بہ نامِ تیرگی آ ہی گیا
وادیٔ شب میں پیامِ روشنی آ ہی گیا

روشنی ڈوبے ہوئے تاروں کی کام آ ہی گئی
آج ہر ذرّے میں نورِ کوکبی آ ہی گیا

چیرتا ظلمت کو تہ در تہ سحاب اندر سحاب
پھر افق پر آفتابِ زندگی آ ہی گیا

اک مہک دینے لگے کھلتے ہوئے سے برگِ گل
اب چمن میں ختم دورِ غنچگی آ ہی گیا

انجمن میں تشنہ کاموں کی بہ صد مینا و جام
آج ساقی لے کے اذنِ میکشی آ ہی گیا

گھاؤ جن کانوں میں تھے آقا کے حرفِ تلخ کے
ان میں اک نغمہ بہ لحنِ مادری آ ہی گیا

تیشۂ فرہاد بہرِ قصرِ خسرو تابہ کے
کوہکن کی زد پہ قصرِ خسروی آ ہی گیا

دورِ آہن ، دورِ ایماں ، دورِ شاہی ، دورِ زر
روندتا ان سب کو دورِ آدمی آ ہی گیا

اے عروسِ ہند کے بکھرے ہوئے موتی کے ہار
گوندھنے پھر تجھ کو تیرا جوہری آ ہی گیا

شمع رکھی جا رہی ہے ہندِ نو کے سامنے
نظمِ افرنگی کا شعرِ آخری آ ہی گیا

اک حقیقت بن کے ملاؔ خوابِ ارمانِ وطن
اے زہے قسمت کہ اپنے جیتے جی آ ہی گیا

ساغر نظامی

اے صبحِ وطن

اے صبح وطن اے صبحِ وطن اے روحِ بہار اے جانِ چمن
اے مطرب یا اے ساقیٔ من اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

لے جوشِ جنوں کی ضربوں نے زنجیرِ غلامی توڑ ہی دی
جمہور کے سنگیں پنجے نے شاہی کی کلائی موڑ ہی دی
تاریخ کے خونیں ہاتھوں سے چھینا ہے ترا سیمیں دامن
اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

پھر لوٹ کے آیا صدیوں میں اقبال و طرب کا سیّارہ
کرنوں میں افق پر پھر چمکا پستی کے اندھیروں کا مارا
حیراں حیراں نازاں نازاں خنداں خنداں روشن روشن
اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

دھرتی کے تبسم سے چمکے آفاقِ ابد کے سیّارے
ظلمت کے ترنم سے پھوٹے نورِ ابدیّت کے دھارے
ذرّوں کو تغیّر نے بخشا اک معجزۂ خورشید شکن
اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

سوئے ہوئے ذرّے جاگ اٹھے انوارِ سحر بیدار ہوئے
احساسِ زمیں بیدار ہوا، افکارِ بشر بیدار ہوئے
بستر سے خذف ریزے اٹھے اور لعل و گہر بیدار ہوئے
آنکھوں کو ملا گلزاروں نے شاخوں پہ ثمر بیدار ہوئے

نینوں سے مستی برساتی لو جاگ اٹھی ہستی کی دولہن

اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

بنجر دھرتی کی نس نس میں پودوں کا تخیل لہرایا

اُجڑے کھیتوں پر سایہ ہے گیہوں کے سنہری خوشوں کا

ہر برگِ فسردہ سے لی کھینچا دوشیزہ بہاروں کا دامن

اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

سنسان بیابانوں میں ہے اک جذبۂ گلشن آرائی

ویراں کھنڈروں میں لیتا ہے محلوں کا تصور انگڑائی

سیپی کی روپہلی جھولی میں ہیں آج ہزاروں درِّ عدن

اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

ذرّات میں کروٹ لینے لگے سولا رخسان و ماہ جبیں

سنگین چٹانوں میں جاگے اصنام کے قدّ و خالِ حسیں

ہے دیر کہ کعبہ کیا جانے ہے کون سا عالم زیرِ زمیں

مسجود نہیں ہے کوئی بھی سجدے میں مگر جھکتی ہے جبیں

نقاش ہے تیری پرچھائیں آذر ہے ترے سورج کی کرن

اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

آہن کی صلابت میں ابھرا معصوم تصور نرمی کا

پھولوں کی لطافت میں امڈا آہن بن جانے کا جذبا

ترنوں کی خموشی کو حسرت ہے سیلِ بیاں بن جانے کا

صدیوں کی اداسی کو ضد ہے اک نطقِ جواں بن جانے کی

ہر سانس کے اندر غلطاں ہے تغیّر کے سینے کی دھڑکن

اے صبحِ وطن اے صبحِ وطن

پربت پربت ساگر ساگر پرچم اپنا لہراتا ہے

محلوں پہ ملوں پہ قلعوں پر عظمت کے ترانے گاتا ہے

گلبار ردائے آزادی سرشار جوانی کا پرچم
یہ امن کے نغموں کا مطرب خاموش بغاوت کا یہ علم
تہذیب کا یہ زرّیں آنچل تعمیر کا یہ رنگیں دامن
اے صبحِ وطن اے صبح وطن

قندیلِ سحر نورِ منزل خورشیدِ سحر شمعِ ساحل
یہ خونِ شہیداں کا مخزن یہ دردِ رفیقاں کا حاصل
یہ امن کا لہراتا گیسو یہ صدق و محبت کا درپن
اے صبحِ وطن اے صبح وطن

اب کھیتوں میں گندم ہی نہیں سونا بھی اُگے گا اے ساقی
بخشے گا تغیّر بھوکوں کو اک روز مزاجِ رزّاقی
اب ہیرے موتی اُگلیں گے یہ باغ و صحرا کوہ و دمن
اے صبحِ وطن اے صبح وطن

گاؤں کو سنائیں گے مژدہ احصارِ حسین بن جانے کا
ذرّوں کو سندیسہ دیں گے تڑپ کر مہرِ جبیں بن جانے کا
اور تیرے افق کی لالی سے ہوتے ہیں ستارے بھی روشن
اے صبحِ وطن اے صبح وطن

اب خاکِ قدم مجبوروں کی برسائے گی دنیا پر سونا
اب اطلس کی قسمت ہوگی پیراہنِ محنت کش ہونا
پڑتے ہی نگاہِ صاعقہ زن جل اٹھے گا ہر نظم کہن
اے صبحِ وطن اے صبح وطن

کھیتوں کی زمیں اونچی ہو کر فردوس سے رشتہ جوڑے گی
اب ہل کی انی سرمستی میں آکاش کے تارے توڑے گی
وہ دن بھی اب کچھ دور نہیں جب سیارے ہونگے آنگن
اے صبحِ وطن اے صبح وطن

اقبال احمد سہیل

مبارکباد آزادی

گلزارِ وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج　　سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت و چمن آج
غنچوں کا صبا توڑ گئی قفلِ دہن آج　　ہے ہر گلِ خنداں کی زباں پر یہ سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندانِ محن آج

پھر موج نے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا　　بگڑی ہوئی تقدیر کو ہمت نے سنوارا
کھوئی ہوئی عظمت وہ ملی ہم کو دوبارا　　روشن ہے پھر آزادیٔ مشرق کا ستارا
یہ خوشخبری لاتی ہے سورج کی کرن آج

ہے جمعۂ آخر مہِ پاک رمضاں کا　　اب رنگ بدلنے کو ہے گلزار جہاں کا
دیکھو وہ جھروکے سے مہِ عید نے جھانکا　　صدیوں سے جہاں شور تھا فریاد و فغاں کا
نغموں سے ہے معمور وہی بیتِ حزن آج

رخصت ہے شبِ تارِ غلامی کا اندھیرا　　وہ سامنے ہے صبحِ سعادت کا سویرا
بھارت سے بدیسی کا اکھڑنے لگا ڈیرا　　لہرائے نہ کیوں عظمتِ قومی کا پھریرا
آزاد ہوا قیدِ غلامی سے وطن آج

ہر چند کتر بیونت سے چوکا نہیں صیّاد　　پھر بھی تو بہر حال وطن ہو گیا آزاد
قائم ہوئی جمہوریتِ ہند کی بنیاد　　اب شوق سے پھولے پھلے ہر نخلِ چمن زاد
پھر سبزۂ بیگانہ سے خالی ہے چمن آج

ﮯ یہ نظم جشن آزادیٔ ہند کے موقع پر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اعظم گڑھ میں پڑھی گئی۔

غالب ہوئی طاقت کے مقابل میں سچائی   صیّاد سے چھینی ہے اسیروں نے رہائی
جیتی ہے ہنتوں نے اہنسا کی لڑائی   آزاد کو تبریک، جواہر کو بدھائی
پیچ ہو کے رہا دہر میں گاندھی کا بچن آج

اللہ رے یہ فیض دعائے مدنی کا   آتش کدہ گلزار ہوا حق طلبی کا
لایا رمضاں ہند میں یہ مژدہ خوشی کا   ماتھے سے مٹا بندگیٔ غیر کا ٹیکا
جب آتارا اس چاند کے چہرے سے گہن آج

وہ زندۂ جاوید وطن کے وہ فدائی   جان اپنی جنھوں نے رہ ملت میں گنوائی
ہمت سے انہی کی، ہمیں ساعت یہ دکھائی   انصاری و اجمل ہوں، تلک ہوں کہ ڈیسائی
یاد آتے ہیں ہم سب کو شہیدانِ وطن آج

سرمایۂ ملت ہوئی جاں بازیٔ افراد   قربانی و ایثار کی آخر میں ملی داد
کہتے ہیں یہ اشفاق و بھگت، بسمل و آزاد   اللہ نے سن لی دلِ مظلوم کی فریاد
زینہ ہے حکومت کا وہی دار و رسن آج

جس پاؤں سے کل آتی تھی زنجیر کی جھنکار   آج اس نے کیا مشرق خوابیدہ کو بیدار
وہ ہاتھ جو کل ہتھکڑیوں میں تھے گرفتار   آزادیٔ اقوام کے ہیں آج علم دار
ہیرے سے بھی وزنی ہے جواہر کا سخن آج

جو لوگ خوشامد کیا کرتے تھے بیوپار   آج ان کے لئے سرد ہے اعزاز کا بازار
سر نیچ کے سر لینے کو جو رہتے تھے تیار   وہ مفت بکا چاہیں تو پائیں نہ خریدار
ایثار کے سکے کا ہے دنیا میں چلن آج

اے بادِ صبا خواب سے ٹیپو کو جگا دے   مرحوم ظفر شاہ کے شانے کو ہلا دے
پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکا دے   پھر دونوں کو یہ مژدۂ جاں بخش سنا دے
آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

ہوں گی اسی دنیا میں کہیں جھانسی کی رانی   وہ خالدۂ ہند وہ نوشابۂ ثانی
ہے فخرِ وطن جن کی شجاعت کی کہانی   ان کو بھی سنا جا کے یہ پیغام زبانی
پوری ہوئی آزادیٔ قومی کی لگن آج ۰

ہے یاد ہمیں حضرت جوہر کا وہ ارشاد — آئیں گے نہ وہ ہند میں جب تک نہ ہو آزاد
کہدے کوئی ان سے کہ ہوئی ختم وہ میعاد — اجڑی ہوئی محفل ہے کریں اس کو پھر آباد
آجائیں کہ پورا ہوا وہ عہد کہن آج

رفتار سیاست کے جو نباض ہیں ماہر — کہتے ہیں نئے دور کے آثار ہیں ظاہر
مٹنے کو ہیں صیادیٔ مغرب کے مظاہر — مشرق کے سیہ دار عساکر ہیں جواہر
جاوا کے ہم آواز ہیں قفقاز و یمن آج

اے قلعۂ سرخ اے اثر شاہ جہانی — اے بلدۂ دہلی غم و حسرت کی کہانی
برباد شدہ عظمت ماضی کی نشانی — لے تجھ کو مبارک یہ نیا دور جوانی
تقدیر نے پھر تجھ کو بنایا ہے دولہن آج

ارباب وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل — ہاں جشن منا لو کہ ہے موقع اسی قابل
ہونا نہ کہیں جوش طرب میں کہیں غافل — تخریب تو آسان تھی، تعمیر ہے مشکل
ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یاں ایک — اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود و زیاں ایک — ہم سب کا خدا ایک ہے ہم سب کا نشاں ایک
پھر دل میں ہو کیوں خار عداوت کی چبھن آج

وہ چشم فسوں گر ہے نہ وہ دور شبانا — ہر روز نئے رنگ بدلتا ہے زمانا
کل جو بھی ہوا آج بھلا دو وہ فسانا — اچھا نہیں سوتے ہوئے فتنوں کو جگانا
جائز نہیں آپس میں جبینوں کی شکن آج

وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہب اسلام — جو دین بھی ہو دیتا ہے محبت ہی کا پیغام
مذہب کو خدا کے لئے مت کیجئے بدنام — کل شیر و شکر ہوں یونہی کل ہند کی اقوام
سنگم پہ ہیں جس طرح ملی گنگ و جمن آج

گو تم نے چراغاں کیا کل ملک میں یکسر — روشن کرو الفت کا دیا دل کے بھی اندر
کیوں حرف سہیل آج نہ ہو پھیل کے دفتر — اک شاعرۂ ہند[۵] ہے صوبہ کی گورنر
اٹھے دل شاعر سے نہ کیوں موج سخن آج

---

۵ آنجہانی مسز سروجنی نائیڈو جو اس وقت یو۔پی کی گورنر تھیں۔

مجاز لکھنوی

پہلا جشنِ آزادی

بصد غرور بصد فخر و نازِ آزادی — مچل کے کھل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی — وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزلخواں ہے

ہر اک جبیں پہ ہے اک موجِ نورِ آزادی — ہر ایک آنکھ میں کیف و سرورِ آزادی
غلامی خاک بسر ہے حضورِ آزادی — ہر ایک قصر ہے اک بامِ طورِ آزادی
ہر ایک بام پہ اک پرچمِ زر افشاں ہے

ہر ایک سمت نگارانِ یاسمیں پیکر — نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیلِ نور ہے خیرہ ہے آدمی کی نظر — بصد غرور و ادا خندہ زن ہے گردوں پر
زمینِ ہند کہ جولانگہِ غزالاں ہے

صدا دو انجمِ افلاک رقص فرمائیں — بتانِ کافر و سفاک رقص فرمائیں
شریکِ حلقۂ ادراک رقص فرمائیں — طرب کا وقت ہے بیباک رقص فرمائیں
کہ یہ بہار پیامیٔ صد بہاراں ہے

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں — یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں — ابھی وہ سعیٔ جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں، آغازِ کارِ مرداں ہے

سکندر علی وجد

آفتابِ تازہ

دامانِ چاک اشکِ مسرت سے تر ہے آج
دو سو برس کے بعد طلوعِ سحر ہے آج
شمعِ یقیں کے دم سے شکستوں کی شب کٹی
مہرِ مبیں پیمبرِ فتح و ظفر ہے آج
سامانِ صد ہزار بہاراں لئے ہوئے
اپنی جلو میں گردشِ شمس و قمر ہے آج
مردہ دلوں میں دوڑ گیا خونِ زندگی
چہروں پہ حریت کی شفق جلوہ گر ہے آج
پانی کی بوند قطرۂ آبِ حیات ہے
موجِ ہوا میں مرہمِ زخمِ جگر ہے آج
گلچیں کے ساتھ دورِ تہی دامنی گیا
ہر شاخِ گل سے بارشِ لعل و گہر ہے آج

گلشن کا انقلاب نے نقشہ بدل دیا

شاہیں شکارِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج

اُڑتی ہیں گردِ راہ کے مانند منزلیں

بے باک رخشِ عمر جو گرمِ سفر ہے آج

اک دلنواز خواب حقیقت میں ڈھل گیا

نخلِ اُمیدِ اہلِ نظر بارور ہے آج

محسوس ہو رہا ہے انوکھا سہانا پن

اک سادا جھونپڑا ہی سہی اپنا گھر ہے آج

سب تاجرانِ طوق و سلاسل چلے گئے

اے وجد لطفِ عرضِ متاعِ ہنر ہے آج

عرش ملسیانی

جشنِ آزادی

برق رفتاری پہ اپنی رشک کرتا تھا جہاں
سوئے آزادی ہمارا قافلہ تھا تیز گام
سیکھتا ہے لیکن اب میخانۂ تعمیر میں
جنبش نبض تمنا خرام دورِ جام
منزلِ مقصود تک وہ قوم جا سکتی نہیں
جس کے قبضے میں نہیں اسپِ سیاست کی لگام
ہم کو بچنا چاہیئے ہر اس بُرے اقدام سے
جس سے ہو مطعون دنیا میں وطن کا نیک نام
اتحاد و آشتی ہر دم رہیں پیشِ نظر
جاگزیں دل میں رہے ذوقِ عمل بالالتزام
دورِ آزادی کا گو ہر عیش ہے عیشِ حلال
دل یہ کہتا ہے کہ یوں پابند ہونا ہے حرام
دل کی تلقینات پر پہلے عمل فرمایئے
شوق سے پھر جشنِ آزادی مناتے جایئے

یحییٰ اعظمی

صبح آزادی کا طلوع

اک نیّرِ نو سینۂ مشرق نے اُچھالا
ہے جس کی شعاعوں سے ہر اک سمت اُجالا

ہیں اِک سحرِ تازہ کے آثار ہویدا
ہونے کو ہے اب ظلمتِ گیتی کا ازالہ

پڑنے کو ہے جمہوریتِ ہند کی بنیاد
ایوان حکومت کی بنا ہے تہ و بالا

انگریز کی قسمت میں ہے اب ہند سے جانا
افرنگ کو ہے دیکھنا اب دیس نکالا

لہرائے گا آزادیٔ کشور کا پھریرا
اب ساحلِ مدراس سے تا کوہِ ہمالا

جو خاک تھی کل تک ابھی پامالِ غلامی
رفعت میں وہی آج ہے گردوں سے بھی بالا

مدت سے جو افسردہ و غمگیں و حزیں تھا
ہے رنگ ہی اب اُس رُخِ گیتی کا نرالا

صدیوں کی غلامی کی شبِ تار ہے رخصت
مشرق کے شبستانوں میں چھایا ہے اُجالا

ہے مہرِ جہاں تاب کی اب مدِ مقابل
جو شمعِ سحر تک ابھی لیتی تھی سنبھالا

ظلمت کدۂ ہند میں کیوں ہو نہ چراغاں
سر جیبِ افق سے مہِ تاباں نے نکالا

معمور ہے ہر گوشۂ دامانِ وطن آج
کرتا ہے نثار اوجِ فلک لولوئے لالا

اللہ رے یہ طالعِ مشرق کی بلندی
حیرت میں ہے مغرب کا بھی اب عالمِ بالا

آساں نہ تھا جس بارِ امانت کا تحمّل
صد شکر وطن نے ہے اسے آج سنبھالا

سلیمان اریب

طلوع

ملکۂ شب کی سیہ تاب گھنیری زلفیں
چھا گئیں عارضِ گیتی پہ اندھیرا بن کر
مٹ گیا دن کا چمکتا ہوا ہر نقشِ جمیل
کالی ناگن بنی لیٹی ہے ہر اک راہگذر

اب وہ ہلچل نہیں ہنگامہ نہیں زیست نہیں
غالب آتا چلا جاتا ہے گرانبار سکوت
وقفے وقفے سے مگر قلب کو برماتی ہے
کس کی فریاد ہے یہ جبرِ مسلسل کا ثبوت

کب تلک گردنِ جمہور جھکے گی آخر
کب تلک ظلم کے چلتے ہی رہیں گے آرے
کب تلک آہوں، کراہوں پہ ہنسیں گے آخر
آگ اور خون کے بپھرے ہوئے اندھے نالے

لو اُٹھی شرق سے وہ پہلی کرن کی برچھی
پھٹ گیا سینۂ شب ظلمتیں روپوش ہوئیں
ان گنت زخم نصیبوں کی سسکتی روحیں
عدل و انصاف کی روحوں سے ہم آغوش ہیں

سراج لکھنوی

یومِ آزادی

یقین بن گیا اب تو گمانِ آزادی ۔ زمینِ ہند ہے اور آسمانِ آزادی
سرِ نیاز ہے اور آستانِ آزادی ۔ سنو بلند ہوئی پھر اذانِ آزادی

پہاڑ کٹ گیا نورِ سحر سے رات ملی
خدا کا شکر غلامی سے تو نجات ملی

زمیں وطن کی نیا آسمان بن کے چلی ۔ ہوائے عیش و طرب بادبان بن کے چلی
بہارِ ہند ترنگا نشان بن کے چلی ۔ نسیمِ صبح بہار ارجن کا بان بن کے چلی

سپاہی دیش کا اپنے ہر اک جوان بنا
بل ابروؤں کا کڑکتی ہوئی کمان بنا

ہر ایک ذرہ ہے آئینہ دارِ آزادی ۔ نظر نواز ہے رنگِ بہارِ آزادی
سروں کے ساتھ ہے اب تو وقارِ آزادی ۔ ہے سرزمینِ وطن جلوہ زارِ آزادی

کہاں ہیں آج وہ شمعِ وطن کے پروانے
بنے ہیں آج حقیقت انہیں کے افسانے

غضب کی دیدۂ نرگس میں ہوشیاری ہے ۔ حجاب اٹھ گئے اب کس کی پردہ داری ہے
حسین پھولوں میں رنگ خود اختیاری ہے ۔ کلی نے مانگ بڑے حسن سے سنواری ہے

کھٹک کہاں سے ہو، اب دلیں کوئی پھانس بھی ہے
خدا کا شکر کہ مرضی کی اب تو سانس بھی ہے

حکومت اپنی، علَم اپنا اور نشان اپنا ۔ زمین اپنی، فضا اپنی، آسمان اپنا
اطاعت اپنی، سر اپنا ہے، آستان اپنا ۔ ہیں پھول اپنے، چمن اپنے، باغبان اپنا

جمالِ کعبہ نہیں یا جمالِ دیر نہیں
سب اپنے ہی نظر آتے ہیں کوئی غیر نہیں

آج

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمہارا مغنّی، تمہارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا ہے
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں
میں تمہارا مغنّی ہوں نغمہ نہیں ہوں
اور نغمے کی تخلیق کا ساز و ساماں
ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے
اور میں، اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں

میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اُٹھی ہے
بربریت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرّا رہے ہیں
بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
دربدر پھر رہا ہوں ——
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
میرے گیتوں کی لَے، میرے سُر، میری نَے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے
اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں
سرفروشی کے خوابیدہ جذبے ابھارے
اور اُس صبح کی راہ دیکھی
جس میں اس ملک کی روح آزاد ہے
آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس ملک کے بحر و بر بام و در
اجنبی قوم کے ظلمت افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں
کھیت سونا اُگلنے کو بے چین ہیں
وادیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہیں
سنگ اور خشت بے خواب و بیدار ہیں
اُن کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
اُن کے خوابوں کو تکمیل کا روپ دو
ملک کی وادیاں گھاٹیاں، کھیتیاں
عورتیں، بچیاں ___
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
اُن کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو اُن کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھے بچوں کو اُن کی خوشی بخش دو
ملک کی روح کو زندگی بخش دو
مجھ کو میرا ہنر میری لَے بخش دو
میرے سُر بخش دو، میری لَے بخش دو
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اُس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
دربدر پھر رہا ہوں
مجھ کو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو
میں تمہارا مغنّی ۔ تمہارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہوں گا

جوشؔ ملسیانی

شہیدانِ وطن

دیکھئے ان جینے والوں کا نشانِ زندگی دیکھئے ان مرنے والوں کا جہانِ زندگی
دیکھئے ان پستیوں میں آسمانِ زندگی دیکھئے ان خاک کے ذرّوں کی شانِ زندگی

بیٹھئے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

دیکھئے روحِ وفا کیا کیا اُبھرتی ہے یہاں دیکھئے حُبِّ وطن دل میں اُترتی ہے یہاں
دیکھئے دل کی فضا کیسی نکھرتی ہے یہاں دیکھئے رحمت خدا کی طوف کرتی ہے یہاں

بیٹھئے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

اس جگہ بے رنگیاں بھی عالم تصویر ہیں اس جگہ تاریکیاں بھی شمع کی تنویر ہیں
اس جگہ خاموشیاں بھی اک لبِ تقریر ہیں اس جگہ روپوشیاں بھی دل کی دامنگیر ہیں

بیٹھئے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

اُٹھ گئے دنیا سے لیکن ایک دنیا ہو گئے بلبلے پانی کے تھے ٹوٹے تو دریا ہو گئے
یہ وہ تھے ذرات جو اُڑ کر ثریا ہو گئے یہ وہ تھے بیمار جو مر کر مسیحا ہو گئے

بیٹھئے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

دل کے اُجڑے باغ کو آباد ہوتے دیکھئے روح کی افسردگی کو شاد ہوتے دیکھئے
بندگی کو قید سے آزاد ہوتے دیکھئے پر شکستہ صید کو صیاد ہوتے دیکھئے

بیٹھئے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

آیئے اس خاک سے کسبِ فضیلت کیجئے آیئے قربان اس پر دل کی دولت کیجئے
ہاں ذرا رُک جایئے اتنی نہ عجلت کیجئے اس زیارت گاہ عالم کی زیارت کیجئے

بیٹھئے دم بھر شہیدانِ وطن کی خاک پر

اِنتقام

میں کس سے اُنتقام لوں
یہ سچ ہے بیکسوں کے خوں سے سرخ ہو گئی زمیں
مصیبتوں کی داستاں میں سُن چکا ہوں ہم نشیں
میں سُن چکا ہوں کس طرح بزرگ و ناتواں بھی
بلکتے شیرخوار بھی فسردہ نوجوان بھی
اجل کے گھاٹ ایک ایک کر کے سب اُتر گئے
گھروں کی شاہزادیاں ۔ حریمِ ناز کی مکیں
(جو عفتیں گنوا چکیں ۔ جو عصمتیں لٹا چکیں)
بھٹک رہی ہیں در بدر
برہنہ پا ۔ برہنہ سر
میں سُن چکا ہوں ہم نشیں یہ داستانِ دل خراش
مگر کسے میں دوش دوں
میں کس سے اُنتقام لوں

تباہیوں کی گود کے پلے ہوئے کسان سے ــــــ؟
کہ جنگِ انقلاب کے سپاہی ــ نوجوان سے ــ؟

غریب و ناتوان سے ـــــ؟
نہیں نہیں !!
یہ سب مرے عزیز ہیں۔ یہ سب مجھے عزیز ہیں
میں کس سے انتقام لوں
بتا کسے میں دوش دوں
چمن میں کس نے آگ دی ہے موسم بہار میں
اک اجنبی سفید ہاتھ ۔ آتشیں و شعلہ بار
فضائے تیرۂ وطن میں رقص کر رہا ہے آج

آمین سلونوی

اعلانِ آزادی

آج یہ محسوس ہوتا ہے جہاں آزاد ہے
یہ زمیں آزاد ہے یہ آسماں آزاد ہے

آج چھوٹے ہیں طلسمِ قیدِ افرنگی سے ہم
آج اپنی آرزوؤں کی زباں آزاد ہے

چومتی ہے منزلِ مقصد مسافر کے قدم
آج گردِ کارواں سے کارواں آزاد ہے

صید اور صیاد دونوں ہو گئے ہیں مطمئن
در قفس کے کھل گئے ہیں پاسباں آزاد ہے

نغمہ سنجانِ چمن کو مژدہ ہو آئی بہار
باغباں خود کہہ رہا ہے گلستاں آزاد ہے

دیکھتا ہوں رونقیں کونین کی بکھری ہوئی
ہر فضا آزاد ہے ہر آسماں آزاد ہے

دل نشاطِ رنگ و بو میں آج ہے ڈوبا ہوا
اب وطن مثلِ نسیمِ بوستاں آزاد ہے

خونِ شہیدانِ وطن کا رنگ لا کر ہی رہا
آج یہ جنت نشاں ہندوستاں آزاد ہے

اقبال احمد سہیل

گاندھی

وہ حدیثِ روحِ پیامِ جاں جسے ہم نے سُن کے بُھلا دیا
وہ حریمِ غیب کا ارمغاں جسے پا کے ہم نے گنوا دیا
وہ ملک و ملتِ جاں بلب جسے اس نے آبِ بقا دیا
اسی ناسپاس نے ہائے اب اسے جامِ مرگ پلا دیا

ہمیں جس نے فتح دلائی تھی، اسے خاک و خوں میں ملا دیا
ہمیں جس نے راہ دکھائی تھی اُسے راستہ سے ہٹا دیا
اسے اتباعِ مسیح نے وہ عجیب دستِ شفا دیا
جو گرے تھے اُن کو اُٹھا دیا جو مرے تھے ان کو جِلا دیا

جو اُٹھا تھا شعلۂ شور و شر اسے اپنے خوں سے بجھا دیا
جو پڑا تھا پردہ نگاہوں میں اُسے آپ اُٹھ کے اُٹھا دیا
وہ خمیدہ قد خمِ ماہ تو وہ نظر فریب خنک سی ضو
وہ نگاہ برقِ عمل کی رو کہ دلوں کو جس نے ہلا دیا

وہ فروغ بخشِ ہر انجمن کہ زمانہ بھر میں تھا ضو فگن
وہ چراغِ بزم گہِ وطن کسی تیرہ دل نے بجھا دیا
وہ کتابِ صلح کا سرورق کہ مٹائی کشمکشِ فرق
وہ قتیلِ خنجرِ صبر و حق کہ وطن پہ خود کو مٹا دیا

وہ بودھ اور کرشن کا جانشیں ہمہ تن عمل، ہمہ تن یقیں
وہ تبسمِ سحر آفریں کہ چمن لبوں سے کھلا دیا

وہ برنگِ آئینہ صاف دل، وہ فروغِ فطرتِ آب و گل
کہ جہادِ نفس نے مستقل اسے اور حسن جِلا دیا

وہ جلالِ شیوۂ سادگی، وہ جمالِ صورتِ زندگی
وہ زلالِ چشمۂ آگہی کہ زمانہ بھر کو جگا دیا

وہ شرارہ برقِ حیات کا وہ ستارا راہِ نجات کا
وہ منارا عزم و ثبات کا جسے فتنہ ساز نے ڈھا دیا

اثر اس کا اب ہے وسیع تر کہ ہر ایک دل میں ہے اس کا گھر
یہ سمجھ کے خوش نہ ہوں فتنہ گر کہ اسے پیامِ فنا دیا

تری شان کون گھٹا سکے، اسے خود خدا نے بڑھا دیا
کہ تجھے بقائے دوام دی، تجھے منصبِ شہدا دیا

تری خامشی وہ زبان تھی کہ دلوں کو جوشِ نوا دیا
تنِ فاقہ کش میں وہ جان تھی کہ حصارِ جبر ہلا دیا

وطنِ عزیز کو شان دی اسے قیدِ غم سے چھڑا دیا
رہِ اتحاد میں جان دی، جو کہا وہ کر کے دکھا دیا

جنھیں زیر کر نہ سکا ستم، ہوئے صیدِ سلسلۂ کرم
تری نیکیوں نے تری قسم سرِ خودسری کو جھکا دیا

یہ عروسِ کشورِ ہند تھی، ہمہ بیکسی ہمہ بددلی
اسے تو نے غازۂ خرمی، ترے خوں نے رنگِ حنا دیا

تجھے مندروں نے صدائیں دیں کہ ترے کرم سے اماں ملی
تجھے مسجدوں نے دعائیں دیں کہ تباہیوں سے بچا دیا

یہ کمالِ پیروی علی، یہ فراخ حوصلگی تری
کہ خود اپنے دشمنِ جاں کو بھی وہی ارمغانِ دعا دیا

تجھے بیکسی نے سپاہ دی، تجھے مشکلات نے راہ دی
تجھے بجلیوں نے پناہ دی، تجھے تلخیوں نے مزا دیا

یہی دھرم ہے یہی اصل دیں کہ ہو قول سچ تو عمل حسیں
حق و اہلِ حق پہ رہے یقیں، یہ پیام سب کو سنا دیا

ہمہ روشنی تری ذات تھی، ہمہ سوز تیری حیات تھی
تری روح شمع تھی گل ہوئی، ترے تن کو پھول بنا دیا

ترا فیض دہر میں عام ہو یہ غبار اُٹھ کے غمام ہو
تری خاک تیرا پیام ہو، یہ سمجھ کے اس کو بہا دیا

آنند نرائن مُلّا

مہاتما گاندھی کا قتل

مشرق کا دیا گُل ہوتا ہے مغرب پہ سیاہی چھاتی ہے ہر دل سُن سا ہو جاتا ہے ہر سانس کی لَو تھراتی ہے
اتر دکھن پورب پچھم ہر سمت سے اک چیخ آتی ہے نوعِ انساں کاندھوں پہ لئے گاندھی کی ارتھی جاتی ہے

آکاش کے تارے بجھتے ہیں، دھرتی سے دھواں سا اُٹھتا ہے
دنیا کو یہ لگتا ہے جیسے سر سے کوئی سایا اُٹھتا ہے

کچھ دیر کو نبضِ عالم بھی چلتے چلتے رک جاتی ہے ہر ملک کا پرچم گرتا ہے، ہر قوم کو ہچکی آتی ہے
تہذیبِ جہاں تھراتی ہے، تاریخِ بشر شرماتی ہے موت اپنے کئے پر خود جیسے دل ہی دل میں پچھتاتی ہے

انسان وہ اُٹھا جس کا ثانی صدیوں میں بھی دنیا جن نہ سکی
مورت وہ مٹی نقاش سے بھی جو بن کے دوبارہ بن نہ سکی

دیکھا نہیں جاتا آنکھوں سے یہ منظرِ عبرتناکِ وطن پھولوں کے لہو کے پیاسے ہیں اپنے ہی خس و خاشاکِ وطن
ہاتھوں سے بجھایا خود اپنے وہ شعلۂ روحِ پاکِ وطن داغ اس سے سیہ تر کوئی نہیں دامن پہ ترے اے خاکِ وطن

پیغام اجل لائی اپنے اس سب سے بڑے محسن کے لئے
اے وائے طلوعِ آزادی! آزاد ہوئے اس دن کے لئے

جب ناخنِ حکمت ہی ٹوٹے دشوار کو آساں کون کرے جب خشک ہوا ابرِ باراں ہی شاخوں کو گل افشاں کون کرے
جب شعلۂ مینا سرد ہو خود جاموں کو فروزاں کون کرے جب سورج ہی گل ہو جائے تاروں میں چراغاں کون کرے

ناشادِ وطن! افسوس تری قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا
انگلی کو پکڑ کر چلتے تھے جس کی وہی رہبر چھوٹ گیا

اس حسن سے کچھ ہستی میں تری اضداد نئے تھے آ کے بہم اک خواب و حقیقت کا سنگم مٹی پہ قدم نظروں میں ارم
اک جسم نحیف و زار مگر اک عزم جوان و مستحکم چشم بینا معصوم کا دل، خورشید نفس، ذوقِ شبنم

وہ عجز غرورِ سلطاں بھی جس کے آگے جھک جاتا تھا
وہ موم کہ جس سے ٹکرا کر لوہے کو پسینہ آتا تھا

سینے میں جو دے کانٹوں کو بھی جا اس گل کی لطافت کیا کہئے جو زہر پئے امرت کر کے اس لب کی حلاوت کیا کہئے
جس سانس میں دنیا جاں پائے اس سانس کی نکہت کیا کہئے جس موت پہ ہستی ناز کرے اس موت کی عظمت کیا کہئے

یہ موت نہ تھی قدرت نے ترے سر پہ رکھا اک تاجِ حیات
تھی زیست تری معراجِ وفا اور موت تری معراجِ حیات

یکساں نزدیک و دور پہ تھا بارانِ فیضِ عام ترا ہر دشت و چمن، ہر کوہ و دمن میں گونجا ہے پیغام ترا
ہر خشک و تر ہستی پہ رقم ہے خطِ جلی میں نام ترا ہر ذرہ میں تیرا معبد، ہر قطرہ تیرتھ دھام ترا

اس لطف و کرم کے آئیں میں مر کر بھی نہ کچھ ترمیم ہوئی
اس ملک کے کونے کونے میں مٹی بھی تری تقسیم ہوئی

تاریخ میں قوموں کی ابھرے، کیسے کیسے ممتاز بشر کچھ ملکِ زمیں کے تخت نشیں کچھ تختِ فلک کے تاج بسر
اپنوں کے لئے جام و صہبا اوروں کے لئے شمشیر و تبر نردِ انساں پٹتی ہی رہی دنیا کی بساطِ طاقت پر

مخلوق خدا کی بن کے سپر میداں میں دلاور ایک تو ہی
ایماں کے پیمبر آئے بہت، انساں کا پیمبر ایک تو ہی

بازوئے خرد اڑ اڑ کے تھکے تیری رفعت تک جا نہ سکے ذہنوں کی تجلی کام آئی خاکے بھی ترے ہاتھ آ نہ سکے
الفاظ و معنی ختم ہوئے عنواں بھی ترا اپنا نہ سکے نظروں کے کنول جل جل کے بجھے پرچھائیں بھی تیری پا نہ سکے

ہر علم و یقیں سے بالاتر تو ہے وہ سپہرِ تابندہ
صوفی کی جہاں نیچی ہے نظر، شاعر کا تصور شرمندہ

پستیٔ سیاست کو تو نے اپنے قامت سے رفعت دی ایماں کی تنگ خیالی کو انساں کے غم کی وسعت دی
ہر سانس سے درسِ امن دیا، ہر جبر پہ دادِ الفت دی قاتل کو بھی گر لب ہل نہ سکے آنکھوں سے دعائے رحمت دی

'ہنسا' کو 'اہنسا' کا اپنی پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی ماری دنیا میں اک "پریم سندیسہ" لایا تھا

اس "پریم سندیسے" کو تیرے سینوں کی امانت بننا ہے — سینوں سے کدورت دھونے کو اک موج ندامت بننا ہے
اس موج کو بڑھتے بڑھتے پھر سیلاب محبت بننا ہے — اس سیل رواں کے دھارے کو اس ملک کی قسمت بننا ہے

جب تک نہ بہے گا یہ دھارا شاداب نہ ہوگا باغ ترا
اے خاکِ وطن دامن سے ترے دُھلنے کا نہیں یہ داغ ترا

جاتے جاتے بھی تو ہم کو اک زیست کا عنواں دے کے گیا — بجھتی ہوئی شمعِ محفل کو پھر شعلۂ رقصاں دے کے گیا
بھٹکے ہوئے گامِ انساں کو پھر جادۂ انساں دے کے گیا — ہر ساحلِ ظلمت کو اپنا مینارِ درخشاں دے کے گیا

تو چپ ہے لیکن صدیوں تک گونجے گی صدائے ساز تری
دنیا کو اندھیری راتوں میں ڈھارس دے گی آواز تری

آل احمد سرور

پیرِ مغاں کی یاد

اے میرِ کاروانِ وطن! اے شہیدِ قوم!
تیرے لہو سے اپنا چمن لالہ زار ہے

تیرے ہی دم قدم سے بیاباں مہک گئے
اپنے گلوں میں جو بھی ہے تیری بہار ہے

صدق و صفا کو تجھ سے ملی چشمِ معتبر
امن و اماں کا دہر میں تجھ سے وقار ہے

وہ سادگی کہ لاکھ ادائیں عرق عرق
وہ دلبری کہ حُسنِ جہاں شرمسار ہے

صدیوں کی پائمالی کا خاموش درد و غم
عزمِ جواں سے تیرے خروشِ بہار ہے

کل تھا جو سامراج کا قصرِ بلند بام
دھندلا سا آج ایک نشانِ مزار ہے

○

تو نے ہمارے رندوں کے شوقِ فضول کو
اپنے نفس سے جرأتِ رندانہ کر دیا

دیر و حرم کے جلوے فراموش ہو گئے
یوں اہتمامِ زینتِ مے خانہ کر دیا

تھی تجھ سے پہلے اپنی سیاست گداگری
تو نے دعا کو ضربِ کلیمانہ کر دیا

ساقی بھی اور تھے مرے صہبا بھی اور تھے
پُر اپنی مے سے شیشہ و پیمانہ کر دیا

دہقاں پہ رازِ کج کلہی فاش کر دیے
افلاس کا مزاج بھی شاہانہ کر دیا

عقلِ خرام مست کو پروازِ عشق دی
جوشِ جنوں کو رمزِ حکیمانہ کر دیا

پیرِ مغاں کی یاد میں کیسا سرور ہے
ہم نے بھی ایک نعرۂ مستانہ کر دیا

---

۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں گاندھی جینتی کے موقع پر۔

وامق جونپوری

وطن کا میرِ کارواں

جواب اس کا کون دے کسے اب اتنا ہوش ہے
کہ آج ہند کس کے سوگ میں سیاہ پوش ہے
جواب اس کا کون دے یہ کس کا خون بہ گیا
یہ کون جاتے جاتے دل کا راز سب سے کہہ گیا
یہ کون قتل ہو گیا
فسانۂ حیات کون کہتے کہتے سو گیا
جواب اس کا کون دے
کہ خود ہمارے ہاتھ اس لہو میں ہیں رنگے ہوئے
وہ زندگی کا رازداں وہ بیکسوں کا پاسباں
وطن کا میرِ کارواں نظر سے دور ہو گیا
وہ جام جو چھلک رہا تھا حریت کے میکدے میں دیر سے
[مہک رہا تھا چور چور ہو گیا نظر سے دور ہو گیا
وہ بوڑھا جسم ہڈیوں کا ایک کانپتا بدن
مگر اسی میں اس قدر جواں لہو تھا موجزن

کہ جس کی بوند بوند میں بسی تھی الفتِ وطن
لہو وہ آج بہ گیا
وہ بوڑھا جسم مر گیا مگر وہ کام کر گیا
جسے نہ جیتے جی نہ اپنے آگے پورا کر سکا
تمام عمر درس امن و آشتی دیا کیا
تمام عمر جو اسی امید پر جیا کیا
کہ ایک دن ضرور سارے نفرتے مٹائے گا
فساد کا یہ کھوکھلا طلسم ٹوٹ جائے گا
وہی بزرگ خاندان وہی ہمارا رہنما
ہمیں سے آج چھٹ گیا
سہاگ مادرِ وطن کا اپنے ہاتھوں لٹ گیا

○

سپہر ہند کی اندھیری رات کا وہ ماہتاب
قریب صبح چادرِ شفق میں منہ لپیٹ کر
لہو بھرے کفن میں اپنی خنکیاں سمیٹ کر
نظر سے دور ہو گیا
یہیں کہیں نڈھال ہو کے بدلیوں میں کھو گیا
ستارے ماند پڑ گئے
ذرا جو تیز گام تھے وہ بدلیوں سے لڑ گئے
جمے ہوئے ہزارہا برس کے سخت یخ کے ڈھیر
پگھل کے نرم ہو گئے
ہوا کے جھونکے رفتہ رفتہ گرم ہو گئے
وہ چاند جو غروب ہو گیا تھا بن کے آفتاب
دلوں کو اک نئی شعاعِ زندگی میں گوندھتا

بلند ہوتا جارہا ہے مشرقی فضاؤں میں
پھر اتحاد کے پھریرے کھل گئے ہواؤں میں

○

غلط کہ میر کارواں غلط کہ اپنا پاسباں
نظر سے دور ہوگیا
نظر سے دور ہوتے ہی دلوں میں کھنچ کے آگیا
ہماری روح کے شکستہ تاروں کو ملا گیا

○

وہ خون وہ رقیق شے سرودِ زندگی کی لے
وہ سُرخ چشمۂ حسیں
نگارِ زندگی کو اس قدر حسیں بنا گیا
کہ موت کا سیاہ دیو اپنی نکبتوں کے بوجھ ہی میں
[دب کے رہ گیا
سیاہ دل میں جس قدر سفید خوں تھا بہ گیا
اُداس ہو رہے تھے جو دماغ جگمگا گئے
ہمارا نوجوان کارواں پھر اُٹھ کھڑا ہوا
بدیشی فتنہ اور نظامِ کہنہ سے لڑا ہوا
دوبارہ ہو کے تازہ دم قدم قدم، بہم بہم
شجاعِ زرنگار کی جلو میں چل کھڑا ہوا

○

نقیبِ وقت سے کہو کہ انقلاب کے وہی پُرانے
[نعرے پھر لگائے
جو راستوں سے ہٹ گئے ہیں اُن کو راہ پھر دکھائے
یہاں تلک، یہاں تلک کہ کوئی باقی رہ نہ جائے

○

دلوں میں جن کے چور ہیں وہ اس کو خوب جان لیں
کہ رات اب نہ آئے گی گھٹا نہ دن پہ چھائے گی
کہ جس کی آڑ سے کوئی کمند پھر لگا سکے
جو سو رہے تھے جاگ اُٹھے
وہ چاند جو غروب ہو گیا تھا بن کے آفتاب
دلوں کو اک نئی شعاعِ زندگی میں گوندھتا
بلند ہوتا جا رہا ہے مشرقی فضاؤں سے

سونے کا درخت

باغِ گیتی میں سونے کا اک پیڑ تھا
جس کی شاخیں ہمالہ سے ملتی رہیں
ساحلوں کی ہواؤں سے ہلتی رہیں
چین و کابل کی سرحد پہ کھلتی رہیں
مدتوں اس شجر کی گھنی چھاؤں میں ــــ
راہ رَو دُور سے چل کے آتے رہے
اپنے بے چین قلب و نظر کے لئے
اک فضائے سکوں بخش پاتے رہے
اور پھر اپنی ہی شومیٔ بخت سے،
یہ شجر زد میں پت جھڑ کی بھی آ گیا
سالہا سال سونے کے اس پیڑ پر
سامراجی درندوں کا قبضہ رہا
اور پھر لے گئے بن بتائے ہوئے
خون و آتش کے طوفان آیا کئے

ہر نئی چوٹ پر، ہر نئے زخم پر
زہر آگیں بگولوں کے پھاہے لگے!

○

اور اک بوڑھا مالی بڑے درد سے
پیڑ کی اس مصیبت کو تکتا رہا
سالہا سال سونے کے اس پیڑ پر
سامراجی درندوں کا قبضہ رہا
کچھ دنوں بعد اُس بوڑھے مالی نے پھر
غم سے چور اور گمبھیر آواز دی ــــ

○

"ــــ اے ہمالہ! تری عظمتیں کیا ہوئیں
تیری شاداب ندیوں کی سینچی ہوئی؟
بھیم و ارجن کی وہ طاقتیں کیا ہوئیں؟
وادیٔ گنگ! تیرے چمن کیا ہوئے؟

تیرے پھولوں کی وہ نکہتیں کیا ہوئیں؟
— کیا کوئی آج ایسا نہیں جو مرا
اِن درندوں سے لڑنے میں کچھ ساتھ دے؟
کیا کوئی آج ایسا نہیں جو مرے
بوڑھے ہاتھوں میں اپنا جواں ہاتھ دے؟"
باغباں کی فسوں خیز آواز پر —
شعلے بن کر مہ و مہر و اختر بڑھے
باغ کے پھول انگارے بن کر بڑھے
آگ بن کر ہزاروں جواہر بڑھے

○

اور مالی کے لب پر ہنسی آگئی
آگ کی روح شبنم سے شرما گئی
باغباں نے ذرا مسکرا کر کہا —

○

— بھائیو! ہم تشدد نہیں چاہتے
ویسے پیکار کی ہم نے ٹھانی تو ہے
اور ڈالوں سے سونے کے اس پیڑ کی
آہنی بیل ہم کو ہٹانی تو ہے!
— پھر بھی میرے بہادر جواں بھائیو!
ہم اہنسا سے جیتیں گے اس جنگ کو
ہم چڑھائیں گے سوکھے ہوئے پیڑ پر
فصلِ گل کے اُسی کیف زا رنگ کو —!"

○

— اور پھر سال گزرے، گزرتے رہے،
اور اہنسا کی پیکار ہوتی رہی!
ہو کے تحریک پامال کچھ اور بھی
زندہ تیزی سے ہر بار ہوتی رہی!

○

— آخرکار سونے کے اس پیڑ کی
آہنی بیل اک روز چھٹ ہی گئی
مادرِ ہند کے صندلی پاؤں سے
وہ غلامی کی زنجیر کٹ ہی گئی!!

○

— وائے قسمت کہ اُس بوڑھے ملّاح کے
شاد مانی کے آنسو تھمے بھی نہ تھے
ابھی ساحل پہ بس ناؤ پہونچی ہی تھی
خون و آتش کے طوفان پھر اُٹھ گئے

○

— نامبارک سا اک شور بڑھنے لگا
"— جو بھی ہو، سونے کا پیڑ اب بانٹ دو
ہیروں کی ٹہنیاں، پھول پکھراج کے
تیغ حرص و ہوس سے ذرا چھانٹ دو!"

○

— باغِ گیتی میں سونے کا اک پیڑ تھا
تیغِ حرص و ہوس سے جو کاٹا گیا
اور دنیا کی سب سے بڑی چوٹ سے

گنگا جمنا کی رفتار رُک سی گئی

اور جبینِ ہمالہ بھی جھک سی گئی

بھائیوں ہی کی نیت کی اس کھوٹ سے

ایک ہنگامہ ہر سو بپا ہو گیا
باغ کے کیف زا پھول جلنے لگے

اور انسان حیوان سا ہو گیا

— اور وہ سونے کے پیڑ کا باغباں
بھائیوں کو بچاتا ہوا چل بسا
ایک کے بعد اک زخم کھاتا گیا
اور بس مسکراتا ہوا چل بسا

○

— مالی کی موت کو اتنے دن ہو گئے
اور یوں پہلی بار اب چلی ہے ہوا
"جو ہوا سو ہوا، اب گلے سے ملو"
مالی کے جانشیں نے یہ دی ہے صدا
میں تو جب جانوں اے موجِ بادِ سحر!

دونوں شاخیں کھلیں، چھائے دلکش گھٹا!!
ٹھنڈی ٹھنڈی پھواروں میں، پھر ٹہنیاں
سونے کے پیڑ کی زندہ ہونے لگیں
دونوں پینگیں بڑھائیں، گلے سے ملیں
بھنورے پھولوں پہ رقصندہ ہونے لگیں!!
— ڈور جذبات کی، روح کی ایک ہے
سونے کے پیڑ کی جڑ ابھی ایک ہے!!

○

— آج گھنشام نے پھر اٹھائی ہے نَے
آج جمنا نے چھیڑی ہے گیتوں کی لَے
آج گنگا لٹاتی ہے پاکیزہ مَے
روح آج ایک مالی کی مسرور ہے

رُوح آج ایک مالی کی مسرور ہے
اے نسیمِ سحر! اب نہ رُکنا ذرا
دونوں شاخیں کھلیں، چھائے دلکش گھٹا
ڈور جذبات کی، رُوح کی ایک ہے
سونے کے پیڑ کی جڑ ابھی ایک ہے
— باغِ گیتی میں سونے کا ایک پیڑ تھا!!؟

عمر انصاری

بوڑھا مالی

جب گرم ہوائیں چلتی تھیں اُمید نہ تھی ہریالی کی
تھی کھوئی ہوئی اندھیارے میں ہر ایک کرن اُجیالی کی
یہ پھول یہ کلیاں یہ پودے تصویر تھے جب پامالی کی
ہمت تھی اُسی رکھوالے کی اس وقت بھی جو رکھوالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

یہ بیج اُسی نے بویا تھا کیا پوچھنا اُس کی ہمت کا
آزادی جس کو کہتے ہیں یہ پھل ہے اُسی کی محنت کا
یہ باغ نظر آتا ہے ہمیں جو آج نمونہ جنت کا
یہ باغ ابھی کچھ روز ہوئے تصویر تھا اک پامالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

اُس کے ہی خون پسینے کا سینچا ہوا بوٹا بوٹا ہے
اُس کے ہی آنکھ کے سوتوں سے یہ میٹھا چشمہ پھوٹا ہے
اُس کے ہی رسیلے ہونٹوں سے ہر بھونرے نے رس لوٹا ہے
یہ پیڑ اُسی نے بویا تھا، ہے جان جو اب ہریالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

اس باغ کی پتّی پتّی پر تحریر ہے اُس کے باتوں کی
پھولوں میں سنائی دیتی ہے گونج اُس کی انوکھی باتوں کی
کلیوں میں ہیں نیندیں سوئی ہوئی جاگی ہوئی لاکھوں راتوں کی
دکھ جھیل کے بھی جان بیچ کے بھی رکھوالا تھا رکھوالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

ہے بادل اُس کی اہنسا کا برسا ہے جو ساری دنیا پر
اک ہاتھ میں اُس کے قرآں تھا ایک ہاتھ تھا اُس کا گیتا پر
کچھ "رام" "رحیم" کے ناموں میں تھا فرق نہ اُس کی مالا پر

سب دن تھے "عیدملن" کے دن سب راتیں تھیں دیوالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

ہر مندر اُس کا مندر تھا ہر راہ تھی اس کی راہ گزر
کچھ نیچ اور اونچ میں فرق نہ تھا دونوں پہ تھی اس کی ایک نظر
ہر وقت نگاہیں رکھتا تھا اس باغ کے پنچھی پنچھی پر

ہر آن بلائیں لیتا تھا اس باغ کی ڈالی ڈالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

کہنے کو تو دبلا پتلا تھا لڑتا تھا مگر تقدیروں سے
یہ دَور تھا اس کی ضعیفی کا اور کھیلتا تھا زنجیروں سے
مشکل تھے اُٹھانا پاؤں مگر تھا آگے سب رہگیروں سے

تھا بھیس کسی "سنیاسی" کا اور شان کہیں کے "والی" کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

یہ چرخا اس کا چرخا ہے، یہ گیتا اس کی گیتا ہے
وہ سامنے اس کا مندر ہے، یہ سامنے اس کی کٹیا ہے
یہ اس کا قلم اور کاغذ ہے، وہ عینک دھوتی کرتا ہے

یہ پھول ہیں اس کی پوجا کے، یہ شمع ہے اس کی تھالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

سائے میں ترنگے جھنڈے کے جب چور غموں سے ہوتا تھا
خواب اُس کے جاگا کرتے تھے وہ جتنی دیر بھی سوتا تھا
جب پھول کوئی کملاتا تھا تو پہروں بیٹھ کے روتا تھا

اور رو کے دعائیں کرتا تھا اس گلشن کی خوش حالی کی
ہر بات ہے اب تک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

جعفر علی خاں اثر

جشنِ جمہوریت

مژدہ کہ ہے جلوہ گر صبح سعادت اثر — آنکھ جھپکنے لگا ناز سے نجمِ سحر
دیکھ وہ پھوٹی کرن مشرق گلگوش سے — سعی ہوئی کامیاب، جہد ہوئی بارور

○

خواب سے بیدار ہو صاحبِ فکر و نظر — سایۂ باطل نہ بن اس کے نتائج سے ڈر
وقت کی آواز سن وقت کا ہو ترجماں — راہ سے کانٹے ہٹا پھر ہو رواں بےخطر
راستی و آشتی شیوۂ مردانِ کار — عزم قوی دل جواں چشم حقیقت نگر
کام جو بے لوث ہو ملک کی عظمت بڑھے — تیری بھی عزت بڑھے معرکہ ہر اک ہو سر
جہل کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں جہاں — علم کی ہو روشنی اور یقیں راہبر
مہر تجلی کی ہیں تجھ میں ہی تابانیاں — صیقل آئینہ کر دل سے نہ ہو بےخبر
ایک نئی زندگی اور نئی عشرتیں — وقف ہیں تیرے لئے ہو جو خودی سے مفر
ملک کی خدمت کے بعد ملک کا مخدوم بن — ورنہ بایں سرخوشی راہ بصحرا ببر

راگ ہے بے وقت کا دل میں نہیں جب امنگ
مطرب و چنگ و رباب نَے سے الگ سربسر

نورِ سحر کا پیام شب کی ہیں تاریکیاں — صبح تجلی فروش ہو کے رہے جلوہ گر
رات گئی دن ہوا صدق و صفا کا ہے دَور — ہند کی جے اب پکار دیس پر اب فخر کر

مٹ گئے سب اختلاف میل ہے اور شانتی
اونچا ترنگا رہے پھولے پھلے یہ نگر

مژدہ کہ ہے جلوہ گر صبح سعادت اثر — آنکھ جھپکنے لگا ناز سے نجمِ سحر
دیکھ وہ پھوٹی کرن مشرق گلگوش سے — سعی ہوئی کامیاب، جہد ہوئی بارور

سراج لکھنوی

جشنِ جمہور

خوشی ہے پھول بننے کی تو کلیاں مسکراتی ہیں کنول پھولوں کے روشن ہیں فضائیں جگمگاتی ہیں

ہوائیں اب سندیسے رنگ و بو کے لیکے آتی ہیں بہاریں رقص میں ہیں مست شاخیں جھومی جاتی ہیں

ہے دنیا گوش بر آواز اور شادی کے نغمے ہیں

ہنسی ہونٹوں پہ ہے اب اور آزادی کے نغمے ہیں

قسم لب پر نہ پینے کی مگر آنکھوں میں مستی ہے جدھر دیکھو چمن میں زندگانی سی برستی ہے

کہیں پھولوں کی آبادی کہیں غنچوں کی بستی ہے کہیں ہے گُل پرستی اور کہیں شبنم پرستی ہے

یہ کن ہاتھوں نے ڈالی ہے بنائے منگِ جمہوری

گلستاں در گلستاں کٹ رہا ہے رنگِ جمہوری

جو جھنکاریں سنائی دے رہی ہیں نیک نامی کی خود آکر وقت نے توڑی ہیں زنجیریں غلامی کی

کہاں کی لغزشیں یہ صاعقیں ہیں خوشخرامی کی ترنگے جھنڈے کو اب اُٹھ کے نذریں دو سلامی کی

حکومت اپنی ہے اب تخت اپنا تاج اپنا ہے

ہمارا دیس اب آزاد ہے اب راج اپنا ہے

ذرا آنکھیں تو کھولو اب حقیقت ہر فسانہ ہے سُروں میں ڈوب کر جو سانس ہے اب اک ترانہ ہے

قفس ٹوٹا اسیرو مسکرانے کا زمانہ ہے خود اپنے ہی پروں کے سائے میں اب آشیانہ ہے

بلندی ہر طرف ہے اک یہی زینہ ہے پستی کا

اسے بھی توڑ دو اب موسم نہیں فرقہ پرستی کا

اُٹھے ہیں سونے والے سو کے چہروں پر بحالی ہے نظر کے سامنے آئینۂ حُسنِ جمالی ہے

وہ دیکھو دید کے قابل لبِ مشرق پہ لالی ہے کرن ہے پھوٹنے کو صبح نو اب ہونے والی ہے

ہے عالم اور ہی کچھ آج تو کچھ اور چتون ہے

وہی سورج ہے لیکن روشنی میں کچھ نیا پن ہے

۲۶ چھبیس جنوری

یہ دورِ نو مبارک فرخندہ اختری کا — جمہوریت کا آغاز انجام قیصری کا
کیا جانفزا ہے جلوہ خورشید خاوری کا — ہر اک شعاع رقصاں مصرع ہے انوری کا

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

بھارت کی برتری میں کس کو کلام ہے اب — تھا جو رہین پستی گردوں مقام ہے اب
جمہوریت پہ قائم سارا نظام ہے اب — اعلیٰ ہے یا ہے ادنیٰ با احترام ہے اب

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

صدیوں کے بند ٹوٹے آزاد ہو گئے ہم — قیدِ گراں سے چھوٹے دلشاد ہو گئے ہم
بے خوف، بے نیازِ صیاد ہو گئے ہم — پھر بس گیا نشیمن، آباد ہو گئے ہم

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

جو مضطرب تھی دل میں وہ آرزو بر آئی — تکمیل آرزو نے دل کی خلش مٹائی
جس ملک پر غلامی بن بن کے شام چھائی — صبح مسرت اس کو اللہ نے دکھائی

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

تعبیرِ خوابِ گاندھی تفسیرِ حالِ نہرو　　آزاد کی ریاضت سردار کی تگاپو
رخشاں ہے حریت کا زیبا نگارِ دلجو　　تسکینِ قلبِ مسلم آرامِ جانِ ہندو

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

قرباں ہوئے جو اس پر رہتی ہیں شاد انکی　　ہم جس سے بہرہ ور ہیں وہ ہے مراد انکی
بے بسکہ سرفروشی شایان داد انکی　　بھارت کی اس خوشی میں شامل ہے یاد انکی

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

آزاد ہو گیا جب ہندوستاں ہمارا　　ہے سو کے برابر ہر اک زیاں ہمارا
منزل پہ آن پہنچا جب کارواں ہمارا　　کیوں ہو غبارِ منزل خاطر نشاں ہمارا

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

ایوانِ فرخی کی تعمیرِ نو مبارک　　آئینِ زندگی کی تدبیرِ نو مبارک
ہر ذرۂ وطن کو تنویرِ نو مبارک　　بھارت کے ہر بشر کو توقیرِ نو مبارک

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

بھارت کا عزم ہے یہ توفیق اسے خدا دے　　دنیا سے امن واماں کی تخریب کو مٹا دے
امن واماں سے رہنا ہر ملک کو سکھا دے　　ہر قوم شکریے میں ہر سال یہ صدا دے

روزِ سعید آیا چھبیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا

آل احمد سرور

"دلِ وحشی کو رہِ خار بھی کیا یاد آئی"

طبعِ آزاد پہ تھی بار ہوائے زنداں — سیر کے واسطے اک اور فضا یاد آئی
صحنِ گلشن میں گوارا نہ ہوا تجھ کو خرام — طالبِ حق کو رہِ کرب و بلا یاد آئی
لالہ کاری کے لئے جوش لہو نے مارا — دلِ وحشی کو رہِ خار بھی کیا یاد آئی
یا جنوں نے کیا صد پارہ خرد کا دامن — یا کسی آہوئے صحرا کی ادا یاد آئی
یا حنا بندیٔ گلشن کے تقاضے ہوئے تیز — یا شرر بیزیٔ خونِ شہدا یاد آئی
جرأتِ شوق کی معصوم ادا نے لوٹا — خدمتِ خلق کی خاموش ادا یاد آئی
اپنے آئینے میں جو نہیں شاید باقی — کیوں کوئی اور رہِ صدق و صفا یاد آئی
روح میں تھی جو خلش اُس کو مٹانے کیلئے — دشتِ غربت کی کوئی خاکِ شفا یاد آئی
کیوں یہ بیگانوں کا غوغا ہوا اس درجہ گراں — کیوں رفیقوں کی نہ خاموش ادا یاد آئی
جانے والے تری پُرسوز نظر کے قرباں — یاد سے تیری ستاروں کی ضیا یاد آئی
تیرے افکار سے جلنے لگے ذہنوں میں چراغ — تیرے کردار سے رشیوں کی ادا یاد آئی

اپنی بستی میں بھی اک شورِ جنوں اُٹھا ہے
تجھ کو ایسے میں بیاباں کی ہوا یاد آئی

ے یاد رہے کہ رام دھر مشرا صدر شعبہ ریاضیات لکھنؤ یونیورسٹی نے بھودان تحریک میں شرکت کے لئے یونیورسٹی سے استعفیٰ دیدیا تھا اور یہ نظم انھیں کی اس قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔

کمال احمد صدیقی

ہماری کہانی

مطلق الحکم شہنشاہوں کا یہ دَور نہیں
اجنبی دیس کے آقاؤں کا یہ دَور نہیں

○

تین سو سال سے حاوی تھا غلامی کا نظام
اجنبی ہاتھوں نے توڑے جو ستم مت پوچھو
ظلم سہتے تھے، پہ فریاد نہ کر سکتے تھے
پوجنا پڑتے تھے غیروں کے صنم مت پوچھو

○

زندگی کے لئے بے رحم قوانین کی مُہر
عزم پر قید تھی ہونٹوں کے لئے تالے تھے
سر اُٹھانے کی اجازت بھی نہیں تھی ہم کو
جُرم اتنا تھا کہ وہ گورے تھے ہم کالے تھے

○

زندگی جبرِ گرانبار سے پژمردہ، نڈھال
اجنبی حاکمِ وقت اہلِ وطن تھے محکوم
ہائے ایّامِ اسیری، وہ اذیت، وہ عذاب
ہر طرف موت کا سناٹا فضائیں مسموم

○

ہم ترستے تھے بہاروں میں بہاروں کے لئے
پھول کھلتے تھے گلستانوں میں مُرجھائے ہوئے
کبھی فاقے کی حکایت کبھی افلاس کی بات
زندہ رہتے تھے مگر زیست سے اُکتائے ہوئے

○

یہ بھی کہنے کی اجازت نہ تھی مظلوم ہیں ہم
ہونٹ سینے کے قوانین تھے، سو پہرے تھے
حکم تھا ان کو چھپاؤ نہ کرو ان کا علاج
سینۂ زیست میں جو گھاؤ بہت گہرے تھے

○

ہر قدم پر نئے مقتل تھے نئے زنداں تھے زندگانی کے لئے دار و رسن تھے کیا کیا
ظلم اور جبر سے تاراج نہ ہوتا اے کاش اپنے گلشن میں گل و سرو سمن تھے کیا کیا

○

زندگی مضطرب و نوحہ کناں رہتی تھی ظلم کی داد نہ تھی جور کی فریاد نہ تھی
بندشیں اتنی کہ جی جلتا تھا دم گھٹتا تھا نظر آزاد نہ تھی، سانس بھی آزاد نہ تھی

○

مقصد زیست تھی آزادئ جمہور وطن سر میں سودا تھا یہی دل میں یہی ایک لگن
یہ تمنا تھی کہ آزاد ہو اپنا گلشن وقف تھی اس کے لئے قلب کی اک اک دھڑکن

○

دل میں جو آگ بھڑکتی تھی بھڑکتی ہی رہی اپنی منزل سے کسی وقت بھی غافل نہ رہے
حریت سوز ستم پیشہ حکومت کے خلاف ہم نے ہر وقت بغاوت کے علم لہرائے

○

ہم نے آزادئ جمہور کے نغمے گا کر کردیئے اپنے رفیقوں کے عزائم شاداب
ہم نے اس راہ میں ہر طرح کی قربانی دی خون سے اپنے کیا کشت وطن کو سیراب

○

آج آزادئ جمہور کوئی خواب نہیں آج آئین ہمارا ہے ہمارا ہے نظام
معتبر آج ہے دنیا میں ہماری آواز آج چڑھتا ہوا سورج ہمیں کرتا ہے سلام

○

مرگ انبوہ سے بجھتے ہیں تمدن کے چراغ زندگی کو کبھی بے رنگ نہ ہونے دیں گے
حسن عالم کو جھلس دیتا ہے رنگوں کا جنوں ہم نے ٹھانی ہے کبھی جنگ نہ ہونے دیں گے

○

امن عالم کی محافظ ہیں ہماری فوجیں آج اقوام جہاں میں ہمیں حاصل ہے وقار
ایشیا اک نئی تہذیب کا گہوارہ ہے ہند ہے اس نئی تہذیب کا پرچم بردار

کمال احمد صدیقی

شانتی کے پالن ہار

[کشمیر کی سرحدوں کے محافظ]

اپنی فطرت نہیں ہے جنگ و جدال
ہم تو ہیں شانتی کے پالن ہار
ہم تو سیوک ہیں اپنی جنتا کے
پاسباں اپنے دیش کے ہم ہیں
اپنا یہ دیش ہم کو پیارا ہے
اس کی ہر چیز ہم کو پیاری ہے
اس کے کہسار ہیں عزیز ہمیں
اس کے دریا ہیں، دودھ کے چشمے
جن سے پائی ہے زندگی ہم نے
اس کے یہ کھیت کتنے پیارے ہیں
جن کی فصلوں سے زندگی ہے جواں
اس کے پیڑوں کی نرم چھاؤں میں
ہم نے چھیڑے ہیں پریم کے سنگیت
دلربا گیت ہم نے گائے ہیں
اپنا یہ دیش ہم کو پیارا ہے

اس کی ہر چیز سے محبت ہے
اس کی ہر چیز سے عقیدت ہے
ہم تو ہیں شانتی کے پالن ہار
اپنی فطرت نہیں ہے جنگ و جدال
ہاں کسی سر پہ موت منڈلائے
اور کرے کوئی دیش پر حملہ
پھر تو ہم اس کی جان لے لیں گے
اس کو پسپا ہی کر کے دم لیں گے
دیش سیوا ہمارا مذہب ہے
دیش پر اپنی زندگی ہے نثار

اعجاز صدیقی

قدم مِلا کے چلو

یہ خضرِ وقت سے پیغامِ وقت آیا ہے
علاجِ مرحلۂ دورِ سخت آیا ہے
سکون و امن و مسرّت کا راز پایا ہے
سحر کے ساز پہ کرنوں نے گیت گایا ہے
یہ دُور دُور ہو کیوں پاس پاس آ کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ـــــــــــــ

کہیں ہے صوبہ پرستی و فرقہ بندداری
کہیں بنامِ مذاہب جنونِ غدّاری
یہ اختلافِ سیاست، یہ شورِ ناداری
کہیں زبان کے جھگڑے کہیں دل آزاری
تمام آج کی یہ شورشیں مٹا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ـــــــــــــ

بھڑک رہی ہے دماغوں میں آگ نفرت کی
سلگ رہی ہیں نئی بھٹیاں کدورت کی
بہت ہی سُست ہیں نبضیں خلوصِ نیت کی
ہر اک ذرّے پہ رکھ دو جبیں محبّت کی
دلوں کو آئینۂ دوستی بنا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ـــــــــــــ

بہت سے دورِ غلامی میں داغ کھائے ہیں
غموں کے بوجھ دلِ زار پر اُٹھائے ہیں
بڑے دنوں میں ان آزادیوں تک آئے ہیں
اور آج بھی وہی گمراہیوں کے سائے ہیں

مزہ تو جب ہے، جو کھویا ہے اُس کو پا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ——————

ہے عام ارضِ وطن میں وبائے خود غرضی
بڑھی ہوئی ہے بہت بیکسوں کی تشنہ لبی
ہوئی نہیں ہمیں حاصل ابھی مرادِ دلی
محبتوں کے بجائے عداوتیں ہیں چھپی

عداوتوں کی یہ چنگاریاں بُجھا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ——————

نہ شہر کی کوئی تخصیص ہے نہ بن کی ہے
نہ خارزار کی شرط اور نہ کچھ چمن کی ہے
نہ شیخ کی ہے رعایت نہ برہمن کی ہے
یہاں تو بات ہر اک گوشۂ وطن کی ہے

جہاں اندھیرے ہوں شمعیں وہیں جلا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ——————

طریقے اور بھی ہیں احتجاج کے لوگو!
تقاضے کہتے ہیں کچھ اور آج کے لوگو!
یہ روز و شب ہیں بڑے کام کاج کے لوگو!
قریب خود کو کرو لوک راج کے لوگو!

رہو خموش مگر داستاں بنا کے چلو
"قدم ملا کے چلو!" ——————

چھٹے نہیں ہیں اندھیرے ہوئی نہیں ہے سحر
گھری ہوئی ہے ابھی ظلمتوں میں نوعِ بشر
حجاب خاک سے اک بار پھر نمودِ شرر
جو ہو سکے تو دکھا دے جمالِ فکر و نظر
ہر ایک ذرۂ تیرہ کو جگمگا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ______________

نظامِ کارگہِ کائنات ایک ہی ہے
حیات ایک ہے طرزِ حیات ایک ہی ہے
شعورِ فطرتِ انساں کی بات ایک ہی ہے
دل و نگاہ کی ہر واردات ایک ہی ہے
یہ نسل و رنگ کے سب تفرقے مٹا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ______________

فسردہ چہرے، تھکے دل، بجھی نگاہیں ہیں
کھلی کھلی ہوئی رنج و الم کی باہیں ہیں
علاجِ درد نہ آنسو ہیں اور نہ آہیں ہیں
یہ کیوں لبوں پہ تڑپتی ہوئی کراہیں ہیں
غموں کی دھوپ کڑی ہے تو مسکرا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ______________

تمہارے فرق پہ ہیں تاج ارجمندی کے
خبر بھی ہے کہ ہو مینار تم بلندی کے
بدل گئے ہیں طریقے وہ گوسفندی کے
اصول آج ہیں کچھ اور پائے بندی کے
نظر ملاؤ زمانے سے سر اٹھا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ______________

رُخِ حیات کو جرأت کی سُرخیاں دے دو
دلوں کو حوصلہ و عزم جاوداں دے دو
سبک خرام امیدوں کو کارواں دے دو
روش روش کو اُمنگوں کی داستاں دے دو
قدم قدم پہ نئے ولولے جگا کے چلو
——————— "قدم ملا کے چلو"

ہے موت آج کی دنیا میں رنگِ بےخبری
نہ جی سکیں گے زیادہ اسیرِ کم نظری
وہ کارِ شیشہ و آہن ہو یا ہو بخیہ گری
نظامِ نَو کی اگر دیکھنی ہے زود اثری
لوائے دانش و فکر و عمل اُٹھا کے چلو
——————— "قدم ملا کے چلو"

چلیں جو شانہ بشانہ رہِ حیات میں ہم
ستارے ٹانک دیں دامانِ ممکنات میں ہم
رہیں کسی سے نہ پیچھے ترقیات میں ہم
نشانِ شہرت و عظمت ہوں شش جہات میں ہم
یہ وقت ہے کہ بس اک کارواں بنا کے چلو
——————— "قدم ملا کے چلو"

جمالِ تاج و اجنتا کہیں نہیں ملتا
جلالِ کوہ ہمالہ کہیں نہیں ملتا
کمالِ فنِ ایلورا کہیں نہیں ملتا
جوابِ گنگ و جمن کا کہیں نہیں ملتا
نقوشِ عظمتِ ماضی کو جگمگا کے چلو
——————— "قدم ملا کے چلو"

ستارے توڑ کے لاؤ تو کوئی بات بنے
جبینِ مہر جھکاؤ تو کوئی بات بنے
اِک اور چاند بناؤ تو کوئی بات بنے
مثالِ ابر جو چھاؤ تو کوئی بات بنے
زمیں پر ایک نیا آسماں بنا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ______

اگر خلوص سے ہو جائیں مائلِ تدبیر
تو ایک پل میں بدل جائے ملک کی تقدیر
دلوں میں سب کے ہو بےتحاشہ جذبۂ تعمیر
نظر میں اک "نئے ہندوستان" کی تصویر
اور اس کے ساتھ اشاروں پہ رہنما کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ______

بہ رنگِ نغمۂ پُرکیف جوئبار اُٹھو
مثالِ زمزمۂ ابرِ نوبہار اُٹھو
لئے دلوں میں خیالِ نشاطِ کار اُٹھو
تمام مست و غزلخوان و بادہ بار اُٹھو
اُٹھو تو جھوم کے اُٹھو چلو تو گا کے چلو
"قدم ملا کے چلو" ______

نوٹ :- وزیرِاعظم ہندوستان پنڈت جواہرلال نہرو نے ملک کو ایک نیا نعرہ دیا "قدم ملا کے چلو"۔ یہ نظم اِسی نعرہ کی صدائے بازگشت ہے۔

علی جواد زیدی

نیا دور

میں نے محسوس کیا ہے دلِ دنیا کا وہ درد — جس کا عشرت کدۂ دہر میں اڑتا ہے مذاق
میں نے دیکھا ہے وہ آلام و مصائب کا جلوس — جس پہ ہوتا ہے قیامت کا یقینی اطلاق
ایسے پسماندہ علاقوں سے میں واقف ہوں جہاں — لوٹ کی فکر میں بیٹھے ہیں پرانے قزاق
چار سو آج نظر آتی ہے اک بدنظمی — فکرِ تہذیب و تمدن، نہ خیالِ اخلاق
جزوِ تخلیق ہوئی جاتی ہے جنگ آرائی — موت سے کھیل رہا ہے یہ نظامِ آفاق

○

پھر بھی مایوس نہیں ہوں کہ یہ سب ہوتے ہوئے — اک نئے دور کے آغاز کے آثار بھی ہیں
ہیں جہاں وحشت و تخریب کے خوگر لاکھوں — وہیں کچھ اک نئی تہذیب کے معمار بھی ہیں
جو بدل سکتے ہیں میخانوں کی بگڑی تقدیر — اسی دنیا میں وہ رندانِ طرحدار بھی ہیں
جنگ بازوں کی صفیں درہم و برہم سی ہیں آج — پاسباں امن کے بیدار بھی ہشیار بھی ہیں
کٹتی جاتی ہیں غلامی کی گراں زنجیریں — سامراجوں سے جواں برسرِ پیکار بھی ہیں

○

عہدِ ماضی کا اندھیرا جو چھٹا جاتا ہے — اک نیا دور دبے پاؤں چلا آتا ہے
مژدۂ شوکتِ انساں ہے مرا عزمِ جواں — کہ جھجکتا ہے نہ ڈرتا ہے، نہ شرماتا ہے

عشرتِ امروز

کھینچ لے دل میں کسی نور جہاں کی تصویر — شوخیِ عشقِ جہانگیر کا موسم ہے یہی
وادیٔ نجد بھی ہے محملِ لیلا بھی ہے — قیس کے خواب کی تعبیر کا موسم ہے یہی
دل کے پیمانے میں ہے اس کی محبت کی شراب — دیکھ! جذبات کی تطہیر کا موسم ہے یہی
آزما بھی لے مذاقِ نگہِ شوق کا ظرف — جلوۂ و رنگ کی تعمیر کا موسم ہے یہی

یہ ترا مزرعۂ تقدیر ہے کتنا زرخیز
ہاں! برومندیٔ تدبیر کا موسم ہے یہی

دل ہے کیا چیز ترا نذر میں دے جانِ عزیز — حسن کے عشوۂ خوں ریز کی ساعت آئی
ابرِ مشکیں ہے کہ "فردوسِ خراماں" کوئی — ساقی و ساغرِ لبریز کی ساعت آئی
یہ بھٹکتا ہوا اک "شعلۂ عریانِ بہار" — بادۂ کہنہ، مئے تیز کی ساعت آئی
مسکرائی رُخِ فرہاد پہ اک قوسِ قزح — ماتمِ عشرتِ پرویز کی ساعت آئی

کہہ رہی ہے درِ گلزار پہ یہ بادِ بہار
خندۂ غنچۂ نوخیز کی ساعت آئی

لطف آمیز بہاراں ہے خزاں آج کے دن — خار پر بھی گلِ تر کا ہے گماں آج کے دن
نازفرما ہے بہارِ گزراں آج کے دن — مہر سے کچھ نہیں شبنم کو زیاں آج کے دن
حجلۂ خاک ہے فردوس نشاں آج کے دن — چرخ سے ہیں مہ و پرویں نگراں آج کے دن
دی یہ کس میکشِ کامل نے اذاں آج کے دن — روحِ ساقی بھی رہی سجدہ کناں آج کے دن

لالہ و گل کا رہے خیمہ کہاں آج کے دن
چمنِ دہر ہے "فردوس رواں" آج کے دن

سینۂ خاک پہ کوثر ہے رواں آج کے دن
ہر رگِ تاک ہے یوں بادہ چکاں آج کے دن

بقعۂ نور ہے ذروں کا جہاں آج کے دن
نگہِ شوق ٹھہرتی ہے کہاں آج کے دن

صبح کا ساز ہے یوں نغمہ زناں آج کے دن
بند ہے شب کے اندھیروں کی زباں آج کے دن

حوصلے شوخ، اُمنگیں ہیں جواں آج کے دن
جاودانی ہے یہ عیشِ گزراں آج کے دن

کوئی شعلہ نہیں آنکھوں میں دھواں آج کے دن
تیرگی بھی ہے اجالے کا نشاں آج کے دن

ہر نظر عشق کی ہے زمزمہ خواں آج کے دن
نغمۂ زیرِ لبی ہے یہ فغاں آج کے دن

گل فشاں ہے اثرِ سوزِ نہاں آج کے دن
وقت ہے محملِ شعلہ نفساں آج کے دن

گرمیٔ شعر سے ہے روح تپاں آج کے دن
جمع ہیں بزم میں صاحب نظراں آج کے دن

عشرتِ ذہن ہے تخئیلِ جواں آج کے دن
دیکھ! کس ناز سے خامہ ہے رواں آج کے دن

پرِ کشا طائرِ افکار یہیں ہوتا ہے
باعثِ جنبشِ بازوئے نظر ہے ماحول

مرتسم ہوتے ہیں احساس کے جلوے اس میں
زندگی آئینہ ہے آئینہ گر ہے ماحول

پھول کچھ اور نکھر آتے ہیں شبنم کھا کر
آدمی پھول ہے اور شبنم تر ہے ماحول

ہے جو کم ظرف تو دوزخ ہے یہ ماحول حسیں
ظرف رکھتا ہے تو فردوس نظر ہے ماحول

جس کی جنبش سے عبارت ہے ستاروں کا خرام
تجھ کو معلوم ہے وہ نبضِ سحر ہے ماحول

سامعۂ ہستیٔ نغمہ میں شرابور ہے کیا
آہ دلسوز نہ فریادِ جگر دوز ہے آج

دیکھ! یہ سبزۂ نورستہ و نازک کی بساط
پھر ہوائے طرف جو طرب اندوز ہے آج

برگِ گل بھی ہے کوئی گوشۂ دامانِ بہشت
سبزۂ صبح چمن باصرہ افروز ہے آج

شوخیٔ رنگِ تمنا سے ہے دل گرمِ نشاط
نگہِ ساقیٔ رعنا ہوش آموز ہے آج

اب گلہ سنجِ مصائب نہیں اربابِ وفا
زندگی بُت کدۂ عشرت" امروز ہے آج

آخری پڑاؤ

زباں تیرے لئے خونِ دل دیا میں نے　　قلم ترے لئے کیا کچھ نہیں کیا میں نے
صلیب پر بھی گیا زہر بھی پیا میں نے　　ہزار بار ہتھیلی پہ سر لیا میں نے

اب آج میرے بیاں کو نئی حرارت دے
مری وفا کی مجھے دے سکے تو قیمت دے

بیانِ خوابِ غرورِ عدن سے ڈرتا ہوں　　بیانِ نافۂ روحِ ختن سے ڈرتا ہوں
بیانِ حسنِ بہارِ چمن سے ڈرتا ہوں　　بیانِ روئے نگارِ وطن سے ڈرتا ہوں

بساط شعر پہ بھولے سے برہمی نہ رہے
بیاں سے میرے وطن کا کوئی کمی نہ رہے

یہ کوہسار جواں ماں کی آرزو کی طرح　　یہ سربلند کسی گھر کی آبرو کی طرح
یہ برف بستہ حسیں چوٹیاں سبو کی طرح　　سجی ہوئی کسی دیہات کی بہو کی طرح

شعاعِ مہر کی شائستگی کا کیا کہنا
ہمالیہ تری دوشیزگی کا کیا کہنا

جوان دشت و جبل رنگ و بو کا اک عالم　　سحر کے ہاتھ میں ہیں صد ہزار ساغر یم

یہ آبشاروں کی شوخی یہ گیسوئے برہم — یہ پھول بار گراں جن پہ ہیں صبا کے قدم

یہ وہ مکاں ہے کہ ہے فخر ہر مکیں کے لئے
میں آسمان کو ٹھکرا دوں اس زمیں کے لئے

یہ رودِ گنگ و جمن دل کے ہر سوال کا حل — ہر ایک بوند میں ان کی ہزار شیش محل
نہ ان کا کوئی مقابل نہ ان کا کوئی بدل — کھلے ہیں ان میں ہماری روایتوں کے کنول

زمیں یہ ساتھ، خیالوں میں ساتھ ہیں دونوں
بلائیں لیتی ہوئی ماں کے ہاتھ ہیں دونوں

کہاں ہے یوں کسی جمنا کے پاس ایسی غزل — کسی کے پاس نہ جمنا، نہ کوئی تاج محل
بجھا نہ موت سے بھی پیار کا حسین کنول — جو سوزِ عشق ہو دل میں تو اس دیار میں جل

ہر اک قدم پہ کئی دل ہیں پیار ملتا ہے
جوان حسنِ شبِ انتظار ملتا ہے

یہ سارناتھ کے مندر سکونِ دل کا پیام — یہ دل کی طرح سنوارے ہوئے حسین اصنام
یہ روشنی کے منارے رقیب ظلمتِ شام — ہر ایک ذرہ میں محفوظ اب بھی بدھ کا کلام

مرے وطن میں یونہی کس کا مان ہوتا ہے
ہریش چندر کا بھی امتحان ہوتا ہے

یہ حسنِ صبح بنارس شگوفہ جیسے کھلے — یہ دھند چھٹتی ہے یا خواب گہ کے پردے ہلے
قبائے دل کے کئی چاک صبح سے نہ سلے — پجاریوں کے جتھے مندروں سے آ کے ملے

اندھیری رات بھی آئے تو صبح گلشن ہے
طلسم شامِ اودھ کا چراغ روشن ہے

ہزار گیت رکھوں گا وطن کی الفت میں — ہزاروں رنگ بھروں گا وطن کی عظمت میں
قلم ہے سوچ میں لیکن خیال حیرت میں — میں کیوں کہوں کہ جہنم ہے میری جنت میں

خطا ہوئی ہے نہ حوّا سے اور نہ کچھ ہم سے
یہاں یہ خوشۂ گندم خفا ہے آدم سے

یہ لکھنؤ کا چکن، یہ زری کی شام و سحر — ہر ایک تار میں سو بار الجھے تار نظر

یہ جادانی ہے یا کہکشاں کی راہ گزر   کہ ایک تختۂ گل رات بھر کی اوس میں تر

میں کیوں کہوں کہ ہے خالق برہنگی ان کی

کسی کی موت کا خطرہ ہے زندگی ان کی

مرے وطن ترا شاعر ہوں رنج سہتا ہوں   ہر ایک شکل میں ہر گھر میں جا کے رہتا ہوں

میں خون بن کے ہر اک زخم دل سے بہتا ہوں   میں انقلاب کی سوگند کھا کے کہتا ہوں

کہ اس کمان کا بس آخری تناؤ ہے یہ

اندھیری رات کا بس آخری پڑاؤ ہے یہ

راہی معصوم رضا

اے ارضِ وطن

اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن
ہم دیکھ رہے ہیں ہر جنگل سے جھانک رہا ہے اک گلشن

فولاد کے پنجے میں آ کر اودھ کی کلائی ٹوٹ گئی
وہ کھیتوں کی بستی جاگی وہ گاتی ہے نہروں کی گلی
وہ بجا جلترنگ آج کہیں، وہ رہٹوں کی پائل کھنکی
وہ راگ نیا اک چھیڑ گئی، جاتے ہوئے بیلوں کی گھنٹی

دھیرے دھیرے سنگھار کرو، سجتی ہے نئے جیون کی دلہن
اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن

راہی کو اشارے کرتی ہیں یہ بل کھاتی پکی سڑکیں
آبادی کی تو بات ہی کیا، ویرانے لیتے ہیں سانسیں
یہ باندھ یہ پل، خاموش بھی ہیں، چپ چاپ مگر سب کچھ کہہ دیں
راہی کے لئے پھیلائی ہیں دو رویہ درختوں نے باہیں

ان پر جو نظر پڑ جاتی ہے بڑھ جاتی ہے کچھ اور لگن
اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن

کل خواب بنائے جاتے تھے اب خوابوں کی تعبیر سبے
ہم سوچ رہے ہیں مل جل کر اس جنت کی تصویر سبے
اب اپنے ملواں میں گیت بنیں اب گھر گھر میں تقدیر سبے
پیروں کی ہر اک زنجیر سے اب دروازوں کی زنجیر سبے
دنیا کے گلستاں ایک طرف اور ایک طرف اپنا آنگن
اے ارض وطن اے ارض وطن اے ارض وطن اے ارض وطن

شمیم کرہانی

ایک قدم اور بڑھایا میں نے

اک قدم اور بڑھایا میں نے

چاند کا شیشۂ رنگیں نہ ستاروں کے چراغ
کب سے چھایا ہے دھواں وقت کے مے خانے پر
ایسی ویران فضا اور مری تاریک حیات
جیسے دیوانے کا سایہ کسی دیوانے پر

تیز طوفاں کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کی طرح
دل اندھیرے کے سمندر میں بہا جاتا ہے
درد کی چیخ کہیں اور کہیں بین کا شور
امن کبھی ہے اسی دنیا میں کہا جاتا ہے

جلتے بجھتے ہوئے ارمانوں کے گھائل جگنو
جیسے کہرے میں لرزتے ہوئے بستی کے چراغ
کوئی ٹوٹا ہوا تارا ہے کہ منزل میری
ابھی آکاش کا دیپک تھی ابھی خاک کا داغ

میری ہمت کہ قدم پھر بھی بڑھاتا ہوں ندیم
غم نے پالا ہے مجھے غم سے جھگڑنے کے لئے
اور کس دن کے لئے خود کو بچا رکھوں
زیست ہے زیست کے آلام سے لڑنے کے لئے

پھینکتا ہے غمِ دوراں وہ حوادث کے خدنگ
سربسر خونِ تمنا میں نہا جاتا ہوں
دل سے کہتا ہوں کہ چل خوں میں نہاتا ہوا چل
بڑھ گئے قافلے والے میں رہا جاتا ہوں

اور پھر پاؤں بڑھاتا ہوں جو چلنے کے لئے
خار ہی خار نظر آتے ہیں گلشن کیسا
وادیاں خوں سے چھلک اٹھتی ہیں منزل کیسی
مٹھیاں خاک سے بھر جاتی ہیں خرمن کیسا

ہار جاتا ہوں مگر ہار کے منجدھار سے میں
پلٹ آتا نہیں ساحل کی طرف اے ساتھی
گر مجھے معرکۂ زیست میں ہوتی ہے شکست
تو سمجھتا ہوں کہ منزل کی طرف اے ساتھی
اک قدم اور بڑھایا میں نے

جگن ناتھ آزاد

طلوعِ فردا

(دوسرے پنج سالہ پلان کے آئینہ میں)

دو چار ہی دن میں ایک نیا انداز گلستاں دیکھیں گے
ہم خاک کے ذرّہ ذرّہ میں تصویر بہاراں دیکھیں گے
یوں آمدِ فصلِ بہاری کو گلزار میں رقصاں دیکھیں گے
اے شاخ فروماایہ تجھ کو ہر سمت گل افشاں دیکھیں گے
اس طرح کھلے گا رازِ چمن ہر پھول بنے گا سازِ چمن
اک نکہت گل کی موج میں ہم گل رازِ گلستاں دیکھیں گے
وہ شمع جو آج بھی روشن ہے آندھی کے تھپیڑے کھا کھا کر
اس شمع کا نور زمانہ میں ہر سمت پر افشاں دیکھیں گے
کہتے ہیں جس کو دردِ بشر اس درد کو اے روحِ فردا
ہر سانس میں شامل پائیں گے ہر سانس میں غلطاں دیکھیں گے
جب صبح کا سورج چمکے گا ہم اس کی جبیں تابانی میں
ہر غم کا مداوا پائیں گے ہر درد کا درماں دیکھیں گے
اے رازِ محبت بول ذرا یہ عقدۂ نازک کھول ذرا!
انسان سے آخر کب تک ہم انساں کو گریزاں دیکھیں گے

ہمارے دس برس

کچھ ایسے جذبِ دل اپنا فروزاں کر دیا ہم نے
اندھیری رات میں جشنِ چراغاں کر دیا ہم نے

شریکِ رنگِ فردا یوں کیا خونِ جگر اپنا
کہ ہر ذرے میں پیدا اک گلستاں کر دیا ہم نے
کہیں کف در دہن امواج طوفانوں کو یوں روکا
کہ ان کے خواب کو خوابِ پریشاں کر دیا ہم نے
کہیں دریاؤں کو موڑا تو اس انداز سے موڑا
کہ ہر قطرے کو سامانِ بہاراں کر دیا ہم نے
چٹانوں کا جگر چیرا تو چیرا اس نفاست سے
کہ ہر پتھر کو اک لعلِ بدخشاں کر دیا ہم نے
کوئی مشکل کہیں بھی اپنے رستے میں ہوئی حائل
تو اس کو اپنی ہمت سے ہراساں کر دیا ہم نے

ہمارے عزم کی تصویر ننگل میں کوئی دیکھے
کہ پتھریلی زمیں کو گل بداماں کر دیا ہم نے
مفادِ آدمی کو تُنگ بھدرا کی گرفتاری
جو مشکل تھی تو اس مشکل کو آساں کر دیا ہم نے

بھوانی ہو اک کرشنا ہو، کوئینا ہو اک کوسی ہو
یہ تھے آفات ان کو فیض ساماں کر دیا ہم نے

نمودر کیا ہے اپنی جانفشانی کا کرشمہ ہے
اسے خود صورت آئینہ حیراں کر دیا ہم نے

اشاروں پر کہیں فولاد پانی بن کے بہتا ہے
کہیں دوش ہوا پر، اس کو پراں کر دیا ہم نے

اب اپنے پانیوں پر جادہ پیما ہیں جہاز اپنے
سمندر کو انہی کا زیرِ فرماں کر دیا ہم نے

وطن کے ہر بیاباں کو خیاباں میں بدل دینا
بڑا مشکل تھا لیکن اس کو آساں کر دیا ہم نے

بدل دیں ہم نے تدبیروں سے تقدیریں نظاروں کی
ہر اک گریاں نظارے کو غزلخواں کر دیا ہم نے

یحیٰ اعظمی

پیغامِ بیداری

بیداریٔ حیات کا پیغام ان کو دو　　ہیں اک صدی سے خاکِ وطن میں جو محوِ خواب

اُٹھیں کہ حشر خیز ہے پھر اک نئی سحر　　جاگیں کہ جلوہ ریز ہے پھر تازہ انقلاب

دیدہ کشا ہوں محفلِ امکاں میں پھر کہ آج　　ہے دیدنی وطن کا تماشائے انقلاب

کہدے کوئی کہ اس کی یہ تعبیر کا ہے وقت　　آزادیٔ وطن کا جو دیکھا تھا تم نے خواب

عنواں ہے جس کا خونِ شہادت سے سرخرو　　وہ آپ کا جہادِ مقدس ہے کامیاب

مژدہ! کہ آبِ زر سے لکھا جا رہا ہے آج　　عہدِ جنونِ شوق کی تاریخ کا وہ باب

اللہ رے اس حکایتِ رنگیں کی دلکشی　　اللہ رے اس فسانۂ خونیں کی آب و تاب

مدت کے بعد پھر ہے عروس البلاد آج　　وہ "بلدۂ وطن" کہ تھا عالم میں انتخاب

لہرا رہا ہے وادیٔ کشمیر سے تا دکن　　آزادیٔ وطن کا پھریرا ظفر مآب

ہے پُرفشاں جو پرچمِ ملت بہ صد شکوہ　　پوچھے نہ کوئی قلعۂ دلی کی آب و تاب

ہے کس کی سرفروشی و ایثار کا صلہ　　یہ دورِ حریت، یہ تغیر، یہ انقلاب

وہ جس کے دم سے خاکِ وطن لالہ خیز ہے　　وہ جن کے خوں سے مشہدِ ملت ہے فیض یاب

ان خفتگانِ خاک کو ہے یہ مرا سلام　　ان عاشقانِ پاک سے ہے یہ مرا خطاب

تحسین ان کی سعیٔ مبارک کو بے شمار
تبریک ان کی روحِ قدس کو بے حساب

مقدس

ضمیمہ

[پہلے دور کی کچھ نظمیں شامل ہونے سے رہ گئی
تھیں جو یہاں ضیمہ کے طور پر شائع کی جا رہی ہیں
ایک نظم جناب نشور واحدی کی بھی شامل ہے جو
پانچویں دور کی ہے]

واجد علی شاہ آختر

رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

شبِ اندوہ میں رو رو کے بسر کرتے ہیں　　دن کو کس رنج و تردد میں بسر کرتے ہیں
نالۂ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

صاف صاف اب تو عدو میرا ضرر کرتے ہیں　　دوست حالت پہ میری چاک جگر کرتے ہیں
اب تو پاؤں سے مہم راہ سفر کرتے ہیں　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دوستو شاد رہو تم کو خدا کو سونپا　　قیصر باغ جو ہے اُس کو صبا کو سونپا
ہم نے اپنے دل نازک کو جفا کو سونپا　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

مژۂ یار سے اب دل کو عداوت ہیگی　　خارِ صحرا سے ہمیں اب تو محبت ہیگی
لوحِ دل پر یہی مرقوم حکایت ہیگی　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یہ واجد علی شاہ آختر کی ایک غیر مطبوعہ نظم ہے جو واجد علی شاہ کی ایک بیگم نواب زہرہ بیگم مرحومہ کے ملفوظات اور مخطوطات شاہی سے نواب زکی علی خاں ہاتف مرحوم کو دستیاب ہوئی جو اب ممتاز حسین صاحب جونپور کے پاس محفوظ ہے۔ ممتاز صاحب کی عنایت سے یہ غیر مطبوعہ نظم ناظرین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ واجد علی شاہ نے لکھنؤ چھوڑتے وقت یہ پُر درد شعر　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں　رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں　اس وطن کو مخاطب کرکے کہا تھا جو بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہوا اور اب بھی لوگ بھولے نہیں ہیں۔ اسی شعر پر انھوں نے مصرعے لگائے اور یہ مخمس یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

شکوہ کس سے کروں ہاں دوست نے مارا مجھ کو　　جز خدا کے نہیں اب کوئی سہارا مجھ کو
نظر آتا نہیں بن جائے گزارا مجھ کو　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کس کو الزام دوں قسمت کا ہے سارا یہ پھیر　　تھا زبردست میں جن جن پہ ہوا ان کا زیر
اب مرے جانے میں اے اہل جہاں کچھ نہیں دیر　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

گردش چرخ نے یہ بات بھی سنوائی ہے　　اپنے مالک کو یہ نوکر کہے سودائی ہے
اب تو در پیش ہمیں بادیہ پیمائی ہے　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

خاک سے پاک کیا جس کو وہی ہے دشمن　　بعد مُردن نہ ملے اُس کو خدا چاہے کفن
اسی مردود کے باعث سے چھٹا اپنا وطن　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کس سے فریاد کروں ہے یہی رقت کا مقام　　کیسا کیسا مرا اسباب ہوا ہے نیلام
میرے جانے سے ہر اک گھر میں پڑا ہے کہرام　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

رنج جو ہے اُسے اب اے دلِ پُر درد اٹھا　　تعزیہ خانوں تلک کا مرا اسباب لُٹا
فصلِ گرمی میں تاسف! مرا گھر تک چھوٹا　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت　　آگے بس اب نہیں کہنے کی ہے مجھ کو فرصت
ہو نہ برباد مرے ملک کی یارب خلقت　　در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

نواب محمد رضا خاں عاشق

زوالِ لکھنؤ[ے]

کہاں ہیں وہ جلسے کہاں ہیں وہ رنگ
مٹے عیش و راحت کے جتنے تھے ڈھنگ

کہاں ہیں وہ غنچے کہاں ہیں وہ گُل
نہ ساغر ہے باقی، نہ بوتل، نہ مُل

نہ وہ زمزمے ہیں نہ وہ چہچہے ہیں
نہ محفل نشیں ہیں نہ وہ قہقہے ہیں

کہاں ہے وہ سلطاں کہاں ہے وہ فوج
نہیں لکھنؤ کا وہ باقی اب اوج

پڑے توپ خانے ہیں سنسان سب
نہ جانے یہ اب ہوں گے آباد کب

سواروں کی "پلٹنیں" ہوئیں سب اُجاڑ
گرا آسماں ان پہ، ٹوٹا پہاڑ

"نجیبوں" کی جب پلٹنیں ٹوٹیں سب
غریبوں کی حالت ہوئی غیر تب

ہوئی ہر طرف جب "تلنگوں" کی فوج
کہاں پھر وہ کپتان صاحب کا اوج

کمیدان کوڑی کے دو دو ہوئے
مثل ہے نہ کپڑے بھی ثابت رہے

خزاں کا سواروں پہ چھرّہ چلا
ہوئے سب نشانہ وہ بندوق کا

○

الٰہی کہاں ہے وہ تختِ رواں
اُڑا لے گئیں اس کو پریاں کہاں

غضب ہے جہاں فرشِ مخمل بچھے
ستم کی اسی جا پہ جھاڑو پھرے

ے انقلاب لکھنؤ کے متعلق ایک اور مثنوی "رشک ماہ تمام" قلمی صورت میں جناب نادم سیتاپوری کے پاس محفوظ ہے۔
"رشک ماہِ تمام" نواب محمد رضا خاں عاشق کی لکھی ہوئی ہے جو ۱۲۷۵ھ میں شروع کی گئی اور ۱۲۷۶ھ میں مکمل ہوئی
اس مثنوی میں بھی واجد علی شاہ کی معزولی، ان کا سفر کلکتہ، موچی کھولہ (مٹیا برج کلکتہ) میں نظربندی فورٹ ولیم میں
ان کے قید کیے جانے اور اس انقلاب میں لکھنؤ جن مصائب و آلام کا گہوارہ بنا ان سب کا ذکر ہے۔

محلّے ہیں سنسان کوچے اُجاڑ   گرا لکھنؤ پر ہے غم کا پہاڑ

○

"بگل" کی صدا تھی بہت خوشنما   "جلاجل" کی آواز تھی دلربا

○

کہاں ہیں وہ گھوڑے، کہاں ہیں وہ فیل   کہاں ہیں جو رہتے تھے ان کے کفیل

کہاں ہیں کبوتر، کہاں ہیں وہ باز   کہاں اُڑ گئے کرکے آپس میں ساز

کہاں ہیں وہ چیتے، کہاں ہیں وہ شیر   شکم وہ کریں آکے دشمن سے سیر

کہاں ہے وہ فخرِ سلیماں گیا   پتہ دے "ہمایوں" کا بادِ صبا

○

سنا ہے یہ اک روز وقتِ سحر   گیا اک فرنگی کمر باندھ کر

جہاں "جانعالم" تھے پہنچا وہاں   یہ پوچھا بتاؤ ہے نائب کہاں

سُنا جب یہ نائب نے دوڑے گئے   ہزاروں خیالات دل میں بھرے

گئے پاس جس دم تو اُس نے کہا   کہاں "جانعالم" ہیں مجھ کو بتا

نظر آئے طوراُن کو جس دم بُرے   نہ آپے میں اپنے وہ اُس دم رہے

گئے ہو کے مجبور سلطاں کے پاس   کہا بیٹھے کیا ہو تم اے حق شناس

بلاتا ہے انگریز در پر کھڑا   نظر مجھ کو آتا ہے ساماں بُرا

کہا شہ نے جو مرضیٔ کردگار   کہ ہے مالک الملک کو اختیار

○

کیا جا کے قلعے[1] میں سلطاں کو بند   لگے دینے ایذائیں ظالم دو چند

عجب غم سے تھا "جانعالم" کا حال   کرے رحم اُن پر مرا ذوالجلال

لگے بڑھنے سنبل کی صورت سے بال   اُلجھتا ہوا ان کا دل پر وبال

وہ کاکل کہ عنبر کی جن میں مہک   اُسی میں نہ کنگھی ہو کیوں اے فلک

---

[1] فورٹ ولیم کلکتہ۔

ہوا زرد رُخ مثل برگِ خزاں — نہ تھا سبزہ خط، تھے کبودی نشاں

خطِ سبز ایسا تھا رخ پر بڑھا — لگا سانپ مخمل میں تھا مورچیا

تپِ غم سے ایسا ہوا جسم زار — نظر آتا نظروں میں مانند تار

ہوا حد سے افزوں بدن ناتواں — خجل زرد چہرے سے تھی زعفراں

نقاہت سے سر تھا اٹھانا محال — ہوا بوجھ دل پر تھا، بارِ خیال

وہ آنکھیں جو نرگس سے تھیں خوب تر — رواں اُن سے آنسو تھے دو دو پہر

کسی کا مقدر ہو ایسا نہ بد — نہیں "جانِعالم" کے صدموں کی حد

مرزا قربان علی بیگ سالک

بازارِ موت

شہر دلی ہوا ہے کیوں خالی
کیوں مٹی یاں سے صورتِ آدم

روز بازارِ موت دیکھ کے چین
ملک الموت کو نہیں اک دم

ڈھیر کس جا نہیں ہے مُردوں کا
کس زباں پر نہیں فغاں پیہم

نہیں تل دھرنے کو زمیں میں جگہ
مُردے کا دفن ہو بلا سے اہم

خاک آلودگان پیشیں پر
یہ نئے طور کا ہوا ہے ستم

ایک کی قبر میں گئے سو اور
تنگیٔ جا سے لڑتے ہیں باہم

قافلہ قافلہ گئے کیوں لوگ
کب ہے اتنا وسیع ملکِ عدم

نہیں جانتے مگر عدم کو یہ لوگ
اور بھی نکتہ اس میں ہے مبہم

کرۂ خاک و باد و آتش و آب
فرطِ خلقت سے ہو گئے تھے کم

روئے اپنی کمی پہ یہ چاروں
ہو گیا رحم خالقِ عالم

دے دیا ان کو لے کے خلقت سے
کچھ عناصر جو مل رہے تھے بہم

سنہ ۱۸۶۰ء

واجد علی شاہ کی معزولی

مدد کیجیے لکھنؤ لٹ گیا — خبر لیجیے لکھنؤ لُٹ گیا

تباہی کو آبادی ہے ناپسند — غلاموں کا حضرت کے ہے رزق بند

یہ (تقدیر؟) بھولے ہیں اللہ کو — نکالا ہے واجد علی شاہ کو

عطا کیجیے ان کو پھر تخت و تاج — ملے راج پھر ان کو راجیں یہ راج

پریشان ہیں سب صغیر و کبیر — یہ اللہ ہو جلد ہو دستگیر

لے آؤ واجد علی شاہ کو — بٹھا جاؤ واجد علی شاہ کو

حمایت میں لے لو ولیعہد کو — ولیعہدی پھر دو ولیعہد کو

خداوند بہرِ خدائے قدیر — عنایت ہو پھر ان کو تاج و سریر

○

ہوا شہر میں غل، سواری چلی — گلستاں سے بادِ بہاری چلی

مثنوی "افسانۂ لکھنؤ" جس کے اقتباسات یہاں دئے جا رہے ہیں آغا حجو شرف لکھنوی نے مٹیا برج کلکتہ کے قیام میں سنہ ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ میں جو حالات رونما ہوئے اُن کے بارے میں سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق سنہ ۱۸۷۳ء میں لکھی تھی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ کسی تذکرہ نویس نے شرف کے حالات میں اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بہرحال اس مثنوی کا قلمی نسخہ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ یہاں "واجد علی شاہ کی معزولی" کے عنوان سے جو ٹکڑا دیا جا رہا ہے وہ دراصل منقبت کے اشعار ہیں جن میں حضرت علیؓ سے

(دیکھیے صفحہ ۴۲۲)

جو واماندہ تھے، رنج اُن کو رہے
ہزاروں کی آنکھوں سے آنسو بہے

ہوا پانچویں کو رجب کی سفر
رقم بارہ سو سن بہتّر کو کر

قلق سے زمانہ کا دم گھٹ گیا
خداوند سے جب وطن چھُٹ گیا

نمک خوار جتنے سرافراز تھے
چلے ساتھ یہ سب کہ مختار تھے

وزیر الممالک، ہیں خانہ نشیں
ہوا ہے ابھی ان کا جانا نہیں؟

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۲۱) واجد علی شاہ کی بحالی کی دعا مانگی گئی ہے۔ دوسرے ٹکڑے میں شرقیؔ نے واجد علی شاہ کی لکھنؤ سے روانگی کا پُردرد منظر پیش کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے قطع نظر یہ مثنوی اس حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اُس میں اُس زمانے کے مشاہیر شاعروں، ادیبوں، تاریخی کرداروں، مختلف فن کاروں، نیز مصاحبوں، امیروں، منصب داروں کے نام جو آئے ہیں وہ غالباً کہیں اور ایک جگہ نہ ملیں گے۔ اودھ کے معرکوں میں آزادی کے جن پروانوں نے دادِ شجاعت دی ان کا نام بنام ذکر بھی ملتا ہے۔

شیخ قلندر بخش جرأت

امیرانِ اسیر

ہے کچھ نہ انھیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر

جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

درگا سہائے سرور جہان آبادی

مغرب زدگی

وہ بزم ہے نہ وہ ساقی نہ وہ مئے گلرنگ
وہ ساز ہے نہ وہ مطرب نہ شورِ نغمۂ چنگ

نئے نئے نظر آتے ہیں روز و شب انجم
نئے نئے ہیں مناظر نئے نئے نیرنگ

مسوں کی آنکھوں نے افسوں کچھ ایسا پھونک دیا
کہ بت سے ہم نظر آتے ہیں سیکڑوں فرسنگ

وہ لیڈیوں کے خدنگِ نظر سے اب ہیں شہید
جو دل حسینوں کی تیغِ ادا سے تھے چورنگ

ہوا میں ہو کوئی بیلون جس طرح اڑتا
اڑاتے پھرتے ہیں یوں دل پری وشانِ فرنگ

یہ سادگی نے کیا خونِ رنگِ آرائش
کہ مہندی پھیکی ہے لاکھا ہے پان کا بدرنگ

زباں سے گو نہ کہیں کھل کے شرم سے لیکن
حجاب در پردہ ہے اب مہ وشوں کو باعثِ ننگ

نہ اب وہ جبہ و دستار ہے نہ شانِ قبا
کہ سر پہ ہیٹ ہے زیبِ بدن ہے جاکٹ تنگ

مسوں کا ذکر ہے کہتے ہیں کس کو صوم و صلوٰۃ
وضو کے بدلے ہے ہوٹل میں بادۂ گلرنگ

نہ بتکدے میں وہ ناقوس کی صدائیں ہیں
نہ لہر اگلی سی اشنان کی ہے اب لبِ گنگ

سبق پڑھایا ہے تعلیم نے ہمیں الٹا
اٹھا کے طاق پہ رکھ دی ہے عقل کی فرہنگ

نیاز فتحپوری

درسِ وفا

حکم یہ ہے کہ قلب میں شورشِ مدعا نہ ہو
آہ نہ ہو، فغاں نہ ہو، شیون برملا نہ ہو

قطعِ رگِ گلو پہ بھی اذنِ تپش نہیں، ہمیں
خوف یہ ہے کہ داغدار ان کی کہیں قبا نہ ہو

سی دئے ہونٹ تاکہ یہ زحمتِ گفتگو مٹے
ہاتھ ہے قطع تاکہ پھر ناز کشِ دعا نہ ہو

ان کا وقارِ پُر غرور رخصتِ گفتگو نہ دے
لب پہ ہزار درد کا کوئی لئے فسانہ ہو

کرتے ہیں ذبحِ عام وہ اور غرض ہے اسقدر
بابِ حرم پہ کوئی سر پھر کبھی جبہہ سا نہ ہو

ان کو روا ہے عزتیں ساری ملا دیں خاک میں
حقِ عبودیت اگر ہم سے کبھی ادا نہ ہو

ان کی جفائیں تو ہمیں وجہِ ملال بھی نہ ہوں
اپنا نیاز بھی انھیں جور کا اک بہانہ ہو

چھوڑیں نہ وہ کلی تلک اور ہمارے واسطے
حکم ہے پھونک دو اگر باغ میں آشیانہ ہو

کیسی امید دل دہی، کیسی توقعِ کرم
جب کہ زباں ہی واقفِ لذتِ التجا نہ ہو

حسرت موہانی

تلک

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبِّ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادیٔ بے باک کی
تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و صفا کی انجمن

سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ ہند
خدمت ہندوستاں میں کلفتِ قیدِ محن
ذات تیری رہنمائے راہ آزادی ہوئی
تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن

تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن
ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِّ ذوالمنن

نجاتِ ہند

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمرو کے حد سے ہوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بہ عذر مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

خدمتِ اہل جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

ناٹال اور ہندستان

(۱)

سُنا ہے درد دل رکھتا ہے اے ہندوستاں تو بھی
جگر کے خون کو دے سکتا ہے پلکوں کا نشاں تو بھی

جہاں سر پر اُٹھایا بلبلوں نے اپنے نالوں سے
دکھا اندازِ محشر ہو کے سرگرم فغاں تو بھی

ستم ناٹال میں جو جو ترے بچوں پہ ٹوٹے ہیں
بہت کچھ سُن چکا ہے ان کی خونیں داستاں تو بھی

مچا رکھا ہے اودھم کیپ کالونی میں گوروں نے
کر اپنی قوتِ بازو کا کچھ تو امتحاں تو بھی

دکھا اپنے جگر کا داغ جو شرمائے سورج کو
بنا مغرب کو مشرق اور زمیں کو آسماں تو بھی

جھلس دے سوزِ دل سے ٹیمز کی موجوں کے داماں کو
کہانی اپنی دہرا کر کہ ہے آتش بجاں تو بھی

ے یہ نظم ۱۹۱۴ء میں لندن کے ایک جلسے میں پڑھی گئی۔ جلسے میں گاندھی جی مع کستوربا کے موجود تھے۔

غلط انداز ہیں صید افگنوں کے بے اماں ناوک
نکال اک تیر ترکش سے کہ رکھتا ہے کماں تو بھی

سُنی ہے ہم نے ٹن ٹن پال کے گرجا کے گھنٹے کی
بجا مندر میں سنکھ اور دے مساجد میں اذاں تو بھی

لگا ہے کون سا سُرخاب کا پر کیپ والوں میں
قبائے سلطنت وہ ہیں تو ہے تاج جہاں تو بھی

اگر شرمندۂ معنی ذرا بھی ہے شہنشاہی
تو ہے برطانیہ پر ہند کی لازم ہوا خواہی

(۲)

یہ کیسا دیس ہے جس دیس کے ہم رہنے والے ہیں
گرفتارِ بلا ہیں اور خطا یہ ہے کہ کالے ہیں

غنیمت تھا قفس میں بال و پر کا پھڑ پھڑا لینا
مگر صیاد نے افسوس وہ بھی نوچ ڈالے ہیں

بنی ناٹال میں یہ گت ہے ہم خانہ بدوشوں کی
نہ چولھا ہے نہ ہنڈیا ہے نہ لڑکے ہیں نہ بالے ہیں

پڑے تھے پاؤں میں گاندھی کے جو صحرائے غربت میں
ہمارے یہ درخشاں داغہائے دل وہ چھالے ہیں

پچائیں گے اِسے اک روز بوئر ناچ نگنی کا
یہ انگلستاں نے اپنی آستیں میں سانپ پالے ہیں

وزیرِ ہند ہی سنتے ہیں اونچا کم نصیبی سے
پہنچ سکتے زحل تک ورنہ ہم لوگوں کے نالے ہیں

یہ نو بر نو تغافل اور یہ پیہم سختیاں کب تک
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

جگر مرادآبادی

گاندھی جی کی یاد میں

وہی ہے شورِ ہائے و ہو، وہی ہجومِ مرد و زن
مگر وہ حسنِ زندگی، مگر وہ جنتِ وطن!

وہی زمیں، وہی زماں، وہی مکیں، وہی مکاں
مگر سرورِ یک دلی، مگر نشاطِ انجمن

وہی ہے شوقِ نو بہ نو، وہی جمالِ رنگ رنگ
مگر وہ عصمتِ نظر، طہارتِ لب و دہن

ترقیوں پہ گرچہ ہیں، تمدن و معاشرت
مگر وہ حسنِ سادگی، وہ سادگی کا بانکپن

شرابِ نو کی مستیاں کہ الحفیظ والاماں
مگر وہ ایک لطیف سا سرورِ بادۂ کہن

یہ نغمۂ حیات ہے کہ ہے اجل ترانہ سنج
یہ دورِ کائنات ہے، کہ رقص میں ہے اہرمن

ہزار در ہزار ہیں اگرچہ رہبرانِ ملک
مگر وہ پیرِ نوجواں، وہ ایک مردِ صف شکن

وہی مہاتما وہی شہیدِ امن و آشتی
پریم جس کی زندگی، خلوص جس کا پیرہن

وہی ستارے ہیں مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند
وہی ہے انجمن، مگر کہاں وہ صدرِ انجمن!!

نشور واحدی

خون میں پانی

دھوکا ہے خیالِ آزادی پیغامِ زبانی جب تک ہے

شیروں کا سرِ مغرور یہاں روباہِ کہن سے نیچا ہے
زندوں کا لباسِ تن بھی یہاں مُردوں کے کفن سے نیچا ہے
کہسارِ ہمالہ کا سر بھی توہینِ وطن سے نیچا ہے

اک داغ ہے یہ تاریخِ ستم دنیا کی کہانی جب تک ہے

آزاد شہیدِ دل سے میں نے پھر خون کے رشتے جوڑے ہیں
میدانِ سنان و خنجر میں کچھ دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں
افسردہ رگوں میں غیرت کی احساس کے شعلے توڑے ہیں

ٹھنڈا نہیں ہوگا میرا لہو گنگا کی روانی جب تک ہے

یہ خون جو میرے تن میں ہے طوفانِ جہاں بن جائے گا
قوت کے پہاڑوں کے حق میں شعلوں کا مکاں بن جائے گا
آنکھوں میں اُتر آئے گا کبھی اور اشکِ رواں بن جائے گا

جم کر نہ رہے گا پلکوں پر اس خون میں پانی جب تک ہے

مینا جو قفس کی قید میں ہے اُڑنے کے لئے پر تولے گی
جس عضو پہ نوکِ نشتر کو رکھ دیں گے رگِ جاں کھولے گی
محفوظ ہو یا بیزار کوئی ہر زندہ حقیقت بولے گی
خاموش نہ ہوگی میری زباں شوریدہ بیانی جب تک ہے

تہذیب کی صہبا کی بوتل اک دیدۂ غم رہ جائے گی
مذہب کی نوائے دلکش بھی اک آہِ الم رہ جائے گی
عالم کی سیاست ٹکرا کر اک جنگ بہم رہ جائے گی
دنیا میں نہ ہوگا امن و سکوں مفلس کی جوانی جب تک ہے،